بلوچی زبان وادب

1

جلد اول- دوم

شاہ محمد مری

بلوچی زبان وادب

1

جلد اول- دوم

شاہ محمد مری

گوشۂ ادب
جناح روڈ، کوئٹہ
e-mail: goshaeadab@yahoo.com

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

زعیم بخاری نے
گوشۂ ادب سے شائع کی

کتاب	:	بلوچی زبان وادب
مصنف	:	شاہ محمد مری
اشاعت	:	2014ء
قیمت	:	790 روپے

اسٹاکسٹ:
سیلز اینڈ سروسز
کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کوئٹہ۔
فون: 092-81-2843229، فیکس: 092-81-2837672

انتساب

میر مٹھا خان مری

پروفیسر عاقل خان مینگل

عبداللہ جان جمالدینی

عبدالرحمٰن پہوال

عزیز بگٹی

کارینا جہانی

کے نام......

جنہوں نے بلوچی زبان وادب پہ تحقیق کے لیے جوانیاں لگادیں

فہرست

پیش لفظ 11

جلد اول

بلوچی زبان اور فوک لور

2009 کا پیش لفظ 19

پہلی فصل: بلوچی زبان

پس منظر، مسائل، حل

بلوچی زبان کا پس منظر 24
بلوچی زبان وادب کا ارتقا 31
بلوچی زبان کا لسانی جغرافیہ 40
بلوچی اور بلوچوں کی دیگر قومی زبانیں 44

بلوچی زبان کے لہجے 63
بلوچی رسم الخط کی تاریخ 68
بلوچی کا مستقبل 75
بلوچی زبان کے مسائل کا حل 78

دوسری فصل: بلوچی فوک ادب

مائتھالوجی میں گندھا ہوا

بلوچی فوک 88
فوک کہانی 90
حال حوال 96
موسیقی 105
پہیلی اور ضرب الامثال 110
شاعری 112
شعری اصناف 119

جلد دوم

کلاسیکل دور کا ادب

پیش لفظ 141
ہانی، شہ مرید 153
گوہر جتنڑیں 194
قویل جت 211

ہیوتاں	216
بیورغ	242
___ پس منظر	242
___ بیورغ وصذ و	247
___ مشکاف والی محبوبہ	257
___ مہرے موتک	267
___ بیورغ وگراں ناز	274
___ بیورغ اور فیوڈلزم	306
___ 'بڑھاپے کی لوریاں مت دو بچوں کو'	308
___ قبائلی برادرکشی کی مخالفت	314
شَلی وحسن مولانغ	324
دل ملخ	335
نوزبندغ	339
ریحان	341
شہذاذ و مہناز	337
رندو لاشار برادرکشی	262
چاکر، مشرق کا مسافر	379
میر چاکر دورِ ابتلا	383
بلوچ اور مغل	384
ہمل رند	393
بالاچ	409
سیمک ونتھا	439

للاہ وگراں ناز	446
رِکیا وصذ و	461
باغارسر	477
دوستین وشیریں	481

پیش لفظ

بلوچی زبان کی تشکیل سے لے کر آج تک جو ارتقا، مسائل، اور اثرات رہے ہیں، میں نے اُن کو مختصر بیان کیا ہے۔ یہ کسی ماہرِ لسانیات کی ٹکنیکل اور مفصل باتیں نہیں ہیں۔ بس ذرا سا فکر کے لیے، مزید سوال جواب کے لیے، آپ کے ذہن میں ایک آدھ سوالیہ نشان اڑس کر میں پرے ہٹ جاؤں گا۔ اس لیے کہ جوابات تو ہم سب مل کر تلاش کریں گے۔ ایک شخص تو بس اپنی رائے اور تجاویز شیئر کر سکتا ہے۔

علما اور سکالر تو جانتے ہیں مگر نوجوان نسل کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ زبان الگ بات ہوتی ہے ، اور ادب الگ۔ زبان کے علم کو لسانیات Linguistics کہتے ہیں۔ اور ادب کے علم کو ادبیات Literature کہتے ہیں۔ اِن دونوں کی ترقی اور ارتقا ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود یہ دونوں الگ خانوں میں ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بلوچی زبان کا ادب بلوچی زبان کی پیدائش، ابتدا اور اوائلی زمانوں کا ترجمان بالکل نہیں ہے۔ ہمارا ادب زبان کی حالیہ محض چھ صدیوں کا ریکارڈ کیپر ہے۔

ہمارے ماہرین ابھی تک، بلوچ کو محض ہزار ڈیڑھ ہزار سالہ بلوچستانی قرار دیتے آرہے تھے۔ کوئی ہمیں آریائی کہتا رہا ہے، کوئی حلبی قرار دے رہا تھا، کوئی کیسپئی، اور کوئی افریقی۔

مگر بلوچستان میں مہرگڑھ کے آثارِ قدیمہ کی دریافت نے پوری دنیا کے ان نظریات کو خوب مُکّے مارے ہیں۔ اس دریافت نے بلوچ کی نسلیاتی ساخت و ابتدا سے لے کر اُس کی ثقافت اور زبان تک، ہر مروج نظریے کو سوالیہ نشان کا آبِ حیات پلا دیا ہے۔ ہر شخص کو اس موضوع پہ اپنے سابقہ خیالات فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیب مہرگڑھ، اپنے مناظر و مظاہر اور بازیافتوں دریافتوں سے نہ صرف مستشرقین کے پیش کردہ اب تک کے سارے نظریات کا منہ چڑا رہی ہے بلکہ اپنی لکڑی کی بنی دو دھاری کنگھی، چوڑیوں، اور بیل گاڑیوں کی آج تک موجودگی اور استعمال کے مظہر سے اُن ماہرین کو بھی پریشان کر رہی ہے جن کا فتویٰ رہا ہے کہ سیلانی بلوچوں کی تاریخ محض مہاجرتوں کی تاریخ رہی۔.......... البتہ، بلوچی زبان کی ابتدا سے متعلق ہماری بحثیں شاید کچھ عرصہ مزید جاری رہیں گی۔ اس لیے کہ سائنس نے مہرگڑھ کی تحریر کو دریافت کرنے، اسے ڈی کوڈ کرنے، اور اسے موجودہ بلوچی سے جوڑ دینے میں ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔

زبان، ایک ایسا اطلاعاتی نظام ہوتی ہے جو گلے کی علامتی آوازوں کے ساتھ عمل کرتی ہے، اور جسے لوگوں کا ایک گروہ باہمی سماجی تعاون اور ربط پیدا کرنے کے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ زبان ایک ایسا سماجی مظہر ہوتی ہے جو اپنے دور میں موجود شعور کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اس کے اندر اس کے بولنے والوں کی ثقافت، تاریخ، فلسفہ اور ادب سموئے ہوتے ہیں۔ زبان میں رواج، روایتیں، طرز طریقے، قانون ادارے، اعتقادات عبادات، پسند ناپسند......سب کا اظہار ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک قوم کے ارادوں، خواہشات، اقدار اور روح کا تاریخی مظہر ہوتی ہے۔ زبان اپنے عوام کو باہم ملا دینے والی ایک طاقتور قوت ہوتی ہے۔

زبان انسان کی سب سے قیمتی تہذیبی میراث ہوتی ہے۔ بنی نوعِ انسان کا ذہنی، ثقافتی، اخلاقی اور روحانی ورثہ زبان کے مرہونِ منت ہیں۔ زبان، عوامی ادب کا اظہار ہوتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ہماری زبان کا ارتقا کبھی رکا ہو۔ قوم کے برعکس زبان کے ارتقا کے تسلسل نے برے دن نہیں دیکھے۔ بلوچستان نے تو اپنی تاریخ میں بہت بڑے حادثات سہے۔ مگر یہ

دلچسپ حقیقت ہے کہ ہر حادثے سے گزر کر بلوچی زبان زیادہ مضبوط، زیادہ گہری اور زیادہ وسیع ہوتی رہی ہے۔

موجودہ کتابچہ دراصل پچھلے دس بارہ سالوں کے دوران میرے نسبتاً مرکوز ومربوط چھان پھٹک کا نتیجہ ہے جو میں نے ''بلوچی زبان وادب کی تاریخ'' لکھنے کے بعد جاری رکھی۔ اُس وقت جب میں نے ''بلوچی زبان وادب کی تاریخ'' لکھی تھی تو اُس کے پیچھے اپنے بزرگ دوست افتخار عارف کی دوستانہ چھڑی ماری شامل تھی۔مگر اب سب کی طرح میری اپنی خوش فہمی بھی ہے کہ میں ذہنی طور پر 'ذرا سا بڑا' ہو چکا ہوں۔ لہٰذا اس کا دوسرا ایڈیشن صرف اور صرف اپنی خواہش، ذمہ داری، شوق اوراس خواہش پر تیار کررہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ انسان شعور وعقل وتجربے کے اِس خزانے سے مستفید ہوں جو بلوچی کلاسیکل اورفوک ادب کی صورت پڑا ہے۔

یہ دلچسپ بات نوٹ کرلیں کہ ایک ہی داستان کی شاعری، ڈکشن، الفاظ اوراسلوب، بلوچستان کے مختلف علاقوں میں اپنے اپنے علاقائی رنگ لیے ہوتے ہیں۔ سلیمان، رخشان،اور مکران تینوں خطوں میں، رسل و رسائل کی کمی، مشترک منڈی کی غیر موجودگی اور سیاسی و موسمی حالات میں فرق القطبین کے سبب سمجھیے بلوچی ادب الگ الگ ارتقا پاتا رہا ہے۔تصور کریں کہ کتنی امارت ہوگی اس لٹریچر میں۔......اور میں تو ابھی تک سلیمانی حصے کا خزانہ بھی جمع نہیں کر پایا۔ایک چیز کے کئی الفاظ، ایک خیال کے مختلف ضرب الامثال ومحاورے۔انفرادی کام بھلا اداروں کا بدل ہوسکتا ہے ؟!۔

آپ اگر بلوچ ہیں تو عمر میں بڑے ہوتے رہنے کے ساتھ ساتھ آپ کو اس بات کا شدت سے احساس ہوگا کہ دنیا کی دیگر زبانوں کے ادب کا مطالعہ تو فرض کی طرح ضرری ہے مگر بلوچی زبان وادب کے مطالعہ سے روگردانی گردن پہ ضرب جیسی ہے۔ میرا احساسِ زیاں بھی ناقابلِ پیائش ہے۔

یہ درست ہے کہ اسرائیل ایک ایسا ملک ہے جو بہت منقسم آبادی پر مشتمل ہے۔مگر واحد بات جو اُسے متحد رکھی ہوئی ہے، وہ عبرانی زبان ہے۔مگر بلوچستان میں بلوچی زبان کے

بجائے یہ کردار بلوچ سیاست ادا کرتی ہے۔ایک کثیر اللسانی قوم کے اندر زبان کے بجائے قومی سیاست متحد رکھنے والی قوت ہوتی ہے۔مگر بلوچی زبان کی اہمیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔سیاسی اصطلاحات بہت تیزی اور کثرت سے بلوچیائی جارہی ہیں،نعرے، ترانے اورقومی موسیقی ایک یونیفارم کی صورت اختیار کرتے جارہے ہیں۔

بلوچی زبان کوفلاں مقام دو، اسے فلاں جگہ کی زبان بنا دو...... یہ تھے چالیس برس قبل کے نعرے۔اب، سیاسی حالات کے ارتقائی بگولوں کے ساتھ ساتھ سائنس وٹکنالوجی کی بے پناہ ترقی کے سبب زبان نے سرکاری پنیتروں کی ضرورت اورزد سے ماورا ہوکرترقی کی اپنی راہیں بنالی ہیں۔ اب اسے سرکاری سکولوں، کالجوں میں تدریسی زبان بنانے کے مطالبے میں وہ شدت وحدت وخطرہ موجود نہیں جو کہ ون یونٹی زمانے میں تھا۔اس لیے کہ میوزیکل چیئر پکڑنے والے لوگوں کو یہ بات سمجھ ہی نہیں آرہی کہ جو باتیں چالیس برس قبل بہت بڑی لگتی تھیں، آج وہ بلوچی تھیریم کے منہ میں زیرہ بن چکی ہیں۔جو چیزیں پرائمری اور بنیادی لگتی تھیں اب وہ ''کچھ بھی نہیں'' بن چکی ہیں۔اُن کا مقدر، کہ جنریشن گیپ کی طرح حکمران وعوام کے بیچ ''حاکمیت گیپ'' ایک فطری بات ہے۔

آپ ہمہ وقت اِن ساری باتوں پہ کچھ کہنا سننا چاہتے ہیں۔ ہماری بہت ساری خوش فہمیوں کوتجربہ اوروقت غلط فہمی میں بدل دیتا ہے۔آپ اپنی ہر ایک خوش فہمی کواُس وقت غلط فہمی میں بالغ ہوتے دیکھیں گے جب ساری باتیں عوام الناس میں لے جانے کے بجائے حاکمِ وقت سے خلوص کے ساتھ کہہ ڈالیں۔میں، تھیوری نہیں عمل اور تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ ہمیشہ عوام کے پاس جاؤ۔اُن کی رائے منظّم ومربوط کرو۔حاکم کے پاس نہ سننے کا وقت ہوتا ہے نہ عمل کرنے کی نیت۔بس ایک پلاسٹکی پھیکی مسکراہٹ کے پیچھے خود پرستی اوراقربا پروری کی گھناؤنی چھُپی ہوتی ہے۔اس لیے بالخصوص بلوچی زبان کے بارے میں ہمارا اصل مخاطب ہمیشہ عوام الناس رہنے چاہئیں............ہم بھی انہی کواپنی بات بتاتے رہے ہیں، آج بھی وہی ہمارے مخاطب ہیں۔اس معاملے میں بھی انہی کی خدمت میں یہ کتابچہ پیش کرتا ہوں۔

ایک بات اور۔ میرے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہے کہ میر عبداللہ جان جمالدینی کے ماسوا پچھلے ایڈیشن میں ذکر کردہ میرے سارے سینئر دوست اور اساتذہ اِس جہاں میں نہ رہے۔ ہمہ وقت نعمتوں بھرے سائے میں رہنے والے پودے کی، دھوپ میں کیسی درگت بنتی ہے، میں تو بھگت رہا ہوں، آپ بھی خبردار رہیے۔ اس لیے اپنے آس پاس موجود بزرگوں سے تعلق رکھیے۔ وہ اپنی اَن پڑھی، کم پڑھی، بزرگ سنی اور اُکھڑی یادداشت کے باوجود آپ کے علم کے کاسے میں ضرور کچھ نہ کچھ ڈالتے رہیں گے۔ کم ازکم اُن کا طرز سیکھیے کہ آپ کو بھی بوڑھا ہوکر اپنے زمانے کے نوجوانوں کی تربیت کرنا ہوگی۔ مگر بغیر جتلائے، بغیر احساس دیے، بغیر امیدِ معاوضہ و اُجرت و توصیف کے۔

اچھے دنوں کے آنے کے یقین کے ساتھ!

شاہ محمد مری

ماوند، 29 جنوری 2014

بلوچی زبان و ادب

جلداول

بلوچی زبان اور فوک لور

شاہ محمد مری

2009 کے ایڈیشن کا پیش لفظ

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہاں ایک سماج پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ جس کے رواج، رسم اور قدریں پہلے سے موجود ہوتی ہیں..........اور جو سب کی سب لحہ بہ لحہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ یہ غیر مطمئن سماج قدیم سے جدید کی طرف ارتقاء کرتا جاتا ہے۔ اس طرح اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم سب کو رجعت پسند معاشرے کے خیالات اور آداب ورثے میں ملے ہوتے ہیں۔ اس لیے سائنسی سوچ کا ادراک ہمیشہ سے ایک مشکل عمل رہا ہے۔ بلوچ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔

بلوچ کو اپنے اجداد اور اپنی تاریخ کے بارے میں کھوج بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ اپنی اصل اور ابتدا کے بارے میں ہمیشہ بحثیں کرتے نظر آتے ہیں۔ اور یہ دلچسپ ہے کہ ہر بحث بلوچ کو کہیں باہر سے یہاں لاکر بسانے کی کہانی پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ سائنسی دریافتیں اپنی جگہ مگر ہماری آبادی کا ایک بڑا حصہ مسلمان ہونے کے ناطے ،عرب سے آنے (اور کبھی کبھی تو عرب نسل سے تعلق رکھنے) کی بات بہت شوق اور قبولیت کے ساتھ کرتا ہے۔

فوک ادب دراصل ایک عوام کا اجتماعی شعور ہوتا ہے۔ یہ اُس عوام کا وسیع تر تاریخ ہوتا ہے جس میں اُس قوم کی سیاسی زندگی، معاشی حالات، ماحولیاتی مسائل اور ثقافت دیکھے جاسکتے ہیں۔ چونکہ دنیا کی ساری قوموں کی طرح بلوچوں کی بھی قدیم تاریخ تحریری شکل میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا

ہم بھی اورل پوئٹری میں کلاسیکل اور فوک ادب کے اندر اپنی تاریخ کھوجتے ہیں اور اِس ادب کی موجودگی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔

بلوچ کی زبان اور ثقافت کا سب سے قدیم اور دلکش ذریعہ ہماری شاعری رہی ہے۔ کلاسیکل شاعری، اور فوک شاعری..........اورل ہی رہی ہے۔ فوک (Folk) یعنی عوام جھوٹ نہیں بولتے۔ لہٰذا فوک ادب جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لیے کہ یہ عوام الناس کی تخلیق ہوتا ہے۔ عوام الناس شاعری تخلیق کرتے وقت، اور پھر نسلوں تک اسے سینہ بہ سینہ منتقل کرنے کے سماجی فریضے کی ادائیگی میں جھوٹ کی پیروکاری ہرگز نہیں کرتے۔ وہ اس معاملے میں عمومی خیر، بقائے انسان، اور فطرت دوستی پہ مبنی اپنے دل کی آواز پر عمل کرتے ہیں۔ بلوچی زبان وادب کے قدیم خزانے میں عوامی دلچسپی نے ہی بلوچ ادبی خزانے کو باقی رکھا ہوا ہے۔ اور دلچسپی اس لیے کہ اس میں انسان کی عظمت، ہمت اور استقلال کے خوبصورت موتی پروئے ہوئے ہیں۔

بلوچ کو صحرائی زندگی نے ہمیشہ خبردار رہنا سکھا دیا ہے۔ پہاڑ غیرت وانتقام کا گڑھ ہوتا ہے۔ اور پہاڑی کو بہادر، آزاد، اور سخی ہونا پڑتا ہے۔ اچھے سے اچھائی، برے سے برائی رکھنی پڑتی ہے۔ ورنہ بقا خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ زندگی سے عشق اگر جبلت ہے تو موت سے بے خوفی ماحول ہے۔ بلوچ بہت خود کفیل، اس لیے بہت آزادمنش لوگ رہے ہیں۔ بلوچ آخری امتحان میں اپنے قبیلے کے ساتھ کھڑا ہوگا، خواہ وہ غلط ہو یا صحیح۔ بلوچ خون کے رشتے کو باقی سب رشتوں سے بلند گردانے گا۔ بلوچ خدا پر اندھا ایمان رکھتا ہے مگر وہ باقاعدہ منظّم مذہب اور اِس مذہب کی تفصیلات میں نہیں جاتا.................یہی کچھ اُس کا ادب ہے، اس کی ثقافت ہے۔ اس کی شاعری کی تاریخ انہی نکات کے گرد گھومتی ہے۔

بلوچی زبان وادب کی تاریخ دراصل ہمارے عوام الناس کے حوصلے بلند کرتی ہے۔ بلوچ عوام بہت شوق سے اپنی زبان اور ادب کے ماضی کے بارے میں بولتے اور سنتے ہیں۔ ہر نئی نسل جتنا زیادہ اپنے ادب اور زبان کے ماضی سے شناسا ہوگی اُتنا زیادہ وہ اپنے عوام کی نفسیات سے آگاہ رہے گی۔ بلوچ کی تقدیر ہے کہ ہم ہمیشہ ایک بار پیچھے دیکھیں گے۔ اُس ماضی کی زمین پر

مضبوطی سے پیر جما کر ہم پھر دوبارہ آگے دیکھیں گے؛ اور اس طرح سچ کو دریافت کریں گے۔

حانی شہ مرید، گوہرو گوہرام، شہداذ و ماھناز، بیورغ وگراں ناز، للّہ وگرناز، کیّا وصدو، حمل ماہ گنج، دوستین وشیریں، سیمک ونتھا، مست وسمو، پیرک وگراناز۔ اِن سب داستانوں کے ساتھ منسلک خوبصورت شاعری عشقیہ شاعری ہے۔ اس لیے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بلوچ ادب کا بہت بڑا حصہ عشقیہ ہے۔

بلاشبہ بلوچ شاعری دنیا کی خوبصورت ترین شاعریوں میں سے ایک ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہترین شاعری بہترین موسیقی کو جنم دیتی ہے۔ لہٰذا بلوچ موسیقی بہت ہی دلکش اور متنوع ہے۔ ہم اس کتاب میں بلوچی شاعری اور بلوچی موسیقی میں کافی عرصے تک محظوظ ہوتے رہیں گے، اس لیے کہ بلوچی زبان و ادب کی پوری تاریخ دراصل بلوچی شاعری کی تاریخ رہی ہے............ بلوچی شاعری جو کلاسیکل اور فوک کی صورت ابد تک ہمیں جھومنے پہ اکساتی رہے گی۔

مگر موجودہ کتاب میں اِن سب کا احاطہ مطلوب نہیں ہے۔

قدرتی بات ہے کہ تاریخ میں قدیم ترین دور کو مختصر ترین الفاظ میں لکھا جاتا ہے اور نزدیک ترین عہد بہت مفصل صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ وجہ معلومات کی کمی ہو یا واقعات کی کمی کی، میری اِس تصنیف میں بھی بہت دُور کے ماضی کا تذکرہ بہت مختصر ہے۔ جبکہ بیسویں صدی، یار کی زلفوں کی طرح پُر پیچ و دراز و حسیں انداز میں موجود ہے۔ پندرھویں، سولھویں صدی کا بلوچی ادب تو خیر پوری بلوچ زبان وادب کا زرّیں عہد رہا جہاں میوزنامی دیوی بلوچی زبان پہ فریفتہ رہی۔

افتخار عارف اس ملک کی قومی زبانوں کے بارے میں ایک جمہوری نقطہ نظر رکھتا ہے۔ بالخصوص بلوچی زبان اور ثقافت سے تو اس نے ایک قسم کا قُرب رکھا ہوا ہے۔ زیرِ نظر کتاب لکھنے کی نہ صرف اس نے فرمائش کی تھی بلکہ درمیان درمیان میں سُستی کاہلی چھا جانے پر رفیقانہ ایڑ لگانے سے بھی گریز نہ کیا۔ قیلولہ نہ کرنے دینے کا اُس کا چابک تو دیکھیے ...... ''یہ کتاب اگر میری آپ کی زندگیوں میں چھپ جائے تو کیا ہی اچھا ہو''۔ .... میں اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ علمی ادبی میدان میں میری بڑی خوش قسمتی کیا رہی ہے تو میں

اپنے والد کی علم دوستی کے بعد، اور سی آر اسلم، میر غوث بخش بزنجو، صوفی محمد مصری سے مکمل توجہ کے حصول کے بعد، مولانا عبدالکریم ظہیری، سائیں کمال خان شیرانی اور عبداللہ جان جمالدینی کے عہد میں زندگی گزارنے کو اپنی خوش قسمتی کہوں گا۔ سائیں کمال خان شیرانی اور عبداللہ جان جمالدینی گذشتہ پچیس برس سے مجھے اپنا ترجمان بنائے رکھنے کی دیدہ نادیدہ کاوشیں کرتے رہے ہیں۔ موجودہ کتاب کی ہر سطر میں موجود سوچ انھی دو حضرات کی ہے۔

شاہ محمد مری

6 جولائی 2009

بلوچی زبان

پس منظر، مسائل، حل

بلوچی زبان کا پس منظر

بلوچ قوم اوراس کی سب سے بڑی قومی زبان، بلوچی کی کھوج گذشتہ ڈیڑھ سوسال سے سکالروں، اکیڈمیشنز اور تحقیق کاروں کے لیے ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ اصل میں سارے ایشیا کی پوری آبادی کی مائیگریشن تھیوری نے دنیا کو بہت عرصے تک گمراہ کیے رکھا۔ سارے ایشیائی انسانوں کو ریڑھی میں ڈال کر کبھی یہاں سے وہاں لے جایا گیا، اور کبھی وہاں سے یہاں لایا گیا۔ آریا، نہ آریا کی بحثوں نے سب کا راستہ گم کر دیا۔ اُس دوڈھائی ہزار سال کے زمانے سے پہلے کے دور کے بارے میں لوگوں نے سوچا ہی نہیں۔ خود بلوچ محقق کا مسئلہ بھی یہی تھا۔

ظاہر ہے ہمارے اِن سائنس دانوں کو آرکیالوجی جیسی سائنسی مدد دستیاب نہ تھی، لہٰذا اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ ہم کن ہواؤں کے تھپیڑے ہیں۔ کس حسین علاقے کی مُسکان ہیں، کہاں سے آئے ہیں۔ کون بھائی ہے، کون چاچے کا بیٹا؟۔ چونکہ واحد اوزار جو ہماری دسترس میں تھا؛ وہ محض پانچ سو برس قبل کی کلاسیکل شاعری تھی۔ اس لیے بلوچ چاکر رند کے عہد کو ہی اپنی اس لسانی بحث کا نقطہِ آغاز گردانتا چلا آ رہا ہے۔ پھر جب 'شاہنامہ فردوسی' پڑھنے والے عالموں نے ہماری تاریخ کو ہزار سال پیچھے کھینچا تو بحثیں بھی ذرا سا طول پکڑ گئیں۔ اور یوں ابھی حال تک فارسی کے اس نامور شاعر ابوالقاسم فردوسی کے اِن اشعار کو بلوچوں کا مخزن ومنبع وابتدا سمجھا جاتا رہا:

سپاہے زگردان کوچ و بلوچ
سگا لیدہ جنگند مانندِ غوچ
کسے در جہاں پُشت ایشاں نہ دید
ز آہن یک انگشت نامہ پدید
سپید ارِشاں اشکش تیز ہُش
کہ بارائے دل بود و بامغز ہُش
در فشش بیا ورده پیکر پلنگ
ہمی از در فشش بیا رند جنگ

پھر ذرا پیچھے، ڈھائی ہزار سال قبل آریاؤں کی آمد نے ہمارے تجسس کے سامنے بڑا فُل سٹاپ لگا ڈالا۔ معاملے کو ایسا پیچیدہ بنا دیا گیا کہ ہماری سینئر نسل تک یہ بات حتمی کر بیٹھی کہ ڈھائی ہزار سال پہلے گویا چلتن و جوہان کے پہاڑ وجود ہی نہ رکھتے ہوں، اُن پہ ہرن و بھیڑیا کا وجود نہ ہوا اور اُن کے بیچ موجود تعلق کا تصور تک نہ ہو۔ گویا ڈھائی ہزار سال قبل مچ کے کوندروں کے جنگل سے کوئی نیم انسان ایک نل میں سوراخ نکال کر بانسری نہ بجاتا ہو۔ آفاقیت کبھی کبھی ہم نام نہاد دور بینوں کی نزدیک بینی پہ قہقہے لگا کر ہنستی ہوگی۔

آج تک ہم بلوچ اس بحث سے نکلنے ہی نہ دیے گئے کہ ہماری زبان کی ساخت و پرداخت کیا ہے۔ پہلوی، سنسکرت، دراوڑ..........وغیرہ۔ دوسری زبانوں سے ہمارے رشتے ناطے کیا ہیں؟۔ اور ہم تاریخ میں کس جگہ کھڑے ہیں؟۔

یہ بلا شبہ سائنسی اور جائز بحث تھی، اور ہے۔ اور بحث نہ کرنا جانور پن ہے۔ مگر نتیجہ نہ نکلنے کی نیت سے صدیوں تک بحثیں کرتے رہنا محض طوطا پن ہے۔

پھر اِس پورے تصور کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ پڑ گیا۔ فرانس کے کچھ سائنس دانوں نے خزانہ تلاش کرنے والے بلوچ کی ناترس و ناتراشیدہ گینتی روک دی اور زمین کی زیادہ شائستہ اور نازک و محتاط کھجلائی شروع کی۔ کدال کے ایک وار سے جتنی کھدائی ہوئی تھی، انہوں نے شش ماہیاں

لگا کر اُتنی کھر چائی کی۔ اور برسہا برس کی گرمی سردی پردیسی مسافری، زہریلے کیڑوں اور خونخوار درندوں کے بیچ رہ کر ایک ایسا خزانہ دریافت کیا جس کے لیے دنیا بھر کی تجوریاں قربان۔ مہر گڑھ تہذیب دریافت ہوگئی۔

مہر گڑھ تہذیب کھڑی ہم پہ مسکرا رہی تھی۔ جی ہاں! پتہ چلا کہ ہم پانچ سوا ہزار سال کے بجائے گیارہ ہزار سال پرانے لوگ ہیں۔ اُس وقت سے ہم تباہ نہ ہوئے بلکہ کسی نہ کسی صورت یہیں رہ رہے ہیں۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر جاتے رہے ہوں گے کہ سکوت ناممکن ترین چیز ہوتی ہے۔ اسی طرح لوگ باہر سے آتے رہے، ضم ہوتے رہے۔ مگر اصل اور بڑی آبادی یہیں رہی۔ ہم یہیں رہے۔ بلوچ تاریخ میں یہ اب تک کی سب سے بڑی دریافت ہے۔ یہ کہ بلوچ اسی مقدس مٹی کو اپنا عرش و فرش بنائے رہا۔ کہیں باہر سے نزول نہ ہوا۔ یہ بہت بڑی دریافت ہے، اسی لیے تو ہماری زبان کے ایک ایک لفظ کی اٹمالوجی اور ہمارے کلچر کی ایک ایک انگڑائی انھی ندی نالوں کے قالب سے ڈھلی ملے گی۔ یہ واقعتاً بلوچیالوجی کی اب تک کی سب سے بڑی دریافت ہے۔ ہم جائز طور پر ایک مضبوط و مستحکم ماضی پہ پیر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تفاخر اور اطمینان مستقبل کی چھلانگوں پھلانگوں میں ایک قوم کے زبردست معاون ہوتے ہیں۔

ہم کیا زبان بولتے تھے، ابھی تک معلوم نہیں۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ سارے وسطی اور جنوبی ایشیا کے انسانوں، اُن کی تہذیبوں اور زبانوں کا منبع (اب تک کی معلومات کے مطابق) یہی مہر گڑھ ہے۔

بھئی مہر گڑھ کا انسان بولتا تھا۔ بھئی انسان بولتا تھا...... گیارہ ہزار سال قبل۔ ہم بولتے تھے...... گیارہ ہزار سال قبل۔ ہماری ساری زبانوں کی تشکیل ہوئی...... گیارہ ہزار سال قبل۔

مگر، ایسا نہیں کہ ہم پیدائشی طور پر بولنے لگے تھے۔ نہیں۔ ہم تو باقی جانداروں کی طرح تھے، پھر رفتہ رفتہ انسان کچھ تو دوسرے جانوروں پرندوں کی نقل میں، اور کچھ اپنی جبلی ضرورتوں صلاحیتوں سے مخصوص آوازیں نکالتے نکالتے اور انہیں لفظ کی شکل دے دے کر جانوروں کی دنیا سے خود کو الگ اور ممتاز کر چکا تھا............ گیارہ ہزارہ سال قبل۔

یہ بہت دلچسپ ہے کہ انسان جس قدر اوزار بناتا گیا،اسی قدر اُس کا دماغ قابلیت، اہلیت ، یادداشت ،تفکر اور فیصلوں کے لحاظ سے وسعت پاتا گیا۔ پھر انھی دونوں کی مطابقت میں۔انسان کی زبان،نرخرہ،ہونٹ ،ناک،سینہ اور پھیپھڑوں نے ترقی کرکے اسے گُنگ دام سے اشرف المخلوقات بناڈالا۔حتیٰ کہ وہ گُنگ زبان کو اشاروں، کنایوں کا بدل بنانے کے قابل ہوا۔ ’’آں،اوں‘‘ ہی مہر گڑھ سے ہزاروں برس قبل کے بلوچستان کی زبان تھی ۔جی ہاں،آج کی ترقی یافتہ سائنسی بلوچی زبان’’آں،اوں‘‘ سے شروع ہوئی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ آج ہمارا نوزائیدہ بلوچ دوسرے انسانوں کی طرح نو،دس ماہ کی عمر میں’’آں اوں‘‘ ہی سے بولنا شروع کرتا ہے۔یوں ترقی کرتے کرتے ہمارا جدامجد جانوروں سے بہت آگے نکل گیا اور اُن سے بہت جدا ہوگیا۔اور آج آپ غور کریں، کہ اگر سارے جاندار مل بھی جائیں تو وہ اتنی ساری آوازیں نہیں نکال سکتے ، جتنا کہ اکیلا انسان نکال سکتا ہے۔

چرواہے کی جانب سے بھیڑ بکریوں،اور چراگاہوں سے آتی ہوئی ابتدائی آوازوں سے لے کر تمام پرند چرند درند کی آوازوں کی نقلیں اتارنے تک، اور وہاں سے ہزاروں بولیوں میں ملفوف لاکھوں الفاظ بولنے تک،اور پھر وہاں سے گانے کی مختلف اصناف تک۔

شروع میں تو یہ توقع تھی بھی نہیں کہ انسان کوئی مسجع اور مرصع بولی بولے گا، نہ ہی اُسے کسی قافیہ ردیف کی ضرورت تھی۔ہم آپ سب اپنے دیہی پس منظر سے ہونے کی وجہ سے جانتے ہیں کہ زندگی جتنی سادہ ہوگی الفاظ اُسی قدر کم ،فطری اور مقامی ہوں گے۔چیخنا چلانا ہی ہمارے اجداد کی زبان تھی۔(بلوچی میں اسے ’’واھو چیک‘‘ کہتے ہیں)۔بکری سے،بھینس سے،اور بلوچی تھیریم سے آپ کیا جام درّک کی شاعری میں بات کریں گے؟نہیں۔یہ تو محض چیخوں سے شروع ہوا تھا...........خوف اور خبردار کرنے کی چیخیں،غصہ کی چیخیں اور مدد اور دیگر جبلی ضرورتوں کے لیے چیخیں۔جب محنت شروع ہوئی، کام کی ابتدا ہوئی تو یہ محنت ، یہ کام عموماً اجتماعی انداز میں ہوتا تھا۔ اس میں’’آں ہوں‘‘ جیسے نعرے ہی چلتے تھے۔محنت کی چیخیں!۔سب مل کر’’آں ہوں‘‘ کہیں،اور مل کر زور لگائیں۔

اِدھر ہی سے تو الفاظ پھوٹنے لگے، معانی بننے لگے۔ وہ نشان زدہ لیبل ہیں جو ہم خیالات کے ساتھ نتھی کرتے ہیں۔زبان کی اہمیت جتاتے جتاتے یہ غلطی کبھی نہ کرنی چاہیے کہ یہ یعنی زبان،سوچ سے پہلے ہے(1)۔جتنا ابتدائی انسان ہوگا،اُس میں زبانیں بھی بے شمار ہوں گی۔ مگر جوں جوں سماج ترقی کرتا گیا اور انسانوں میں باہمی روابط بڑھتے گئے،معیاری اور واحد زبان وضع کرنے کا عمل بڑھتا گیا۔پتھر کے زمانے تک تو زبانوں کی تعداد میں اچھی خاصی کمی آئی۔اور اس کے بعد تو اس عمل میں بہت تیزی آئی۔

مہرگڑھ تہذیب میں انسان جنگل کی زندگی اور شکار سے ارتقا کرتے ہوئے زراعت میں داخل ہورہا تھا۔ جہاں موسم سے متعلق الفاظ کی ساخت اور ضرورت بڑھ گئی تھی۔شب و روز کے مختلف پہرا ہم بن گئے۔ جہاں،وہ خواہ جس طرح بھی اِن پہروں کو ناپتا لیکن طلوعِ آفتاب،دوپہر، غروبِ آفتاب اور نیم شب کے لیے الفاظ تو مخصوص ہو چکے تھے۔اور آسمان پہ رنگوں کی تبدیلی سے بارش کے اندازے لگانے والے ماہر وجود میں آ گئے تھے۔پھر ستاروں کی حرکت اور مقام ایک الگ سائنس بن گئے۔اور اگرچار آدمی بھی اُس تہذیب سے زندہ رہے تو انہوں نے پَور (Pleiades)، تیر بند(Orion)،عقرب(Scorpio)، نکّوتخت(Ursa Major) ،قطبہ اِستار،اور روشہ استار نامی ستاروں کے مروج ناموں کو تسلسل ضرور بخشا ہوگا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ نئی زبانیں قدیم زبانوں ہی کے کھنڈرات پر بنتی ہیں۔ہم کسی بھی زبان کو غور سے دیکھیں تو اس میں اس کی پچھلی زبانوں کے الفاظ اور نام (انسانوں اور جگہوں کے نام) زندہ انداز میں شامل ہوجاتے ہیں۔ہم اُن سابقہ زبانوں سے ہل چلانے کے اوزار اور اصطلاحات ،جھگی جھونپڑی کے اجزا، اماں، ابا، جانوروں گھوڑوں کے نام جیسے الفاظ،خوش قسمت اور منحوس پرندوں کے نام، دیوی دیوتاؤں اور جنوں بھوتوں کے الفاظ لیتے ہی رہے۔قدیم زبانیں مکمل طور پر کہاں مرتی ہیں۔

مہرگڑھ زبان کے وہ عناصر جو ماضی کی دھند میں دھند لائے نہ جا سکے، وہ عہدی تقاضوں کی تکمیل کی خاطر نئی نئی صورتیں اختیار کرتے چلے گئے۔اُن میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔اِن

اضافوں سے انہیں کیا سے کیا بناڈالا ہوگا۔ بلا شبہ مہر گڑھ زبان کے اکثر الفاظ گہری تاریکی میں ڈوب چکے۔..........مگر جب تک درہِ بولان اپنے سینے میں بند بلوچی کی گیارہ ہزار سال قبل والی جڑوں کا ہمیں درشن نہیں کراتا، اس وقت تک ہمیں معلومات کی اِسی تنخواہ (یعنی چاکری عہد) پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔

جہاں تک بلوچی زبان کی تحریری شکل میں آنے کی بات ہے تو یہ واضح ہے کہ قدیم زبانوں کی تو بات ہی چھوڑیے، نئی زبانیں بھی تحریری شکل اختیار کرنے سے سیکڑوں برس قبل وجود میں آ چکی ہوتی ہیں۔

سائنسی ماہرین مہرگڑھ سے ملنے والے برتنوں پہ نقش و نگار کو ایک طرح کا ”Proto-writing“ قرار دیے جا چکے ہیں (2)۔ ماقبل تاریخ کی یہ تحریریں اشکال کی صورت تھیں، ان میں رنگوں کا استعمال ہوتا تھا۔ مہرگڑھ کا مادرسری پُرامن اور تخلیقی معاشرہ دنیا بھر کی تہذیبوں کی ماں ہے۔ ایران کا شہرِ سوختہ، قندہار کا مندیگک، عراق کا میسوپوٹیمیا، اور سندھ کا موئن جودڑو، مہرگڑھ کے بیٹے اور پوتے ہیں۔ یہی حال وہاں بولی جانے والی زبانوں کا ہے۔

ویسے بھی جب مہرگڑھ، نوشہرو بنا تھا، اور بعد میں نوشہرو پیرک منتقل ہو گیا اور پیرک موئن جوڈرو اور ہڑپہ کو نقل مکانی کر گیا اور پھر بلوچ حالیہ زمانوں میں بحیرہِ عرب کے آر پار کئی خطوں میں آن بسے تو اُن کی معاشی و سیاسی زندگی افغانستان سے لے کر چین تک سارے نئے رابطوں سے متاثر ہوتی رہی۔ بلوچی زبان و ثقافت کئی گنا امیر ہوتی رہی۔ یوں، آج ہمارا واسطہ ایک زندہ، متحرک اور کمال درجے کی ترقی یافتہ زبان، بلوچی سے ہے۔ جس میں اگر ایک طرف مہرگڑھ کی قدامت کا غیر محسوس و نامعلوم ذائقہ موجود ہے تو دوسری طرف کراچی کی سرمایہ دارانہ صنعت اور سوویت ترکمن سوشلزم کے الفاظ و تراکیب کا حسن باہم شیر و شکر، جلوہ گر ہیں۔

چونکہ اُس ماں زبان کے بارے میں ہم ابھی کچھ بھی نہیں جانتے جسے ابھی تک سمجھا نہیں جا سکا ہے لہٰذا ہم نزدیک بینی کے مرض میں مبتلا رہنے پر مجبور ہیں۔ اور محض ہزار دو ہزار برسوں والے حالیہ عہد کی زبانوں کی تقسیم و درجہ بندی کرنے پر مامور رہ جاتے ہیں اور اس پر اکتفا کرنا ہی

ہماری مجبوری ہے۔

خدا کرے کسی بھی زبان کی جڑیں شالا دھند میں گم نہ ہوں۔

حوالہ جات

1- کولن تج، 1996۔ دی ٹائم بیفور ہسٹری، Scribner، نیویارک، صفحہ 244

2- Catherine Jarrige and others , Mehrgarh Field Reports, 1974:From Neolithic Times to the Indus Civilization، صفحہ 83

بلوچی زبان وادب کا ارتقا

انسانی زبانیں عرش پہ نہیں ،فرش پر بولی جاتی ہیں ۔اورزمین پہ بھی ہر زبان کی تخلیق وارتقا اُس کے اپنے مخصوص علاقے میں ہوتا ہے، وہ علاقے جہاں محنت کرنے والے لوگ اورعوام الناس رہتے ہوں۔ یہ بات اب واضح ہونی چاہیے کہ محلات ودرباروں میں صرف سازشیں پھل پھول سکتی ہیں ۔ مندرمیں زبان گناہ ثواب ناپنے کا ترازو بن کے رہ جاتی ہے۔کانفرنسوں، سیمیناروں، اسمبلیوں ،قراردادوں سے زبانیں گنجلک اورمشکل ہوجاتی ہیں ۔اور مارشل لائیں زبان تو کیا عقل سلیم کی ہرفیکلٹی کا انکار ہیں ۔لہٰذا اِن ساری جگہوں پر زبان کی ترویج نہیں ہوسکتی ۔زبان صرف اور صرف پیداواری عمل کے دوران پیدا ہوتی اور ارتقا کرتی ہے۔ زبانیں توچودھویں کے چاند تلے چولستان میں اپنی ڈاچی پہ جھولتا ساربان بناتا ہے۔ زبان کوجلتی گرما میں کپاس چنتی سندھیانڑیں کے گاونڑ سنوارتے ہیں ۔اور پسنی پار، ساگر کی وسعتوں میں پکڑی مچھلی کو نمک لگاتے ماہی گیر ہی اِسے حسین اور سہل بناتے ہیں..........

دنیا کی ہر زبان کی طرح بلوچی زبان بھی انسانوں کے بیچ رابطہ وابلاغ کا ذریعہ ہے۔ ہر زبان کی طرح بلوچی بھی اپنی تشکیل، اپنے ارتقاکے ہزاروں سالوں کے دوران کرسکی۔ (..........اورزبان کی تشکیل کبھی مکمل نہیں ہوتی، ابدتک جاری رہتی ہے)۔

اسی طرح ہزاروں برسوں کی غلط ودرست کوششوں کے بعد یہ زبان تحریری صورت میں سامنے آئی۔تغیر نے سکوت کوشکست دیتے ہی رہنا ہے، دنیا میں ثبات، دوام نامی کوئی چیز وجودنہیں رکھتی۔ دیگر ساری زبانوں کی طرح (جی ہاں ساری زبانوں کی طرح) ہماری زبان بھی آسمان سے نہیں اتری بلکہ اپنے سے پہلی زبانوں کے الفاظ اورفریم میں پیداواری عمل کے دوران بڑھتی اورپھلتی پھولتی رہی۔زبان رواں آب کی طرح ہوتی ہے، بار بار پیچھے ہٹتی ہوئی ، پیچ وخم کھاتی ہوئی مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہے۔

مہرگڑھ کی زبان ابھی دریافت وعدم دریافت کے چلمن کے پیچھے دُھندیافتگی میں ہے۔ اس لیے جب تک وہ ''ڈی کوڈ'' نہیں ہوتی، ہم بلوچی زبان کواپنی جڑوں سے اکھڑی ہوئی زبان ہی قرار دے کر اُس پر بات کرنے پر مجبور ہیں۔

یہاں کی دوسری زبانوں کی طرح بلوچی کے بارے میں ایک بہت ہی دلچسپ بحث چلتی رہی۔مہرگڑھ، پیرک اورنوشہرو کی دریافت سے قبل، ہماری ہر بات کوآریا قافلے کے آخری اونٹ کی دُم کے ساتھ باندھ دیا جاتا رہا ہے۔ ہمیں اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کہ آریا لوگ آکر ہم میں مدغم ہوئے اور وہ ہم سے اور ہم اُن میں سے بنے۔اِسی طرح آریاؤں کی زبان ''سنسکرت'' (معنی= تراشیدہ، شستہ اورصاف کیا ہوا) ہم سب کی زبانوں کی سگی سہیلی کے بجائے اُن کی دادی قرار دی گئی ۔لہٰذا یہاں کی ہماری زبانوں کے لیے ''پراکرت'' (خوردو، جنگلی، فطری، ناتراشیدہ) لفظ استعمال کرنے لگے۔مگر جس طرح بہت قلیل تعداد میں آنے والے آریا اپنے تمام تر ویلیو سسٹم کے ساتھ ہماری بہت بڑی اکثریت سے گھل مل گئے اسی طرح ہماری زبانیں بھی باہم یوں جذب و انجذاب کے عمل میں گئیں کہ اب ایک ہی زبان بن گئی۔آج ذرا سا غور کریں تو بلوچی میں سنسکرت کے بہت سارے الفاظ موجود ملیں گے (1)۔ایک لحاظ سے سنسکرت زبان ہم میں سے ہے اور ہم اُس میں سے ہیں۔..........یوں آریا بلوچ، اور بلوچ آریا بن گئے۔اب ہم ایک ہیں۔

ماہرین لسانیات کی کلاسی فی کیشن کے مطابق ہماری بلوچی ،زبان، آریائی زبانوں کے ''انڈو یوروپین'' خاندان انڈوایرانی شاخ سے ہے۔ان میں سے جوشاخ ''ایرانی'' کہلاتی ہے،

بلوچی اس میں شامل ہے۔

ہماری یہ قدیم ایرانی شاخ مزید تین ادوار میں منقسم ہے:

سب سے پرانا دور (1000 سال ق م) قدیم ایرانی کہلاتا ہے جس کی اہم زبانیں تھیں: قدیم فارسی، Medic، اوستا، اور پہلوی (2)۔اَوِستا قدیم فارسی کی وہ صورت ہے جو زرتشتیوں کے مذہبی کتبوں پر کھدی ملتی ہے۔(3)

دوسرا دور (331 سال ق م) وسطی ایرانی کہلاتا ہے۔جس میں پہلوی، سوگدیائی اور بلکی زبانیں تھیں۔

تیسرا دور موجودہ ہے جس میں اہم زبانیں ہیں جدید فارسی، پشتو، کردی، اور بلوچی۔ یہ سب نئی ایرانی زبانیں کہلاتی ہیں۔(4)

آیئے ذرا مختصر ترین انداز میں بلوچی زبان کی علاقائی سلامیت کے فریم میں رہتے ہوئے اِس کے ارتقا میں شامل بہت بڑے عوامل وعناصر کا تذکرہ کریں۔

708 ق م کے قریب مغربی ایران میں ماد حکومت قائم ہوئی۔ اس کا پایۂ تخت موجودہ ہمدان تھا۔ اُس زمانے میں کرد بلوچ ''آھورا'' کی پرستش کرتے تھے۔''ھور'' کا مطلب ہے؛ آگ اور ''آ'' کا مطلب ہے: آیا، .... ''وہ حقیقت جو آگ سے دائمی ہے''۔ بھئی، آسان زبان میں بتاتا ہوں: بلوچستان کا مذہب 'آتش پرستی' تھا۔ توران اور مکران کے بلوچوں نے اپنے اس مذہب کو رواج دیا۔ اور توران کی بت پرستی نیم دلی اور نیم انداز میں متروک ہوگئی۔ کرد بلوچ دن میں تین بار آگ کی پرستش کرتے تھے۔ وہ اپنی عبادت گاہ کو ''آریئم'' کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے؛ آتش کدہ۔ آتش کدہ کے معبد کو آری وان کہتے ہیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں آتش کدہ ہوا کرتے تھے۔ بلوچ آج بھی آگ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ہمارے محاوروں اور ضرب الامثال میں آج بھی آگ کو پھلانگنے، آگ کی طرف پیر کرنے، آگ کی طرف تھوکنے، آگ کی طرف ہاتھ کے پنجے سے لعنت بھیجنے کی سختی سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ ہمارا بچہ بھی غیر ارادی طور پر آگ کی تکریم کرتا ہے۔ آگ کی حرمت کرنے کی خصلت بلوچ میں قرنوں تک جاری رہے گی، اس لیے کہ

یہ ہمارے اجداد کا مذہب تھا۔ اور اسے ادب کی مانوس و نامانوس اصناف کی ڈھال دستیاب ہے۔ ....آپ تصور کرسکتے ہیں کہ آتش پرستی ہماری زبان میں کیا کیا وسعتیں لائی ہوگی!!۔

پھر اس خطے میں بادشاہ اشوکا نے 260 ق م میں بدھ مذہب اختیار کیا اور راہبانہ لباس پہن لیا اور بدھ مذہب کی تعلیمات کے مطابق شکار اور گوشت خوری سے پرہیز شروع کردیا......وہ ہر ذی روح سے شفقت اور نرمی کے سلوک کی تلقین کرتا تھا۔ اس نے بدھ مت کی تبلیغ و ترویج کی زبردست کوشش کی۔ وہ انتہائی رواداری برتنے والا انسان تھا۔ وہ لوگوں کے دماغوں کو جیت کر انہیں اپنے دین میں شامل کرتا تھا۔ اشوک نے اپنی پوری سلطنت میں ریڈیکل تبدیلیاں کیں۔ جب وہ شہزادہ تھا، اس نے ٹیکسلا میں وائسرائے بن کر بلوچ علاقوں پر حکمرانی کی۔ بدھ مذہب سے متعلق اس کی تحریریں ستونوں پر کندہ کی گئیں۔ اس کے بعد موریا خاندان زوال کا شکار ہوگیا۔ بلوچستان سے اس کی عمل داری کا خاتمہ ہوگیا۔ ابھی تک بلوچستان کے ادب میں (بالخصوص سنائی جانے والی فوک داستانوں میں) بدھ مت کے اثرات بڑے پیمانے پر ملتے ہیں (5)۔

پھر آیئے ایک اور مذہب کے بلوچی زبان وادب پر اثرات دیکھیں۔ غلام داری سماج کے خلاف ''مانویت'' اور ''مزدکی'' تحریکیں ہمارے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہیں۔ زرتشتی مذہب ریاستی مذہب کا درجہ پا گیا۔ مگر شاہ پور اول کے دور میں مانی نے خود کو یسوع مسیح کا سب سے بڑا اور آخری حواری جتایا۔ اس کی تحریک اور مذہب کا نام ''مانویت'' پڑا۔ اس تحریک سے ہمارے اس خطے کے غلام داری سماج میں زبردست بحران آیا۔ مانویت نے اس سماجی ڈھانچے کو غیر منصفانہ قرار دیا اور اس پر زبردست تنقید کی۔

یہیں پر مزدک کی قیادت میں ایک اور تحریک شروع ہوئی۔ مزدکیوں نے سماجی برائیوں کے خلاف کھلے عام جدوجہد کرنے کا اعلان کیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ فاضل جائیداد رئیسوں سے چھین لی جائے۔ مزدک کی نظر میں حرص اور استحصال نے ''انسانیت کی برابری'' والے خدائی حکم اور خدائی خواہش کو تباہ کردیا تھا۔ مزدک نے خدا کی اس خواہش اور حکم کی دوبارہ بحالی کو اپنا مقصد حیات بنا دیا۔(6)

چونکہ پادریوں اور وڈیروں کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور بادشاہ ان کی اس طاقت کو کمزور کرنا چاہتا تھا، اس لیے شاہ قباد نے اس نئے مزدکی نظریے کی حمایت کی۔ اس نے مزدک کی تعلیمات کے مطابق معاشی سماجی اصلاحات کیں۔ جس سے وڈیرے اور زرتشی ملاّ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور قباد کو عارضی طور پہ اپنے بھائی جماسپ کے حق میں معزول ہونا پڑا۔ مگر فوراً ہی اس نے پینترا بدل ڈالا اور دوبارہ اپنا پرانا مذہب اختیار کیا اور دوبارہ حکمران بنا۔ اب کے اس نے مزدکیوں ہی کا قتل عام شروع کیا۔

اس قتلِ عام کی قیادت اس کے شہزادے خسرو اول نے کی جسے پھر نوشیروان کا خطاب ملا (انوشک۔ روبان۔ ''لافانی روح والا'')۔ مزدک کو نوشیرواں نے 528 کے اواخر میں اُس وقت موت کے گھاٹ اتار دیا جب ساسانی حاکمیت عروج پر تھی۔(7)

مگر ظاہر ہے اتنے بڑے نظریے کو ایک ہی دن میں تو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جب ضیاالحقی خصوصیات والا نوشیروان 531 میں خود بادشاہ بنا تو اس نے مزدکیوں کے قتل عام کا ایک اور دور چلایا۔ کہتے ہیں کہ اس چنگیز کے ہاتھوں ہزاروں مزدکی مارے گئے۔

بلاشبہ مزدک کی انقلابی تحریک ہمارے خطے کی تاریخ میں سب سے بڑی طبقاتی تحریک تھی۔

بلوچوں کی اکثریت اسی انقلابی مذہب ''مزدکیت'' سے وابستہ تھی۔ آج بھی بہت سے بلوچوں کا نام مزدک ہے۔ آج بھی انوشیروان بلوچ کی نفرت کا مرکز ہے۔ کتنے نئے الفاظ ایجاد ہوئے ہوں گے، بلوچی میں اور کیا کیا ضرب الامثال، مناجات اور دعائیں اپنا رس اِس بہتی میٹھی نہر میں گھولتی رہی ہوں گی!۔

پھر عرب، بلوچ سے تجارت و دوستی و پناہ گیری کرتے کرتے باقاعدہ حملہ آور اور پھر قابض ہوگئے۔ عربوں کے ڈائریکٹ یا بالواسطہ روابط نے بے شمار الفاظ ہم سے شیئر کر لیے۔ سردار خان گشکوری نے مشترک الفاظ کی ایک طویل لسٹ مہیا کر دی: شان، اصل، منزل، مجلس، کلام، نصیب، امیر، تاج، کیف، مروارد، غم، حتی، قبہ، خلق، طام، قوت، ضرت، قدر، جہد، وسواس، سر، ظلم،

اسرار، ایمان، حد، جان، بقا، شک، والی، وارث، بر، دکان، وکیل، شہم، بہوش، مسکین، لولاک، گراغ، سترا، ملوک، وبا، شاہد............ وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ الفاظ ایک آدھ صدی پرانے نہیں بلکہ پانچ سو برس قبل سے ہم میں موجود و مستعمل ہیں۔(8)

اور پھر، گیارہویں صدی میں ترکموں کے قبیلے سلجوقوں کا طغرل بیگ کی سطنت پارس پہ چھائی ہوئی تھی۔ بے شمار ترک قبائل پارس کو مہاجرت کر گئے جہاں وہ بلوچوں کے ساتھ کرمان، خراسان، سیستان اور ہرات میں رہنے لگے۔ ہماری قبائلی ساخت انھی کے الفاظ استعمال کرنے لگی۔ اولس (قوم)، تمن، بولک، تمندار، لاغ، اولاک، اڈا (بھائی)، اُرد، (9) ہم مشترک طور پر استعمال کرتے ہیں۔

غوریوں کے بعد نصیر الدین قباچہ قابض ہوگیا۔ جس کے بعد بلوچستان ان علاقوں میں سے ایک بنا جو شمس الدین التمش کے مقبوضہ جات تھے۔ یہ بات 1225 کی ہے۔ اور یہی دور بلوچستان کی بُلبل شاعرہ حضرت رابعہ خضداری کا ہے۔ عشقیہ داستان تشکیل دینے والی رابعہ، ہمارے ہاں ایک ولی کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک خوبصورت شاعری کو جنم دینے والی رابعہ خضداری، بلوچستان کی ثقافتی تاریخ میں ایک بہت ہی بلند چوٹی تصور ہوتی ہیں۔

سولہویں صدی کے شروع میں پرتگیزیوں نے بلوچ وطن کا بھی رخ کیا اور بلوچستان کے ساحلی علاقوں پر ''امن، سلامتی، تمدن، جمہوریت اور پرامن بقائے باہمی'' پھیلانے کے لیے حملے کیے۔ مہذب مغرب کے پرتگالیوں کے ساتھ بلوچوں کی زبردست مزاحمتی جنگ ہوئی جس کے آثار ہماری زبردست شاعری میں آج بھی موجود ہیں۔ کیا خوبصورت شاعری ہے وہ، حمل والی!!......اور پھر بلوچی زبان کے خزانے میں الماری، صابن، تولیہ وغیرہ جیسے الفاظ اور تصورات وہیں مغرب سے تو آئے!!۔

پندرہویں سولہویں صدی ''رِندی'' عہد کہلاتا ہے۔ یہ عہد بلوچی زبان وادب کا ترقی یافتہ ترین دور ہے۔ اور اس میں زبردست شاعری تخلیق ہوئی ہے۔ جہاں عشق ومحبت کی داستانیں وافر ہیں، جہاں قبائلی جنگوں پر مبنی شاعری موجود ہے اور جہاں بیرونی حملہ آوروں اور اُن کے خلاف

مزاحمت کے خوبصورت شاہکار شاعری کے خزانے پڑے ہیں۔

اور چاکر کے عہد میں بلوچی زبان ایک بالغ زبان تھی اور دنیا کی دیگر بڑی زبانوں کے ہم پلہ ادبی، ثقافتی اور سائنسی اظہار بھرپور انداز میں کر رہی تھی۔ سچ ہے کہ دوسری کسی بھی زبان کی طرح، بلوچی زبان بھی بنی بنائی شکل میں چاکر و شہیہ مرید کو نہیں ملی بلکہ وہ تو صدیوں کی ''تجرباتی کوششوں'' سے پیدا ہونے والی نطقی روایت کے نسل در نسل منتقل اور متغیر ہوتے رہنے کا نتیجہ ہے۔ تغیر و تبدل اور تراش خراش کے اس کے دامن میں، صوتی آنکھ مچولی ہی نہیں بلکہ تہذیبی سفر، نفسیاتی کرشمہ اور سیاسی وسماجی نیرنگیوں کی داستان بھی موجود ہے۔

اس قدر قدیم زبان کا خالص اور سُچا رہنا نہ کل ممکن تھا اور نہ آج ممکن ہے۔ چاکری عہد کی بلوچی بھلا زرتشتیوں کے جشنِ نوروز، اور اس سے متعلق اصطلاحات، اور شعروادب سے بچ سکتی تھی؟! وہ بلوچی جو خود خیر سے کافی عرصے تک زرتشتی رہی تھی۔

پندرہویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک بلوچستان خوانینِ قلات کی حکمرانی میں رہا۔ جہاں فارسی دفتری سرکاری زبان رہی۔ بلوچی زبان پیچھے بھی بہت گئی مگر جدید فارسی اثرات نے غیر سرکاری بلوچی کو امیر بھی کر دیا۔ (غیر سرکاری بلوچی زندہ باد!)۔

نصیر خان نوری کی دہلی تک فوج کشیوں نے دیگر بہت سی بلوچستانی و غیر بلوچستانی زبانوں کے ساتھ بلوچی زبان کے روابط قائم کروادیے۔ وہاں سے غلام لائے گئے، عورتیں باہر سے یہاں لا کر اپنے فوجیوں میں بیاہ دی گئیں۔ تجارت کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

چھوڑیے حاکموں کی فتوحات پر ہم نہیں اتراتے!۔ ہمیں تو بس قدرت نے جام درک عطا کرنا تھا، کر دیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں قسمت نے بلوچی زبان کی ایک اور زبان، انگلش کے ساتھ لین دین کرائی تھی جو آج تک جاری ہے۔ انگریز پہلے تو طبعی طور پر ہمارا سامراج بنا جب ہم نے لڑ لڑ کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ انگریز سے اِس دشمنی کے رابطے سے ہماری زبانوں کے الفاظ نے بے شمار لین دین کی۔ انگریز نے ہماری نفسیات وسماج کو سمجھنے کے لیے ہماری زبان سیکھی، اُس کے بارے

میں لکھا، تحقیق کی۔ اس نے ہماری کلاسیکی شاعری جمع کر کے چھاپی۔ گرامر، فوک کہانیاں اور موسیقی کو جمع کیا اور انہیں تحریر کر کے ابدمان کر دیا۔ ہم اُن سارے سکالرز اور ریسرچرز کے احسان مند ہیں۔ ہماری زبان ہزار گنا ترقی کر گئی۔ صرف اسّی سال بعد بلوچ آزاد تو ہوا مگر اُس وقت تک انگلش زبان دنیا بھر میں سائنس ٹیکنالوجی اور تجارت کی Lingua Franca بن گئی۔ کتنے الفاظ اس نے ہم سے، ہم نے اس سے لیے!!۔ ٹوک، ڈوڈو، ٹال............

اُس بیچ پہلی جنگ عظیم بھی آئی۔ اُس میں جرمن پمفلٹ خراسان و خضدار کو سیراب کرتے رہے۔ نئی نئی باتیں، نئے نئے الفاظ............

اور یہیں کہیں 1917 میں روس میں بالشویک انقلاب ہوا۔ لینن، سوشلزم، بورژوازی، پرولتاری، قومی آزادی الغرض بہت بڑے فلسفیانہ سوال اپنی مخصوص اصطلاحات کے لشکر کے ساتھ بلوچی زبان کے وسیع دامن میں پناہ گزین ہوئے اور بالآخر مقامی بنے۔

ابھی، دوڈھائی سو برس قبل کی ہماری اپنی سامراج دشمن جنگ نے ہمیں انڈین نیشنل کانگریس سے ملوادیا اور درجنوں زبانوں کے ساتھ بلوچی کو بغلگیر کرایا۔ اور پھر دوسری عالمی جنگ اور اس کے نتیجے میں بلوچستان کی اپنی آزادی کے ساتھ ساتھ درجنوں ملکوں کی سامراج سے آزادی کی پرمسرت ہوائیں چلیں۔ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ بلوچی زبان نے ترقی کے کتنے زینے پھلاند لیے۔

اُس کے بعد پھر ہم سرد جنگ کا حصہ بنا دیے گئے۔ مگر یہاں افغان انقلاب نے جتنا مثبت اثر ہم پر ڈالا شاید ہی کسی اور واقعہ نے بلوچی زبانوں کو اس قدر مالا مال کیا ہو۔

بیسویں، اکیسویں صدی حیرتوں کی صدیاں رہی ہیں۔ وہ وہ واقعات وایجادات ہوئے کہ بلوچی زبان کے بشمول پوری دنیا کی زبانوں میں بگ بینگ بجنے کا تسلسل رہا ہے۔ مثلاً آپ دیگر لوگوں اور زبانوں کے ساتھ بلوچی زبان کے ملنے جلنے میں تیز رفتاری کا اندازہ کریں۔ اسی صدی میں انگریز آیا، صرف خود نہ آیا بلکہ وہ تو بہت سی بولیاں بولنے والوں کے ذریعے ہم پر حملہ آور ہوا۔ ہماری زبان تو خیر پہلے ہی ہماری دفتری زبان نہ تھی مگر انگریز نے فارسی کو دھکے مار مار کر تخت سے گرادیا اور انگلش، اردو کو دفتری سرکاری زبان بنا ڈالا۔ پھر انگریز کے ذرائع آمدورفت

دیکھیے؛ شتر بانی سے ہمیں ہٹا کر بڑے پیمانے پر ریلوے کے ذریعے ہمارا تعلق ایک سے زیادہ زبانوں سے کروادیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے یہاں بے شمار پیشوں کو ختم کردیا، اُن پیشوں سے متعلق الفاظ واستعارات اکھاڑ پھینکے۔ اور نئی ٹکنالوجی کے سارے الفاظ، اشارے، مخفف بلوچی میں رائج کردیے۔ اب آٹو موبیل، سپیس ٹکنالوجی، الیکٹرانکس، انٹرنیٹ اور موبائل فون نے ہماری دنیا بدل کے رکھ دی۔ بلوچی زبان اس قدر تیز رفتاری سے ترقی کرتی، اور امیر ہوتی جارہی ہے کہ:

''محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی!''

حوالہ جات

1- بلوچ، عبدالرحمٰن، بلوچ کئے انت، 1360، افغان علومی اکیڈمی، کابل، صفحہ 7

2- نہرو، جواہر لال، Letters From A Father To His Daughter۔ چلڈرنز بک ٹرسٹ نیو دہلی، صفحہ 79

3- بار بر، چارلس، اے سٹوری آف لینگویج، 1964، انگلش لینگویج بک سوسائٹی لندن، صفحہ 85

4- جہانی، کارینا، سرگئی ایکسی نوف کی کتاب The Balochi Language of Turkmenistan، اپسالا 2006، صفحہ 20

5- نصیر، گل خان، ''بلوچی رزمیہ شاعری 1979''، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، صفحہ 14

6- براؤن، ایڈورڈ، جی، ''اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا''، جلد نمبر ا کیمبرج 1929، صفحہ 170

7- براؤن، صفحہ 137

8- بلوچ، سردار خان اے لٹریری ہسٹری آف بلوچیز، جلد نمبر 1-1977، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، صفحہ 16

9- بلوچ، سردار خان اے لٹریری ہسٹری آف بلوچیز، جلد نمبر 1-1977، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، صفحہ نمبر 19

بلوچی زبان کا لسانی جغرافیہ

بلوچوں کا وطن بلوچستان مجموعی طور پر، 647000 مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے۔ یہ 347,190 کلومیٹر پاکستان میں، تقریباً 200000 مربع کلومیٹر جنوب مشرقی ایران میں، اور 100000 مربع کلومیٹر مغربی افغانستان میں ہے۔ بلوچی زبان پاکستان کے علاوہ ایران، افغانستان (صوبہ نیمروز)، خلیجی ریاستوں، بالخصوص اومان اور یواے ای میں، مشرقی افریقہ (کینیا، یوگنڈا، تنزانیہ، زائرے، روانڈا اور برونڈی)، شمالی امریکہ، یورپ، آسٹریلیا اور ترکمانستان کے ماری علاقے میں بولی جاتی ہے۔

پاکستان: بلوچی' پاکستان میں تقریباً ہر صوبے میں بولی جاتی ہے۔ بلوچستان تو اس کی جنم بھومی ہے ہی' مگر پنجاب میں ڈیرہ غازی خان، راجن پور، ملتان اور مظفر گڑھ میں بلوچی بولی جاتی ہے۔ سندھ میں جیکب آباد، سانگھڑ، میرپور، نواب شاہ اور کراچی میں یہ زبان ایک بہت بڑی آبادی کی مادری قومی زبان ہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں بلوچ اکثریت میں رہتے ہیں جو بلوچوں کی دوسری بڑی قومی زبان سرائیکی بولتے ہیں۔ واضح رہے کہ بلوچوں کی ایک بڑی اکثریت اپنی مادری قومی زبان کی حیثیت سے سرائیکی بولتی ہے۔ سندھی بولنے والے بلوچ بھی پاکستان میں کروڑوں کی تعداد میں

ہیں۔اور پنجابی تو شاید بلوچوں کی بہت بڑی اکثریت بطور مادری زبان بولتی ہے۔

اسی طرح ہمایوں کے دور میں دہلی میں جا گزیں اور وہاں سے پاکستان پلٹ آنے والے بلوچوں کی مادری زبان اردو ہے۔

اس لیے بلوچ تاریخ میں بلوچی زبان کی اہمیت مسلّم ہوتے ہوئے بھی اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ بلوچ دنیا بھر میں صرف بلوچی بولتے ہیں۔ دراصل بلوچوں کی دس مادری قومی زبانیں ہیں۔ ان میں بلوچی کے علاوہ براہوی، پنجابی، سرائیکی، سندھی، اردو، پشتو، فارسی کھیترانڑیں اور ترکمن زبانیں شامل ہیں۔ یہ دنیا بھر میں ''قومی سوال'' کے سیاسی اور نظریاتی علمی مباحثے میں بلوچ قوم کی ایک خصوصی اور امتیازی صفت ہے۔

ایران: ایران میں بام اور باشاگرد پہاڑوں کے مشرق میں کرمان صحرا سے لے کر جنوب مغربی افغانستان تک بلوچی بولی جاتی ہے۔ بلوچ شہر یہ ہیں: ایران شہر، چاہ بہار، نِک شہر، سرباز، ساراوان، زاہدان، خاش۔ یہاں شہرِ سوختہ اور دزآپ (زاہدان) کے شہر 2000 سال پرانے ہیں۔

افغانستان: افغانستان کے جغرافیہ میں بلوچ نیمروز، ہیلمند، قندہار اور فرح میں آباد ہیں۔ اپنی زبان اور ثقافت کی نگہبانی کرتے ہوئے یہ کاشتکار اور نیم خانہ بدوش لوگ اپنے معاشی معاملات میں خود کفیل زندگی گزارتے ہیں۔

وسطی ایشیا: ترکمانستان کے اندر بلوچ آباد ہیں جو کہ اصل میں افغانستان کے نمروز صوبے کے ضلع **چخن سُور** اور ایران کے سرحدی علاقوں (بالخصوص خراسان) کے لوگ تھے۔ یہ لوگ انیسویں صدی کے آخر میں قحط سالی کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر ترکمانستان میں بس گئے تھے۔

آج ترکمانستان میں یہ لوگ مری (ماری) علاقے میں دریائے مُرغاب کی وادی کے تین ضلعوں (یولوتان، ترکمن قلعہ، اور بیرم علی) میں رہتے ہیں۔ ترکمانستان میں بلوچی بولنے والے بلوچ قبائل کے نام ہیں: یاسے زئی، جاکر زئی، شاہ حسینی، گزخیل، مالکی، رودینی، سمالانڑیں، پرّ کانڑیں، کرم زئی، رخشانڑی، کاسّانی، ہیثر بانڑی، عَید وزئی، کالوالی، گورگیژ، لوڑی، زالوزئی، بارک زئی، رند، ناروئی،

بڑیچی، ریکی، سَید زئی، خاجہ، دَمرک اور کرائی (1)۔

مشرقِ وسطیٰ: سعودی عرب، قطر، اومان، بحرین، کویت اور یو اے ای میں بلوچ رہتے ہیں، کہیں بہت بڑی تعداد میں کہیں کم۔

اس کے علاوہ افریقہ میں کینیا، تنزانیہ میں بلوچوں کی بڑی آبادیاں ہیں۔ چھوٹی تعداد میں سویڈن، ناروے، ڈنمارک، انگلینڈ، پرتھ (آسٹریلیا) میں بھی بلوچ موجود ہیں۔ ہندوستان میں بھی۔

******

بلوچی زبان ایک طرف ہندی زبانوں (بالخصوص سرائیکی، پنجابی اور سندھی) سے سرحد بناتی ہے تو دوسری طرف ایران میں فارسی زبان کے ساتھ ملتی ہے۔ اُن علاقوں کے قریب کے لوگ دولسانی لوگ ہوتے ہیں۔ سلیمانی بلوچی اور مکرانی بلوچی علاقے کے درمیان براہوئی زبان بولی جاتی ہے۔

اُن تمام ملکوں میں جہاں بلوچی بولنے والے موجود ہیں، وہ سب کے سب ممالک ایک کلچرل تنزلی اور انحطاط میں غلطاں ہیں۔ وہاں تعلیمی، نصابی، معاشی، سیاسی، اور تمدنی افراتفری کا دور دورہ ہے۔ بلوچی نہ تو وہاں سرکاری زبان ہے نہ ہی یہ تعلیمی زبان ہے۔ پھر بلوچ قوم کو صنعت سے بہت دور رکھا گیا ہے، اس لیے ماسوائے مویشی بانی یا زراعت کے بلوچی زبان روزگار نہیں دلا سکتی۔

بلوچی زبان کی تاریخ اُس کے بولنے والی قوم کی تاریخ ہے۔ اور بلوچ کی تاریخ بارشوں اور امن کی تلاش کی تاریخ رہی ہے۔ قحط سالی اور جنگیں اُس کا جغرافیہ بدلتی رہی ہیں۔ یہی جغرافیائی بدلتی صورت حال اس کی طرزِ زندگی پہ بہت اثر ڈالتی رہی ہے۔

ہماری تاریخ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کی تاریخ بھی رہی ہے اور داخلی طور پر باہمی جنگوں اور چراگاہوں کی تلاش کی تاریخ رہی ہے۔ ہم مویشی بانی والی قوم رہے ہیں۔ مویشی بانی زمین، بالخصوص چراگاہوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لہذا ہمارا پورا ویلیو سسٹم حیاتیات میں

لائیوسٹاک، آسمان میں بادلوں اور زمین پر چراگاہوں چشموں پہ استوار رہا ہے۔ مگر چونکہ یہ بہت سادہ اور عملی معاملات تھے، لہٰذا جانوں اور سروں کی قیمت پہ اس ویلیو سسٹم کے اجزا کی حفاظت کی جاتی رہی ہے۔ ریاست کی عدم موجودگی میں ہر قبیلہ اپنے معاشی مفادات پر مبنی اِن اقدار کی حفاظت کرتا ہے۔ ایک سادہ مگر بے آرام زندگی ہی مقدر رہتی ہے ایسی اقوام کی۔ اٹھارویں صدی کا بالاچ ہماری زندگی کا ایک نمونہ یوں پیش کرتا ہے:

پہاڑ ہیں بلوچوں کے قلعے
بے راہ چوٹیاں ہیں ان کی ساتھی

ظاہر ہے بلوچ کی مخصوص صورت حال نے ماضی بعید میں ہمیں تحریری ادبی روایت کی نعمت نہ بخشی۔ چنانچہ یہاں صرف زبانی (اورل) شاعری ہی پنپ سکی، اس شاعری کو موسیقی کے ساتھ سنانے کی روایت ہی پنپ سکی۔ کچھ جگہوں پر تاریخ اور ادب کو ملا جلا کر ڈرامے پروان چڑھے۔ اور بچوں کو تاریخ، اور بلوچ روایات پر مبنی کہانیاں سنائی جانے لگیں۔ اور مندرجہ بالا کو محفوظ رکھنے والے فنکار نمودار ہوتے رہے۔

الفاظ کا قرض دینا اور لینا ایک زبان کی مستی نہیں بلکہ اُس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بلوچی نے تو اس میدان میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ اس نے اگر دوسروی پڑوسی زبانوں کو اپنے الفاظ دے کر امیر کر دیا تو دوسری طرف بلا جھجک دوسری زبانوں سے الفاظ لے لیے۔ حاکم زبانوں (مثلاً فارسی، انگریزی، اردو، ترکمن اور روسی) سے بھی اور پڑوسی زبانوں (پنجابی، سندھی، براہوئی، سرائیکی، پشتو) سے بھی۔

بلوچی، اور بلوچوں کی دیگر قومی زبانیں

بلوچی پاکستان (بلوچستان، سندھ اور پنجاب)، جنوب مشرقی ایران، جنوبی افغانستان، ہندوستان، خلیجی ریاستوں اور ترکمانستان میں بولی جاتی ہے۔ اتنے بڑے جغرافیائی علاقوں میں پھیلی ہوئی اس زبان کا بڑے پیمانے پر پڑوسی زبانوں سے لین دین چلا آ رہا ہے۔ پاکستان میں اگر یہ زبان اردو، سندھی، سرائیکی، پنجابی، براہوئی اور پشتو کے اثر کے تحت ہے تو افغانستان میں یہ دری اور پشتو سے متاثر ہوتی ہے، ترکمنستان میں بلوچی زبان پر ترکمن اور روسی زبانوں کے اثرات ہیں۔ ایران میں ہمیں بلوچی پر فارسی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ مشرقی افریقہ میں سواحلی زبانیں ہماری زبان کی پڑوسنیں ہیں۔ اسی طرح قدرتی طور پر خلیجی ممالک میں Semitic زبان، عربی کے اثرات بلوچی پر موجود ہیں۔

یہ میں عاجزی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ وگرنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بلوچی زبان اُن زبانوں کو غنی نہیں کر رہی؟۔

ایک مہلک غلطی ہم سے یہ ہو رہی ہے کہ ہم بلوچ قوم کی زبان، ادب اور تاریخ کو صرف بلوچی زبان تک محدود کر رہے ہیں۔ بلوچ قوم دنیا کی اُن کم قوموں میں سے ایک ہے جو ایک سے زیادہ قومی زبانوں کے مالک ہیں۔ بلوچ قوم مادری اور قومی زبانوں کی حیثیت سے 10 زبانیں

رکھتی ہے۔ بالخصوص براہوی، سرائیکی ، سندھی، کھیتر انڑیں اور فارسی ۔ اِن زبانوں کو جب بھی بلوچی زبان سے جدا کر کے دیکھا گیا تو بلوچ کی ادبی و سیاسی تاریخ کا سمجھو بازو کاٹ دیا گیا۔اُس کے ذکر کے بغیر ہمارے ادب کی تاریخ ادھوری رہے گی۔

مگر، بلوچی زبان ہر جگہ بہت دباؤ میں ہے۔ بالخصوص پاکستان میں، جہاں نظریاتی طور پر کوشش کی گئی کہ اس ون یونٹی ملک میں ایک ہی زبان پھلے پھولے، باقی خودکشی کر لیں۔ یہاں گھر میں مادری زبان بولنی ہوتی ہے،سکول میں اردو بولنی ، پڑھنی اور لکھنی پڑتی ہے،سکول میں باقی جو بچا تو ،لکھنا برٹش انگلش میں، بولنا امریکی انگلش میں پڑتا ہے۔ ملا کی دنیا میں عربی ہے اور سعدی کا گلستان بوستان فارسی میں ۔حتیٰ کہ اب تو چینی بھی پڑھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ حاکم اندھے ناترس ہیں۔اُن کی نظر میں دنیا بھر کی سب زبانیں یہاں لاگو کردو مگر یہاں بچہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل نہ کرے۔

بلوچی ،اردو:

یہ دونوں ہی زبانیں بلوچوں کی مادری زبانیں ہیں۔ ہندوستان میں بلوچوں کی بہت بڑی اکثریت اردو مادری زبان کے بطور بولتی ہے۔

یہاں پاکستان میں ابھی تقریباً ایک سو سال سے بلوچی زبان کا بھرپور رابطہ اردو زبان کے ساتھ ہوا۔ اولین پچاس برس تو دونوں کے بیچ بغیر ایک دوسرے کو کہنی مارے اچھی لین دین چلی۔ ’فریادِ بلوچستان‘، ’شمس گردی‘، اور ’محراب گردی‘ اردو زبان میں بلوچوں کی اولین تحریریں تھیں۔ انجمن اتحادِ بلوچاں اور بعد میں قلات نیشنل پارٹی سے لے کر نیشنل پارٹی اور بلوچ حق توار تک بلوچ کی سیاسی سماجی زندگی میں اردو ہی کے اندر ساری سیاسی شاعری ،تقاریر، مضامین اور خطوط لکھے جاتے رہے۔ دونوں زبانیں شرف واحترام کے تعلقات کے تحت بقائے باہم میں جیتی رہیں۔

مگر پچاس سال سے، جب سے اردو نے ریاستی سرکاری زبان کی حیثیت اختیار کی تو وہ بلوچی کی چونڈیاں کاٹنے لگی۔ خود کو بھی نقصان پہنچاتی رہی اور بلوچی کو بھی اپنی مقتدرگی سے دیوار سے

لگاتی رہی۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر زبان رابطے کا ذریعہ ہے ۔ یہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان رابطے اور افہام وتفہیم کا سب سے بہتر اور سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔لہٰذا دنیا کی ہر زبان مقدس بھی ہے اور محترم بھی ۔ البتہ پاکستان میں، زبان محض لسانیاتی معاملہ نہیں ہے۔ تیسری دنیا کے ہر ملک کی طرح یہاں بھی ’زبان‘، سیاست اور انسان کش لڑائیوں تحریکوں کا باعث رہی ہے۔ یہاں لال بجھکڑ حکمرانوں اور اُن کے احمق دانشوروں نے پورے پاکستان کو ایک قوم قرار دیے رکھا اور اردو کو قومی زبان ۔دلیل شلیل کوئی نہ تھی، بس بز ورِ بوٹ و بم ۔ یہ جو دنیا بھر میں 21 فروری بطور ’’مادری زبان دن‘‘ منایا جاتا ہے۔ یہ دن پاکستان ہی کی وجہ سے وجود میں آیا۔ جی ہاں، پاکستان کی وجہ سے ،جس نے اپنی ’’زبان پالیسی‘‘ کو، اپنے اندر موجود ممتاز تاریخی شناختیں رکھنے والے مختلف علاقوں کے تہذیبی تنوع کو دبانے کے لیے استعمال کیا۔ ہوا یوں کہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے اپنی زبان بنگالی کو بھی قومی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ مگر پاکستانی حکمران اور اُن کے دانشور اردو کے پہلو بہ پہلو بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دینے کو ’شرک‘ سمجھتے تھے۔ اُن کا مستقل خیال تھا کہ اس سے پاکستان کی ’وحدت‘ اور ’سالمیت‘ کو دھچکا لگے گا اور پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ چنانچہ جب حکومت پاکستان نے اردو کو واحد قومی زبان قرار دیا، تو اپنی زبان وادب اور کلچر پر فخر کرنے والی بنگالی قوم نے اس فیصلے کو نہیں مانا۔

میں قارئین کی توجہ ملا عبدالحق کے اُس بیان کی طرف مبذول کراؤں گا جو 20 مارچ 1952 میں چھپا جس میں اُس نے بنگالی کو قومی زبان بنانے کی مخالفت کی اس لیے کہ وہ زبان قومی زبان ہونے کی اُس کی مقرر کردہ مندرجہ ذیل شرائط پر پورا نہیں اترتی:

1- زبان دیسی ہو، بدیسی نہ ہو۔

2- کسی خاص فرقے یا رقبے تک محدود نہ ہو۔

3- ملک کے مختلف علاقوں میں دوسری بولیوں کے مقابلے میں زیادہ لکھی، پڑھی، سمجھی یا بولی جاتی ہو۔

4- قومی تہذیب وتمدن اور روایات کی حامل ہو۔

5- ہر قسم کے جذبات وخیالات کے ادا کرنے پر قادر ہو۔

6- ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہو۔

7- زمانہ کا ساتھ دے سکے اور حالات کے مطابق ڈھل سکے۔(2)

(شریف آدمی! تم غلط تھے، قومی زبان کی سات نہیں صرف ایک شرط ہوتی ہے: وہ کسی قوم کی زبان ہو)۔

ملا عبدالحق یہیں بس نہیں کرتا، وہ تو بس فرماتا ہی چلا گیا تھا۔ اُس نے زبانوں کے بارے میں اس قدر آلودہ تصورات پیش کیے کہ تصور تک نہیں ہوتا:

’’اردو جس قدر قومی تہذیب وتمدن اور قومی روایات سے بھرپور ہے، بنگالی اُسی قدر محروم ہے۔ محروم کیا سرو پا ہندوانی زبان ہے۔ اس میں تمام تلمیحات، تشبیہات، استعارے، قصے، کہانیاں، اور تاریخی واقعات سب ہندوانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ساری زبان دیوتاؤں اور دیویوں کے افسانوں اور علم الاصنام کی تلمیحوں سے لبریز ہے۔ اسلامی تہذیب و روایات کا نام نہیں۔ اور اگر کہیں کچھ ذکر آتا ہے تو مسخ صورت میں۔ اردو زبان میں اسلامی مذہب اور اسلامی تاریخ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔........... بنگالی نے سنسکرت کا دودھ پیا ہے۔ اور ہندوانی ماحول میں پلی اور بڑھی ہے۔ اس میں ہماری تہذیب اور مذہبی خیالات کا سرمایہ نہیں ہے...........‘‘۔(3)

اُس کا یہ ناروا، مکروہ اور نسل پرستانہ فتویٰ بھی پڑھیے:

’’پاکستان کا اتحاد واستحکام اور اس کی سالمیت صرف اردو زبان پر منحصر ہے۔ اردو کے ساتھ کسی دوسری زبان کو شریک کرنا شرک ہے، کیوں کہ ایسا کرنا پاکستان کی وحدت کے منافی ہوگا‘‘۔(4)

اس قدر ناروا نقطہ نظر رکھنے والوں کو پتہ نہیں لوگ کس طرح اپنا ’’بابا‘‘ بناتے ہیں اور پھر ایسے لوگوں کا دفاع سائنسی لہجے اور اصطلاحات استعمال کر کر کے کرتے ہیں!!

بعد میں ہم دیکھتے ہیں کہ بنگالیوں کی ’’زبان ایجی ٹیشن‘‘ کو طاقت کے زور پر کچلنے کی

کوشش کی جاتی ہے۔ ہر قیمت پر اردو کو واحد سرکاری وقومی زبان کے بطور مسلط رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں 21 فروری 1953 کو پولیس نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں احتجاج کرنے والوں پر گولی چلادی، جس سے چار طالب علم ہلاک ہوگئے۔ ناقابلِ تلافی نقصان کے بعد بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ مل گیا۔

اس لیے جب بھی ’قومی‘ اور ’سرکاری‘ زبان اردو کی بات ہوگی، دوسری پاکستانی قومی مادری زبانوں والے لوگ اُن ساری زیادتیوں، زیانوں اور سسکیوں کو یاد کیے بنا نہیں رہ سکتے ہیں جو اِن ارمان کچل ڈالنے والی تحریکوں نے انہیں دی ہیں۔ ’’اردو پڑھو، اردو لکھو، اردو بولو‘‘ کی پالیسی نے نہ صرف اردو کا کھاد پانی روک دیا بلکہ اس نے ہماری باقی زبانوں کے ارتقا کے نرخرے پر پاؤں رکھے رکھا۔ حاکم طبقے نے اردو کے ذریعے ہماری دیگر مادری قومی زبانوں پر ’لسانی استعماریت‘ یوں جاری کردی کہ اِسے اُن کے استحصال کی قیمت پر ’’قومی زبان‘‘ بنادیا گیا۔ ہمیں یہ شعور ہے کہ کوئی زبان بجائے خود استعماری نہیں ہوتی۔ استعماریت زبان کی جوہری خصوصیت نہیں، بلکہ اس کا مخصوص سیاسی استعمال ہے۔ جب بھی یہاں کی مادری قومی زبانوں کی ترقی کی بات چلی، اردو کے شاؤنسٹ لوگوں نے اُسے ’’اپنے جنازے کو دھوم سے نکلنے‘‘ پر محمول کیا۔ بدبختوں نے ایک جنازے کے خوف سے کتنے جنازے نکلوادیے۔ مگر، غُل مچانے سے زبانیں اپنی ترقی کی جہد سے رک سکتی ہیں کیا؟۔ چنانچہ، اپنی بقا کے لیے ہماری زبانیں اس طرح لپکیں جھپٹیں جس طرح دمے کا مریض آکسیجن کے لیے مچلتا جھپٹتا ہے۔ ایک ایک انچ کی پیش قدمی کئی سر کھاتی گئی۔ ایک غیر جمہوری قدم، دس مزید غیر جمہوری اقدامات کا سامان کرتا ہے۔

چونکہ یہ سرکار کی زبان تھی اور سرکار لیاقت علی کی سیٹو سنٹو اور ضیا الحق کی جہادی فسادی اور عالمی رجعت کی علمبردار تھی، لہٰذا اردو اِن رجعتی حکمرانوں اور فرسودہ فیوڈل نظریات کے ہاتھوں اخباروں میں، ریڈیو، ٹی وی پہ، اور نصابی کتب میں بہت نیچ اور غیر انسانی اعمال کی ترجمان بنادی گئی۔ اس کے فیضؔ، گل خانؔ، جالبؔ، سجاد ظہیرؔ تو جیلوں، عقوبت خانوں میں گلتے سڑتے رہے۔ بلوچی زبان، اردو کے اندر پلہ بھاری رکھنے والے انسان دشمن انبار کے نیچے، گھٹے دم کے ساتھ زندہ رہی۔

عوام الناس اور عوامی تحریک کے ساتھ جمہوری تعلقات نہ رکھ کر خود اُردو کو زبردست نقصانات ہوئے۔ اپنی مائتھالوجی اور فوک نہ ہونے کے سبب یہ زبان اپنی جڑوں ہی میں کمزور تھی۔ اوپر سے حاکم زبان بن بیٹھی تو مزید گڑبڑ ہوتی گئی۔

دنیا میں کہیں بھی کسی زبان کو کسی مذہب کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکتا۔ حتیٰ کہ عربی اور عبرانی کو بھی نہیں۔ لہٰذا اردو بھی کسی خاص مذہب کی زبان نہیں ہے۔ مگر ہم نے دیکھا کہ 'بابائے اردو' نے اُسے مسلمانوں کی زبان قرار دیا تھا اور وہاں ہندی کو، اور یہاں باقی پاکستانی زبانوں کو باقاعدہ بت پرستوں کی زبانیں قرار دیا تھا۔ مگر اب بھی یار لوگ اُس اردو دشمن کو بابا بنائے بیٹھے ہیں اور بقیہ زبانوں کے اِس دشمن سے دامن نہیں چھڑاتے۔ ہم سب گواہ ہیں کہ اب تک کی پوری پاکستانی تاریخ میں سرکاری فیوڈل لکھاریوں نے بھی تواتر کے ساتھ اردو کے فروغ واستحکام کو دینی و مذہبی فریضے کے مترادف گردانا۔

ایک اور پیدائشی نقص یہ ہے کہ بلوچی کے برعکس اردو کی جڑوں میں کہیں نہ کہیں انگریز دوستی کی دیمک لگی ہوئی ہے، وہی انگریز جو سامراج تھا یہاں۔ جس وقت اِس خطے میں بولی جانے والی اکثر زبانوں میں سامراج دشمنی اپنے عروج پر تھی، اردو بابے بھتیجے کچھ اور گنگنا رہے تھے۔ اُس میں گدِّ و اور رحم علی تو کیا پیدا ہوتے، وہ تو عملی طور پر Collaborators کی زبان بن چکی تھی۔ اردو کے آج کے بہت سارے پروفیسروں اور دانشوروں کا سب سے 'روشن فکر' ہیرو، سرسید یوں کہہ رہا تھا: ''......اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں، تمام مشرقی علوم کو نسیاً منسیاً کردیں، ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہوجائے............''۔ بتایئے یہ ہیرو اپنی مادری زبان سے ہی دستبردار ہو چلا، اُس سے خطے میں موجود دوسری زبانوں کے ساتھ جمہوری تعلقات استوار کروانا تو دور کی بات ہے!۔

اس بڑے امتحان میں ناکامی کے بعد اردو پہ ایک اور نظریاتی ذمہ داری ڈال دی گئی: دوقومی نظریہ۔ ضحاک کے ایک کندھے پر 'دوقومی نظریہ' نامی روز کا ایک انسانی مغز کھانے والا اژدھا تھا اور دوسرے پر 'نیل سے کاشغر' تک کی پاسبانی کرنے کا ایک اور مغز خور اژدھا۔ نتیجہ یہ کہ،

آبادیوں کی آبادیاں اس کے نظریاتی اژدھاؤں کے زندہ رکھنے کو تج دی گئیں مگر اژدھا ہیں کہ نہ مرتے ہیں نہ جان چھوڑتے ہیں۔ ناقابلِ تشریح 'نظریہ پاکستان' کے نظریے نے تو ابھی آنا تھا۔

پھر اس کے نیفے میں ایک بہت بڑا پسو 'قومی یک جہتی' کے نام کا بھی اڑس دیا گیا۔ یہ بے چاری زبان، یک جہتی کہتے کہتے اپنا حلیہ تک بگاڑ چکی، مگر یک جہتی ہے کہ بلوچستان کے 'امن وآزادی' کی طرح پکڑ میں ہی نہیں آتی۔ اور اِس یک جہتی کے اڑتے پرزے ہم روز 'موہن جودڑو بنتے پاکستان' میں دیکھ رہے ہیں۔

اردو لکھنے والوں کی اکثریت چوں کہ ہندوستان سے آئی تھی اس لیے وہ پیچھے اپنے وطن، صوبہ اور گاؤں کے دردِ فراق اور ناسٹلجیا سے باہر نہ نکل سکی۔ وہ رہتے تو یہاں تھے مگر سوچ وہاں اٹکی ہوئی تھی۔ وہاں، جہاں بدترین فیوڈل نظام جاری وساری تھا۔ وہاں کی اخلاقیات، لباس وپوشاک معتبر جانا گیا اور یہاں وطنی زمینی حقائق کو دوسرا درجہ دیا گیا۔ ایک معاندانہ فضا ایک زبان کے خلاف قائم ہوگئی جو کسی نہ کسی طور پر آج بھی جاری ہے۔

اردو پر ایک سنہرا زمانہ بھی آیا۔ اور وہ مختصر زمانہ صرف 1937 سے لے کر 1947 تک رہا۔ اس مختصر عرصے میں اردو میں بے شمار بلند قامت اور قابلِ احترام سامراج دشمن اور روشن فکر لکھاری ابھر کر سامنے آئے۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر، فیض، حبیب جالب............۔ انگریز سے آزادی کے لیے اس فکر وتحریک نے شاندار کام کیا۔ ان لوگوں نے تمام علاقوں، سارے مذہبی فرقوں کو اکٹھا کیا اور آزادی کی راہ پر ڈال دیا۔ مگر بین الاقوامی میکارتھی ازم نے اس فکر کا گلا بہت جلد گھونٹ دیا۔ چنانچہ یہاں، پاکستان میں فیوڈل طبقہ کی حکمرانی کے دوام کے لیے اس فکر وتحریک کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور وہاں، ہندوستان میں نہروگیری نے یہ فریضہ سنبھالا۔ اور اس نظریہ کو سلو پوائزننگ کر دیا۔

ہماری پوری ملکی تاریخ کا نوے فیصد وقت مارشل لائی فاشسٹ حکمرانی کا زمانہ رہا۔ اردو زبان یہاں کی دوسری تمام قومی زبانوں کے برعکس اس کے ہاتھوں زیادہ استعمال ہوئی۔ اور زیادہ تر مارشل لا آئے ہی اس لیے کہ اردو اور دیگر زبانوں میں زمینی حقائق بیان کرنے والوں کی تنظیمی،

انفرادی، علمی اور عملی فضا کو برباد کیا جائے۔ ایسا بڑا اور مہلک حملہ 1958 کے مارشل لا نے کیا۔ ضیا کا مارشل لا اس کا نقطہ عروج۔ سیدھا سیدھا مار دھاڑ۔ اس لیے جو بچا وہ ماضی اور قدامت کی تلچھٹ تھا۔ اسی وجہ سے اردو میں مستغیث، دام اقبالہ، فدوی، با ادب با ملاحظہ، حضور اور فیض گنجور، جیسے غلامانہ الفاظ گھسنے لازمی تھے۔

آپ اردو کو سرکاری زبان کہیں یا نہ کہیں، اسے قومی زبان کہیں نہ کہیں، اسے فرانکا کہیں نہ کہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ اقتدار کی زبان رہی ہے۔ اور یہاں تو ہمیشہ سے اقتدار، برتر لوگوں کا رہا ہے۔ ایسوں کا جو عام انسانوں سے بالاتر ہیں، جو 'بالائی کمیں گاہوں میں رہتے ہیں'۔ اس خطے کے عوام، اُن کی زبانوں اور کلچروں کے لیے تحقیر کے جذبات رکھنا اُن کا اولین و آخرین فریضہ و وطیرہ رہا۔ اس لیے حاکموں کی 'قومی' زبان کا مقتدر و پاک و خالص و ثقیل و مہذب و ممتاز و مکرم ہونا فطری بات ہوتی ہے۔ اردو ایک خاص طبقے کی زبان بن گئی۔

سیاسی اشرافیہ طبقے کا احساسِ کمتری، اُسے اردو میں فارسی، عربی اور انگریزی الفاظ ٹھونستے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ Mediocres، یہ نسل پرست لوگ بلوچی کے الفاظ سے تو اپنی صاف و زمزم واجلی زبان کو 'گندہ' کرنے نہیں دیتے مگر انگریزی کے لیے اپنی زبان ترچھی کرتے ہیں، اپنے ہونٹ، گول و مخروطی و بیضوی بناتے جاتے ہیں، چہرہ حتیٰ کہ کلاہ بھی ٹیڑھا کرنے کو اعزاز سمجھتے ہیں۔

شریف لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ زبان، انگلش کی سی ون تھرٹی سے گرائے گئے من و سلویٰ سے ترقی کرے گی۔ انہیں اندازہ ہی نہ رہا کہ یہ تو پڑوسیوں سے گھل مل جانے پہ زندہ رہتی ہے۔ ہم سب اپنی اولاد کی تربیت کے لیے اُسے تو گلی میں کھیلنے دیتے ہیں۔ مگر زبان کو تازگی اور آکسیجن سے محروم رکھتے ہیں۔ اردو کو عوام الناس نے تو اپنی چھابڑی تک پہنچا دیا، مگر انتہا پرست لسانیاتی شاؤنسٹ دانشوروں نے اُسے گلی میں آنے نہ دیا، اس کے جوتے گرد آلود ہونے نہ دیے، اس کا گریبان پھٹنے نہ دیا، اس کے چہرے پہ خراش نہ آنے دی۔ زبانیں اگر خالص ہونے لگیں تو تہذیبوں کی موت کو کسی کا شیکسپیئر بھی نہیں روک سکے گا۔

ہمارے خطے کی اس زبان کے ساتھ ایک اور مسئلہ یہ ہوا کہ یہ شہری مڈل کلاس لوگوں کی زبان رہی جو کہ تقریباً سارے کا سارا قدامتی اور رجعتی ہے۔ پاکستان کا مڈل کلاس شاہ پرست و ہیرو پرست ہے، یہاں وہاں جھنڈے گاڑتے رہنے کا رسیا ہے۔ جس زبان کو مہذبوں، مشائخوں، پنڈتوں کا اشلوک خانہ بنا دیا جائے، وہ بھلا کبھی عام انسانوں میں جڑیں پھیلائے گی؟۔ لہٰذا رجعتی مڈل کلاس کی فیوڈل اخلاقیات کے دیگر مظاہر کی طرح اُن کی اردو بھی اپنی آنکھ، کان، ناک اور زبان تک کی بے پردگی سے خوفزدہ ہے۔ پاکیزگی و دوشیزگی پہ اس قدر حساس کہ ہماری گلیوں بازاروں سے سفید چادر سے گھونگھٹ نکالے سر جھکائے تیز قدموں سے راستہ گزرتی ہے، گویا کارندے ''پردہ کرو، پردہ کرو' کہتے جاتے ہوں، ہمارے لوگوں پر ڈنڈے برساتے، کہاروں کا راستہ بناتے جاتے ہوں۔

اردو پر ایک اور غضب یہ ڈھایا گیا کہ یہ ساٹھ برس سے نسیم حجازی کی تلواروں، اس کے جہادی گھڑ سواروں کی ٹاپوں، نعروں، فتح و قبضہ والے 'ہوائی طبقات' کی زبان رہی۔ عقیدے کی تھرل (Thrill) سے لبالب بھرے لوگوں کی زبان۔ انہوں نے اس زبان کو مالیکیول، جینیٹکس، بلوچی تھیریم، فزیالوجی اور کوانٹم و کاسموس سے دور رکھا اور ''کما حقہ، جوڑ، اکرام، نصرت، کارگزاری، اور سہ روزہ جیسی اصطلاحات سے اس کو باندھ ڈالا۔

پھر ایک اور وجہ بھی رہی۔ پنجابیوں، بلوچوں، پشتونوں اور سندھیوں نے اس میں لکھا تو ہے مگر بہت کم نے اپنے' خیالات کے ابلاغ' کی غرض سے اردو کو ذریعہ اظہار بنایا۔ زیادہ تر لوگ اس کے ذریعے شہرت و اشاعت و ہدیہ و قیمت و ستارۂ شجاعت کے طلب گار تھے۔ ایسے موقع پرستوں، جی حضوریوں اور دنیا داروں نے بھی اردو کو موٹے موٹے الفاظ ہی دے مارے، اسے اندلس، شپیاں، غرناطہ، چیچنیا اور قسطنطنیہ، کی مہاجرتیں تو کروائیں مگر اُسے سبی و خضدار کی زیارت سے بے نصیب رکھا۔

ردِ عمل میں اردو کو پردہ کرانا تو ایک اور طرح کی غلطی ہے۔ اگر زبان پردہ کرنے لگے تو خیالات و نظریات کی پاک عریانیت کا اظہار کیسے ہو؟۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اردو چاہ بہار سے

تونسہ تک پھیلی بلوچی سے کیوں کر پردہ کر پائے گی۔اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ صرف درآمدی بن کر رہنا اگر دیوالیہ پن ہے تو محض برآمدی بننے سے بھی ذخائر نے بالآخر خالی ہو جانا ہوتا ہے۔آمد اور رفت دونوں کا توازنی بہاؤ ہی زندگی کا راز ہے۔

ہم اُن دوستوں کی اِس خواہش سے کسی صورت بھی متفق نہیں جس کے تحت وہ اردو کو بلوچی کی جھداں قدموں کی گرد میں دفن کرنا چاہتے ہیں۔یہ تو غیر جمہوری اپروچ ہوگی۔زبانوں کے بیچ جمہوری تعلقات کے علاوہ بھی بلوچ، اردو کے اس لیے بھی خیر خواہ ہیں کہ اس نے گورکی وگل خان، کرشن و کافکا، ناظم ونرودا، مارکس ومنٹو، اور، ساحرو ساگاں، اسی زبان میں پڑھے۔اِسی زبان نے انہیں فلسفہ وتاریخ ومعاشیات کے علوم سے آشنا کیا، اسی کے ذریعے وہ دائیں بائیں سمجھ سکے ہیں۔ماں باپ کے بعد استاد کا مقام آتا ہے ناں۔بلوچی کے بعد اردو ہی بلوچ کو عزیز ہے۔اردو خدانہ کرے کہ اپنی بلندی سے ایک انچ بھی نیچے آئے۔بس ہماری پرواز کو نہ روکے۔وہ ہماری زبانوں کو اپنی ہم جولی بنادے کہ ہم سب کی خوبصورتی اسی میں ہے۔محبوباؤں کی زبانیں، محبوبوں کی زبانوں سے برابری کا مقام ہی چاہتی ہیں۔

اردو ایک مضبوط وتوانا زبان ہے۔اسے کسی 'نفاذِ اردو تحریک' اور 'تفہیم اردو تحریک' کی ضرورت نہیں تھی۔نہ اسے 'مقتدرہ' کی محتاجی تھی۔یہ اپنے اڑوس پڑوس کی زبانوں کی بہترین سہیلی بن سکتی تھی۔یہ Link Language رہ پاتی ہے یا نہیں، ڈنڈے ڈرپ اور 'ڈیکا ڈران' اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔پاکستان کی ساری مادری زبانیں، قومی زبانیں ہیں۔سرداری، اگر سماج میں منظور نہیں تو زبانوں میں کیسے قبول ہوگی۔زور کی چھینی بڑائی، دماغوں دلوں میں رہنے کے اہل کبھی نہیں رہتی۔میری دعا ہے کہ اللہ مجھے میری اس تحریر کے پڑھنے والے ہر اُس شخص کی دوستی سے محروم کردے جو آج کے بعد، پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی کو 'علاقائی' یا 'مقامی' زبان کہے۔

مگر زبانوں کے آپسی لین دین کا مطلب زبانوں کا انضمام ہرگز نہیں ہے۔اردو بلوچی نہیں بن سکتی اور بلوچی کو اردو نہیں بننا چاہیے۔''ایک خدا، ایک رسول، ایک قرآن، ایک یونیفارم، اور ایک زبان' والے نعرے میں سے صرف پہلی تین باتیں ہی صحیح ہیں، باقی دو باتیں غلط

ہیں۔ہمارے آباواجداد نے یہی بات سمجھاتے سمجھاتے اپنی جوانیاں قلی کیمپوں، ساہیوال اور مچ جیلوں میں مرجھوائی تھیں۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ آج اردو، چٹان زبانوں کے بیچ ہے۔اردو ایسے لوگوں میں آ گئی جہاں لفظوں تک کا تلفظ الگ ہے۔یہاں ''نی''، کو ''نڑیں''، ث کو ''ث''، ذ کو ''ذ'' کہا جاتا ہے۔ ایسا علاقہ جہاں کی ساری آریائی زبانوں میں مذکر مؤنث موجود نہیں ہیں۔نہ بلوچی میں، نہ فارسی انگریزی میں۔لہٰذا ہم بلوچ 1947 سے ٹٹول ٹٹول کر، الٹ پلٹ کر یہ دیکھنے میں لگے ہوئے ہیں کہ پنسل میں مؤنث اور پین میں مذکر والی طبعی یا خصلتی جگہیں کہاں واقع ہیں۔

مجھے یقین واثق ہے کہ ''آؤ، آیئے اور آیئے گا'' والے سارے فیوڈل تکلفات آریائی زبانوں کی بنت میں ڈھل جائیں گے جن میں صرف 'تو' ہے، 'تم' اور 'آپ' وجود ہی نہیں رکھتے۔اسی طرح آپ بلوچ کو گولی ماروبھی وہ 'ق' کو ناف جتنی گہرائی سے نہیں نکال سکے گا۔وہ قفس پڑھے گا ہی نہیں۔اردو شاعری کو چھوڑ کر باقی حالتوں میں وہ بے وقوف بننے کو تیار ہوگا مگر عقل کو عَقُل نہیں پڑھے گا، نظم کو نظم نہیں کہے گا۔اپنے تَوکلی کو توکلّی ہرگز ہرگز نہیں کہے گا۔

یہ عجیب بات بھی دیکھیے کہ ہمارے پورے خطے کی زبانیں لفظ 'نیم' سے اپنا کام چلاتی آ رہی تھیں...... چہار ونیم، دہ ونیم، یازدہ ونیم۔اب اگر 'ساڑھے' مسلط کرہی دیا تو ہمارے 'ساڑھے ایک' اور 'ساڑھے دو' پر لوگ ہنستے کیوں ہیں......میں یقین سے کہتا ہوں کہ اردو پر 'غلط العام' اس مقدار اور اس سرعت سے برسے گا کہ اُس کی صورت ہی بدل جائے گی۔

اردو کو زمین پہ اترنے، نصاب نے بھی نہ دیا۔میں اُن زیادتیوں کو نہیں گنتا جو نصابی کتب نے ہماری نسلوں کے ساتھ کی ہیں۔بس اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ ہمارا تعلیمی نصاب کبھی تعلیمی نہ رہا، یہ ہمیشہ سے سیاسی تھا (اور ہے)۔رجعتی، فرقہ باز، جنگجو اور، منافرت کی سیاست کا نصاب۔ اور فرسودہ نصاب زبان میں سڑاند وفرسودگی تولاتا ہی ہے۔اُس کا عمومی ذوق اور Taste گرادیتا ہے۔جسے وہ بعد میں دوسرے ذہنوں اور زبانوں میں پھیلاتا ہے۔

جہاں تک ذرائع ابلاغ (میڈیا) کا تعلق ہے تو ذرائع ابلاغ پر بھی اُسی سیاسی ومعاشی

حاکم طبقے کا قبضہ رہا ہے۔ اور میڈیا کی اردو بھی گذشتہ ساٹھ سال تک عوام کے لیے مشکل ترین ہی رہی ہے۔ اب جا کر سرمایہ دار کو عقل آ گئی کہ اس نے اپنی پراڈکٹ اور کماڈٹیز دِلّی اور بدایوں میں نہیں لاہور اور لورالائی میں بیچنی ہیں۔ اپنے طبقے کے نظریات، اپنے طبقے کی خبر اور تفریح عوام الناس کے دلوں دماغوں میں انڈیلنے ہیں۔ اس لیے میڈیا، بالخصوص پرائیویٹ ٹی وی چینلز اردو کو عام فہم، اور عوامی بنانے کا زبردست باعث بن رہے ہیں۔ ٹاک شوز، ٹی وی ڈراموں، گانوں، مزاحیہ پروگراموں اور بالخصوص مزاحیہ شاعری میں اردو تیزی کے ساتھ زمین کی قدم بوسی کر رہی ہے...... زمین جہاں انسان بستے ہیں۔ یوں اب پنجابیوں اور پشتونوں کے گھسنے سے اردو کے مردہ نوابی کلچر کی باقیات کچھ کچھ ٹوٹ رہی ہیں۔

جہاں تک ریڈیو کی بات ہے تو ریڈیو پاکستان کو تو کوئی سنتا ہی نہیں۔ عام لوگ، بالخصوص نوجوان نسل ایف ایم ریڈیو بہت سنتی ہے۔ وہاں جو اردو استعمال ہوتی ہے، جو اشارے کنائے ہوتے ہیں، جو فرمائشیں ہوتی ہیں اور جو انڈین گانے بجتے ہیں، وہ عشق سے سرشار نوجوانوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ عشق کے ابلاغ کے لیے بے ساختگی، بلاواسطگی اور آساں لسانی بہت ضروری ہوگئی ہیں۔ عشق تو خود استعارہ ہے، ضرب المثال ہے، معلیٰ ہے، مرصع ہے، مسجع ہے۔ یہی ایف ایم، اردو کو ٹرانسفارم کرنے، اور ہماری زبانوں کے الفاظ و استعارے اُس میں شامل کرنے میں کردار ادا کر رہا ہے۔

اخبارات و رسائل میں تو معاملہ اور بھی دلچسپ ہے۔ اشتہارات سے لدے پھندے نام نہاد معیاری اخبار تو دو چار ہی ہیں۔ جبکہ اس ملک میں بے شمار اخبار اور رسائل چھپتے ہیں۔ ان میں 'غیر اردو' لوگ لکھتے ہیں۔ اسی طرح کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کا کام بھی مقامی لوگ کرتے ہیں۔ چنانچہ پڑھتے ہوئے کہیں آپ کو تذکیر و تانیث کا بھٹہ بیٹھا ملے گا، کہیں واحد جمع زخمی زخمی پڑے ملیں گے اور کہیں کہیں کوئی مقامی لفظ اردو لفظ کو آنکھ مارتا نظر آئے گا۔ ایسی خوبصورت گلابی اردو کہ جی خوش ہوتا ہے۔ ابلاغ سو فیصد۔

ایک اور حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ خود اردو نژاد لوگوں کی اپنی نئی نسل نے بہت کچھ سیکھا۔ وہاں

نسبتاً ایک علمی اپروچ، ایک سائنسی نقطہ نظر، بقائے باہم اور جمہوری رویہ سا پیدا ہونے لگا ہے۔

پھر، یہ بھی ہے کہ آمریت گئی، سچی یا جھوٹی، منصفانہ یا دھاندلیانہ سلطانیِ جمہور آ گئی۔ پالیسیاں، کرسیاں جلسہ عام میں لائی جا رہی ہیں۔ فیوڈلوں کا فیوڈل پیر پگاڑہ تک عوام میں آ کر جلسے کرنے لگا ہے۔ نعرے، تالیاں تقریریں انسانی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ یوں سیاسی عوامی زبان بھی انسانی آبادیوں میں نقل مکانی کر رہی ہے۔

ایک اور بڑا عنصر بھی اردو کو جمہوری زبان بنا دے گا۔ وہ ہے میرا آپ کا قاری۔ قاری جو بلوچستان میں ہے، سندھ میں ہے، جنوبی پنجاب میں ہے۔ اور وہ بیس سال کا نوجوان ہے۔ بارہ تیرہ جماعتیں پڑھا ہوا۔ یقین کریں اگر لکھاری اُسے پڑھنے کو 'دامے درمے قدمے سخنے ....' دے گا تو وہ جواباً اسے 'دامے، درمے، قدمے سخنے.........' جتنی موٹی گالی دے کر کتاب پھینک دے گا۔

ہماری دیگر پاکستانی زبانیں بھی گذشتہ دو دہائیوں سے اردو کی ہٹ دھرمی کو مارکیٹ میں خراشیں لگاتی جا رہی ہیں۔ کلاس روم میں اردو کو ہماری زبانیں دل کھول کھول کر اپنے خون کا عطیہ دے رہی ہیں۔ اسمبلی میں اس کا 'اپنا' 'انپڑا' بنتا جا رہا ہے، اس کی تعلیم 'تلیم' بن رہی ہے، اس کا مذکر، مؤنث نہیں تو کم از کم شی میل ضرور بن رہا ہے........ مریض تیزی سے شفایاب ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ پڑوسی پاکستانی زبانیں اُس کی مہلک خالص گیری میں بے شمار حیات بخش دراڑیں ڈالتی جا رہی ہیں۔

زبانیں فرمائشوں پہ عام فہم اور جمہوری نہیں بنتیں۔ نہ ہی یہ آرڈیننسوں کے ذریعے نافذ ہوتی ہیں۔ پاکستان میں شریعت کا نفاذ اور اردو کا نفاذ ہمیشہ سماجی معروض سے الگ کر کے دیکھے گئے ہیں۔ عملی سماجی قبولیت جیسے بنیادی عنصر کو الگ رکھ کر کبھی کوئی اقدام نہیں ہوسکتا۔ زبان کی عام قبولیت اور زود تفہیمی بھی سماجی پراسیس کے دوران دیکھی پرکھی جاسکتی ہے۔ آج کے سرمایہ داری نظام میں ملٹی نیشنل کمپنیاں گردنیں دبوچ دبوچ کر سماجوں کو اپنے قالب میں ڈھالتی جاتی ہیں۔ انھی کی برکت سے، ہم تو پہلے ہی ناخالصی کے صحت مند پراسیس میں گردن گردن ڈوبتے جا رہے ہیں۔

جب کمپیوٹر نے کاتب کا پیشہ ختم کر دیا تھا تو اس نے ہم سب زبانوں کے غیر ضروری اعضا بھی کاٹ ڈالے تھے۔ ہم سب کی شاخ تراشی کر دی تھی۔ حروفِ تہجی تک نئے سرے سے مرتب ہو گئے۔ پھر جب موبائل SMS، فیس بک، ٹوئیٹر آئے، تو ہماری زبانوں پر گویا دس ریکٹر سکیل کا زلزلہ آ گیا۔ کسی لفظ کی چونچ گم ہے، کسی کا دھڑ۔ ابجد و علامتوں کا ایسا آمیزہ کہ اب تک کے بنائے گئے قواعد و ضوابط، گرائمر، آداب اور حجاب سب کچھ کا ستیاناس ہو گیا۔ سپرانتو سمجھو بن بھی گئی، رائج بھی ہو گئی۔ کارپوریٹ دنیا ابھی بہت کچھ کرے گی۔ ٹکنالوجی بہت کرتب دکھائے گی۔ کسی کی پگڑی اچھلے گی، کسی کا گردہ چوری ہو گا اور کسی کی مونچھ کو بالچر لگ جائے گا۔ سب سے 'فٹ' ہی بقا پائے گا۔ .... اور سب سے فٹ وہ ہو گا جو سائنس و ٹکنالوجی کو روح میں جذب کر کے علاقائی اتحاد و تعاون کو زیادہ سے زیادہ اپنی جھولی میں بھر دے گا۔

اور پھر انسانوں کے اس بڑے گروہ کا ذکر کیسے نہ ہو جو مراعات کو ٹھوکر مارتے ہوئے جیلوں، عقوبت خانوں میں خون تھوکتا ہے مگر عوام الناس کی آزادی آبادی کے نغمے لکھنے سے باز نہیں آتا۔ انہی انقلابی سیاسی ورکروں دانشوروں نے اردو کے بشمول ہماری مادری قومی زبانوں کے نثر و نظم کا کینوس ولایتوں تک وسیع کر ڈالا۔ اُن کی تحریریں کسانوں کے ترانے بنیں، زندہ رہنے کا سبب اور زندگی کا ڈھب بنیں۔ بمبئی کے سینما سے لے کر ریڈیو کے نغمات تک اردو کو ارضِ خدا کے بندوں تک پہنچانے میں سامراج دشمنوں اور کمیونسٹوں کے کردار کو کون گھٹا سکے گا۔ ہم آج بھی اردو کے فیوڈل سانچے کو توڑنے میں پوری توانائیاں لگائے ہوئے ہیں۔ ہم آج بھی اسے عوامی استعارات، تشبیہات و ضرب الامثال سے مالا مال کر رہے ہیں۔ ہم اردو کے ذخیرہ الفاظ کو ایک نہ ختم ہونے والا بنک عطا کرتے جا رہے ہیں۔

لہٰذا نیا دور جو بھی اچھی چیزیں لائے گا، ان میں ایک طرح سے زبان کے شاؤنزم کی شکست کا اعلان شامل ہو گا۔ اُن سب لوگوں کی شکست جنہوں نے برتری و نورانیت و روحانیت و خالصیت کے شیش محل بنانے چاہے تھے۔ اور اُسی شیش محل سے بلوچستان کے کوہِ شاشان کو توڑنے کی خواہش کی تھی۔ یقین کیا جائے کہ بلوچی کا مرگ اُردو کی حیات نہیں بن سکتا، میری حیات ہی اسے

زندہ رکھے گی، اُسے عام فہم بنا دے گی۔ ہم شاؤنزم کی اس شکست کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہم اس کی مزید شکستیں دیکھیں گے۔

زبانوں کے بیچ جمہوری رشتے زندہ باد ہوں۔

بلوچی، پنجابی:

پواد کوہ کی چوٹیوں سے لے کر لاہور کے علاقے مزنگ تک تین کروڑ سے زائد بلوچ مادری زبان کے بطور پنجابی استعمال کرتے ہیں۔ بلوچی زبان پنجابی سے اچھا خاصا لین دین رکھتی تھی۔ بالخصوص پاکستان بننے سے قبل، تو یہ لین دین برابری والی تھی۔ بڑے ہی دوستانہ اور فائدہ مند انداز میں۔ بعد میں تو خیر اعلانیہ یا غیر اعلانیہ ون یونٹ بنا کر پنجاب نے ہر طرح کی بالادستی لے لی۔ زبان میں بھی۔ چپڑاسی سے کمشنر تک سب وہاں سے آئے۔ اب یہ زبان چونکہ تاجر و کاشتکار و مویشی بان والی نہ تھی، حاکم وافسر و حضورِ والا کی تھی...... اس لیے اب اُن کی زبان میں دوستی اور دوستی کے الفاظ و اصطلاحات نہ تھیں، بلکہ حاکمیت کی مرداریت کے لہجے اور الفاظ تھے۔ فوج کشیاں الگ۔ اب پھر میڈیا کے ذریعے، بالخصوص چینلوں پر مزاحیہ پروگراموں کے ذریعے اُس زبان کا اثر ایک نئے انداز میں آ رہا ہے۔ کاش وہ اپنے دانا، اور انقلابی کلاسیک کو فروغ دیتے تو ہم سب کا بھلا ہوتا۔

سب سے زیادہ آبادی پنجابی بولنے والوں کی ہے، اس لیے پنجابیوں نے بڑا کردار ادا کرنا تھا، لسانی جمہوریت میں۔ مگر اسے تو یقین دلایا گیا کہ اُن کی زبان اجڈ اور جاہل لوگوں کی زبان ہے۔ لہٰذا وہ سب مہذب بننے کے لیے گھر میں بچوں کے ساتھ اردو بولتے ہیں۔ پھر اُن کا اصل رسم الخط گرمکھی اُن سے چھنا گیا۔ کافروں والا رسم الخط جو ٹھہرا۔

فیس بک پہ ایک پنجابی بزرگ دانشور کا یہ فقرہ پنجابی زبان بولنے والوں کی خوب عکاسی کرتا ہے:

Hay, speak Urdu, the mother tongue of the Punjabi middle classes!

ایک کہانی مجھے افضل توصیف نے سنائی۔ وہ اکبر بگٹی سے ملنے گئی تو اپنی ساری تصانیف ساتھ لے گئی۔ اکبر خان نے اُس کی اردو کتابیں اُسے واپس کر دیں اور پنجابی کتاب اپنے پڑھنے کے لیے رکھ لی۔ حیرت زدہ افضل توصیف نے پوچھا: ''آپ پنجابی پڑھتے ہیں؟'' تو اکبر خان نے یہ خوبصورت جواب دیا: ''ہاں، اس لیے کہ میں پنجابی نہیں ہوں''۔

لہٰذا پاکستان میں بولی جانے والی ساری قومی زبانوں میں پنجابی وہ واحد زبان ہے جسے اپنے دانشوروں، بیوروکریٹوں، پالیسی سازاداروں کی طرف سے بدترین سردمہری کا سامنا ہے۔

بلوچی، پشتو:

پشتو کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ پاکستان میں تو وہ بھی سمجھو بلوچی ہے مگر پڑوسی افغانستان میں اُسے فارسی کے ساتھ اُنیس، بیس کی برابری حاصل ہے۔ (بلوچی کو افغانستان میں بھی ترہ کی صاحب کے انقلاب کے مختصر عرصے کے بعد کوئی برابری وغیرہ کا درجہ حاصل نہیں ہے)۔ پشتو اور بلوچی زبانوں کے تعلقات اس قدر دوستانہ رہے کہ دونوں زبانوں میں ایک دوسرے کے الفاظ استعارے اور ضرب الامثال بغیر کسی زور و جبر کے شامل ہوتے رہے۔ فوری پڑوسی گیری میں کلچر اور زبان تو خوب سرنگیں لگا لگا کر ایک دوسرے کو امیر کرتے جاتے ہیں۔

بلوچ تاریخ میں پڑوسی اقوام، اور خود اپنے اندر قبائل کے بیچ جنگ وصلح کا ابدی سلسلہ نظر آتا ہے۔ مگر یہ سب ایک کوڈ کے ذریعے، ایک رواج کے تحت ہوتا ہے۔ زبان اور کلچر پینترے بدل بدل کر اپنی لین دین دین جاری رکھے ہوتے ہیں۔

بلوچی، فارسی:

فارسی تو صرف ایرانی بلوچوں کے لیے حاکم زبان نہیں ہے بلکہ یہ خوانینِ قلات کے ابتدا سے لے کر ابھی 1948 تک پاکستانی بلوچستان میں خان قلات کی سرکاری اور ریاستی زبان ہوا کرتی تھی۔ مسجدوں میں فارسی کے ساتھ عربی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ جدیدیت کے دور میں یہ لین دین مزید بڑھ چکی ہے۔ بالخصوص افغانستان و ایران کی بلوچی میں۔ اس لیے کہ ریاستی زبان وہاں

فارسی ہے اور تعلیم، میڈیا، اور سفر نے اس زبان کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔

کارینا جہانی کی کھوج کے مطابق بلوچی کا فارسی زبان سے رابطہ دو ہزار سال سے بھی پرانا ہے۔(5)

ایران میں تو سرکاری طور پر دوسری زبانوں کو دبایا جاتا ہے اور ریاست اس بات پہ سو فیصد یقین رکھتی ہے کہ فارسی کے علاوہ ہر زبان خطرے کا باعث ہے (ریاست کے لیے)۔ ایسی نفرت کہ صدیوں تک سعدیؔ و رومیؔ و حافظؔ پڑھتے رہنے کے باوجود اور خوانینِ قلات کی سرکاری زبان بنے رہنے کے باوجود آدھا بلوچستان اپنی زبان کے گلے پر اس زبان کی کرخت گرفت کو محسوس کرتا ہے۔ فارسی کو ساواک کی طرح شک اور سسپنس سے دیکھا جاتا ہے۔ دو بہن زبانوں کے بیچ ایران کی سرکاری (شاہ و ملا دونوں) سسرال نے ثریا تک جاتی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ حالانکہ دونوں زبانوں کا منبع و سرچشمہ ایک لفظ و بُنت ایک، گرامر و گنتی ایک، شیرینی و اثر آفرینی ایک۔ طبقاتی ریاست قوموں کی برادری و دوستی کی سب سے سفاک دشمن ہوتی ہے۔

بلوچی، سندھی:

سنسکرت آریاؤں کی زبان بھی تھی اور برصغیر کی لسانی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے۔ اس خطہ زمین پر بولی جانے والی زبانوں میں سے اکثر اس کی شاخیں ہیں۔

سندھی بلوچی کی طرح کوئی باہر سے آنے والی یا کسی دوسری زبان سے جنم لینے والی نہیں بلکہ وادی سندھ میں پروان چڑھنے والی زبان کے انڈک گروپ کا ایک سرکردہ رکن ہے جو زندہ زبان کا ثبوت دیتے، اپنے بولنے والوں کے ہمراہ زمانے کے نشیب و فراز سے ہمکنار ہوتے، ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرتے اور اپنے آپ کو جدت میں ڈھالتے ہوئے دورِ حاضر کو پہنچی ہے۔(6)

سندھیوں نے ستر کی دہائی کے اوائل سے اپنی حیثیت سندھ کی حد تک منوالی ہے۔ تعلیم اور سرکاری دفاتر میں سندھی کو اردو کے برابر کی حیثیت حاصل ہے۔ وہاں سندھی زبان کی پہلی کیشنز

بھی کافی ہوتی ہیں۔مگر ایک حاوی میڈیا، ایم کیوایم اور جماعتِ اسلامی نے مل کر انہیں بھی اجرک دن،اورٹوپی دن منانے کی حدتک نیچے پھینک دیا۔ بلوچی اور سندھی ساخت اور کچھ الفاظ وجملوں کے ماسوا، اب تقریباًایک ہی زبان ہو چکی ہیں۔ کتنے الفاظ ہیں بلوچی کے جوشاہ نے اپنی شاعری کی زینت بنائے۔کتنی باتیں سندھی کی ہیں جو مستیں توکلی کی شاعری کو حسین وجمیل بناتی ہیں۔ آبادیاں اس طرح رل مل گئی ہیں کہ بلوچ روانی سے سندھی بولتے ہیں اور سندھی بلوچی۔

بلوچ کی قومی زبانوں میں سندھی بھی شامل ہے، بڑی اکثریت کی مادری زبان کی حیثیت سے۔

بلوچی، براھوئی:

بلوچ قوم کی دوسری بڑی قومی زبان براھوئی ہے۔رخشانی بلوچی بولنے والوں کاایک بہت بڑا حصہ دولسانی آبادی پر مشتمل ہے۔وہاں بلوچی اور براھوئی دونوں مادری زبانیں ہیں۔اسی طرح سندھ اور پٹ فیڈر میں بے شمار قبیلے یہی دونوں زبانیں مادری زبانوں کے بطور برتتے ہیں۔

محققین نے بہت زور ماری کہ براھوی کو دراوڑی میں شمار کرلیں۔مگر خ غ ژ جیسے حروف کی موجودگی اور مذکر مؤنث کی غیر موجودگی اسے دراوڑیت میں ڈالنے نہیں دیتے۔اوراپنی بہن زبان بلوچی کے ساتھ ہی پیوستہ رکھتے ہیں۔بلوچی براھوئی زبانوں کے درمیان بے شمار اشتراک موجود ہے ۔الفاظ،ضرب الامثال،شاعری کی ذیلی اصناف میں بلا کی لین دین موجود ہے۔قومی سیاست نے بلو چوں کی ان دونوں زبانوں کو گوندلا گا کر قریب قریب ایک کر دیا ہے۔

ہماری اس مادری زبان کی ترقی کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے۔براھوئی زبان کو بلوچی میں ضم کرنے کی ہر خواہش وکوشش کا مقابلہ کرنا ہوگا۔اسی طرح براھوئی زبان کو لے کر ہر طرح کے لسانی شاؤنزم کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔زبانوں کو اُن کی اپنی مرضی اور مزاج کے مطابق ترقی ملنی چاہیے۔

بلوچی، سرائیکی:

ہم جس زبان کو جغدالی کہتے ہیں (یدگالی، یغدال)۔وہی تو سرائیکی ہے۔کہیں میں نے

پڑھا ہے کہ ’’جغدال‘‘ بلوچی میں کسان کو کہتے ہیں۔(7) مگر شاید مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔پورا ڈیرہ غازی خان، اسماعیل خان، راجن پور اور بھاگ ناڑی وجعفر آباد کا اکثریتی بلوچ بطور مادری زبان سرائیکی بولتا ہے۔ ہماری مشرقی سلیمانی بلوچی پر سرائیکی کے زبردست اثرات موجود ہیں۔ میں حیران رہ جاتا ہوں بے شمار الفاظ اور کئی محاورے دونوں زبانوں (اور کبھی کبھی سندھی میں بھی) مشترک طور پر مستعمل ہیں:

اُبھا، اڈا، آلس، آنو، بھولو، بیڑی، پارت، پاڑ، پاہو، جت، جھاتی، جھیڑہ، چٹی، دلّو، دروہ، دگ، سانگ، سندھو، سنج، کوڑ کی گُلر، گلّہ، لٹھ، لج، بہا، بےوس، پوریا، پُرآف، پھُری، ٹیٹر، چونچ، دانہہ، گیس، مڈی............(8)

بلوچی زبان نے سرائیکی کی مٹھاس میں زبردست اضافے کیے ہیں۔

حوالہ جات

1- ایکسی نوف۔ ایس۔The Balochi Language of-2006 Turkmenistan۔ ایسالا صفحہ 19

2- منصور، فیروزالین۔ پاکستان میں قومی زبانوں کا مسئلہ، سچیت کتاب گھر لاہور صفحہ 18

3- منصور..........صفحہ 25

4- منصور..........صفحہ 37

5- جہانی، کارینا۔2008، کتاب Baloch and Others میں، Rechart پبلیکیشنز، صفحہ 144

6- سندھی، حیدر۔’’سندھی زبان وادب کی تاریخ‘‘، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، 2005، صفحہ 39

7- عبدالحق، مہر۔ ملتانی زبان اور اُس کا اردو سے تعلق، 1967، اردو اکادمی بہاولپور، صفحہ 282

8- ہتورام، بلوچی نامہ، 1896، لاہور صفحہ 122

بلوچی زبان کے لہجے

بلوچ اتحاد کے نیک اور صاف دل حامیوں اور زبان کوسٹینڈ رڈائز کرنے کرنے کے لیے بے چین لوگوں سے ایک بات کہنی بہت ضروری ہے :فطرت ون یونٹ کے سخت خلاف ہے۔جس زبان میں مختلف لہجے نہ ہوں، یا اُس میں لہجے کم تعداد میں ہوں تو جان جایئے کہ وہ زبان نہ تو عظیم کہلائے گی اور نہ ہی دیر تک زندہ رہ سکے گی۔ہم اور ہماری زبان اس لیے زندہ رہیں گے کہ بلوچ (بلوچی زبان بولنے والے، اور نہ بولنے والے دونوں) دنیا کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔اور بے شمار'بلوچیاں' بولتے ہیں۔اس حد تک کہ کبھی کبھی تو انتہائی مشرقی بلوچ ،انتہائی مغربی بلوچ کی بلوچی سمجھتا ہی نہیں۔

ایک بہت ہی بڑے رقبے پر، باہمی میل جول اور رسل ورسائل کی کمیابی میں بلوچی زبان فطری تندرستی کے بطور ایک سے زیادہ لہجوں پر مشتمل ہے۔علاقوں (میدانی، پہاڑی،سمندری اورصحرائی) میں فرق اور وہاں کے موسموں میں تغیر، انسانی رنگ روپ اور خدوخال کی طرح زبان میں بھی تبدیلیاں لاتے ہیں۔سمندری علاقوں کی بلوچی ظاہر ہے محاوروں، اصطلاحوں ،ضرب الامثال،اور لہجے میں زرعی نصیر آباد والی بلوچی سے بہت مختلف ہوگی۔اسی طرح افغانستان وایران کی بلوچی ڈیرہ غازی خان کی بلوچی سے یکسر مختلف ہوگی۔بات صرف فاصلوں ہی کی نہیں ہے،

فاصلوں کو چھلانگ پھلانگنے والے ذرائع آمدورفت کی بھی ہے۔مشترکہ مارکیٹ کی عدم موجودگی بھی ہے۔باہمی تجارت کی غیر حاضری بھی ہے۔اور بلوچی کو ریاستی تعلیمی زبان نہ بنانے کی بھی ہے۔

بلوچی زبان تو کیا،اس کا کوئی لہجہ بھی ابھی تک سٹینڈرڈائز نہیں ہوا ہے۔وجہ یہ ہے کہ بلوچی ذریعہِ تعلیم نہیں ہے۔ترکمنستان میں سوویت یونین کے عہد کو چھوڑ کر، افغانستان میں ثور انقلاب کے عہد کو چھوڑ کر، پاکستانی بلوچستان میں بیسویں صدی کے آواخر کے دو تین سال کو چھوڑ کر،اوراسی طرح سکنڈے نیویائی ملکوں کو چھوڑ کر باقی تمام عرصے میں بلوچی زبان بولنے والوں کو سکول میں کسی دوسری زبان میں لکھنا پڑھنا پڑا۔

چونکہ تعلیمی اور سرکاری زبان بلوچی نہ رہی،اس 'دوزبان' نے بلوچی کی تیز رفتار ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ڈالے رکھی۔نہ صرف بلوچی زبان کی ترقی میں، بلکہ عمومی طور پر بلوچ دوسری زبان میں تعلیم پانے کی وجہ سے اپنے ہم جماعت دوسرے تمام لوگوں سے پیچھے رہ گیا۔غربت کی وجہ سے بھی تعلیم ممکن نہیں ہوتی۔یا کم از کم اسے جاری رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔مال چرائی یا کاشتکاری میں خاندان کا ہاتھ بٹانا زیادہ منافع بخش ہوتا ہے،بہ نسبت فیسیں بھر کر بلا معاوضہ تعلیم حاصل کرنے کے۔

بچیوں کا تعلیم حاصل کرنا تو شاید ہماری سماجی ضرورت ہی نہیں رہی۔بلکہ یہ شاید بہت سے بلوچوں میں عورت کے سماجی مقام میں کمی کا باعث بھی ہوتی ہے۔

صرف اُن ناموں کو دیکھیے جو ہمارے بادیہ نشین اور کوہ گرد شاعر اپنے اشعار میں لائے ہیں تو ہماری مفروضاتی لغت کی ضخامت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔بلوچی میں صرف پہاڑوں سے متعلق بیسیوں نام ملتے ہیں۔پہاڑوں کی قسمیں چٹانوں کی ساخت،چٹانوں کی قسمیں،گھاٹیاں اور ان کی قسمیں، پتھروں کے مختلف نام غرضیکہ پہاڑ سے متعلق کوئی ایسی چیز نہیں جو ذرا بھی مختلف ساخت کی ہو اور اس کا کوئی مخصوص نام نہ ہو: مات کوہ، مابند،کوہ،جُمپ ،پب ،شوریا،شیر، تلانگ ، تلار،چُٹوخ ،اَشی ،درنگ ،گر،گٹ ، بن،سر،نہ،لک،رُنگ............(1)۔

ہاں کئی ایسے سخت جان الفاظ ہیں جو بلوچی کے سارے لہجوں میں زندہ رہے ہیں، بغیر

اپنی شکل بدلے۔ان الفاظ میں بنیادی اعضا کے نام (چم، گوش، پونز)، بنیادی قریبی ترین رشتوں پٹ، ماٹ، بچ، براث کے نام اور آس آف جیسے قدرتی مظاہر شامل ہیں۔ثابت قدم الفاظ۔

بلوچی زبان تین بڑے لہجوں میں تقسیم ہوتی ہے۔

1. مشرقی لھجه

یہ لہجہ مشرقی بلوچستان یعنی ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان، راجن پور، ملتان، مری بگٹی، سبی، نصیر آباد، جیکب آباد، لاڑکانہ، شکار پور، سانگڑھ اور نواب شاہ میں بولا جاتا ہے۔

مشرقی بلوچی کی ایرانی زبان کی پڑوسی انڈو ایرین زبانوں بالخصوص سندھی اور سرائیکی کے ساتھ زبردست لین دین موجود ہے۔سندھی اور بلوچی میں آنو (انڈہ)، بانگ (اذان)، بھت (چاول)، وچھیر (گائے کا ایک سال کا بچھڑا)، ہُش (اونٹ کو بیٹھ جانے کا حکم)، زال (بیوی) وغیرہ(2) جیسے الفاظ باہم مشترک ہیں۔اسی طرح لیڑو (اونٹ)، پُرّاف، رمغ، گورم، گٹ، اولاک، مم، تغرد، ڈاہ، زہم، لغور، نشار، جمرّ، تہار......ہم مل کر استعمال کرتے ہیں۔اب اس بحث میں پڑنے کا کوئی سیاسی فائدہ نہیں کہ یہ الفاظ اصل میں کس کے ہیں۔کوئی انہیں بلوچی یا سندھی سے نکال کر تو دیکھے، دونوں زبانیں مل کر اُس کے ہاتھوں کا منہ توڑ دیں گی۔

مشرقی بلوچی میں زرعی آلات و اصطلاحات سب کی سب سرائیکی زبان سے اشتراک رکھتی ہیں۔اس لیے کہ حالیہ زمانوں میں سرائیکی علاقوں کے ساتھ بلوچوں کا لین دین بہت رہا۔

صرف سرحدی علاقوں سے پشتو کے بے شمار الفاظ و ضرب الامثال مشرقی بلوچی کا حصہ نہیں بن چکے ہیں، بلکہ ان دونوں زبانوں کی اپنی مشترکہ جڑیں بھی کئی الفاظ کا بٹوارہ کرنے میں مزاحم ہوئیں۔گاوانڈی، توپک، بُز، پونز، برنج، بروت، کھر، مرگی، دیغر، نماشام، گوزم، مرکہ، میش، سفک، ماہی، مار، شف، ڈکال، بانگ، پیشین، اوڈھر، لتاڑ، مستغ، تہار، نیم، جاناور، ریخ، مستر، ڈول، بالشت، کار، زِڑد، بھیڈی، پٹاٹہ، پوہ، دروغ، کندغ.........الغرض بے شمار بلوچی کے الفاظ ہیں جنہیں چاہو تو اسی طرح استعمال کرو یا ذرا سی انجینئرنگ کر دو، پشتو بن جاتے ہیں۔بھئی زبانوں کا

وصل تو بہت انڈر گراؤنڈ ہوتا ہے اور یاری صدیوں پر مشتمل۔زبانوں کے باہمی عشق میں رقیب نہیں بننا چاہیے، اس لیے کہ ناکامی مقدر ہوتی ہے............اور زبان سزا بھی دیتی ہے۔

بلوچی کا یہ لہجہ کلمات کو مختصر بنانے میں کافی ماہر ہے۔اسی لیے اس میں مغربی بلوچی کا 'اَنت'، 'اِنت' مختصر ہو کر آں، ایں بن جاتے ہیں۔

ہماری پوری کلاسیکل شاعری اسی لہجے میں ہے۔ پھر بالاچ سے لے کر رحم علی تک اور مست توکلی سے لے کر جواں سال تک سارا ادبی ورثہ مشرقی بلوچی میں ہے۔

2.رخشانی لھجه :

رخشانی لہجہ قلات، نوشکی، خاران، افغانستان، ایرانی بلوچستان اور ترکمانستان میں بولا جاتا ہے۔یہ بلوچی بہت میٹھی بلوچی ہے۔نرم، رواں اور سنٹرل ایشیا کے "آئیے گا، جائیے گا" جیسے تکلفات سے بھری ہوئی۔ ایران اور افغانستان کی فارسی کے اثرات رخشانی بلوچی پہ بہت ہیں۔رخشانی بلوچی، گذشتہ پچاس برس سے بلوچی کا تقریباً سب سے ترقی یافتہ لہجہ چلا آ رہا ہے۔ میر عاقل خان مینگل، گل خان نصیر، عبدالرحمٰن پہوال، آزاد جمالدینی، عبداللہ جان جمالدینی، منیر احمد بادینی، گوہر ملک اور خان محمد ساجی نے اتنا کچھ لکھا کہ حالیہ پوری نصف صدی میں رخشانی لہجہ تقریباً تقریباً دوسرے لہجوں پہ چھایا رہا۔ ریڈیو ایران، ریڈیو کابل، کابل ٹیلیویژن، رسائل، اخبارات، تدریس اور سوشلزم اسی لہجے میں بولتے رہے ہیں۔

ترکمانستان کے بلوچوں نے روسی یا ترکمن زبانوں کو بلوچی کے بڑے برتن میں لا کر ملایا۔لفظ ٹاراکسٹر (ٹریکٹر)، کارُسکا (روسی میں کروزکا) یعنی مگ(3) وہاں کی بلوچی میں بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں۔

3 .مغربی لھجه :

پاکستان میں مکران ڈویژن اور کراچی، خلیجی ممالک اور ایرانی بلوچستان میں یہ لہجہ بولا جاتا ہے۔اس لہجے پر جدید فارسی کے زبردست اثرات موجود ہیں۔یہ فقرہ میں نے تکلفاً استعمال کیا ہے۔دو

جڑواں بہنوں کی یکساں شکل و شباہت بھلا کوئی انکشاف کی بات ہے؟۔ میرے اس فقرے میں صرف لفظ 'جدید' اہم ہے۔ اس لیے کہ ایرانی بلوچی میں بالخصوص اور پاکستانی مکران کی بلوچی میں بالعموم جدید فارسی کی اصطلاحات بہت ملتی ہیں......اور یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ جو زبان دوسری زبانوں سے لین دین نہیں کرتی، وہ جواں مرگ ہو جاتی ہے.......... اور بلوچی زبان ہرگز ہرگز جواں مرگ نہیں رہی۔ بہت ہی برے حالات میں اس نے خود کو زندہ رکھا ہے۔

کچھ ساحلی علاقوں کا لہجہ مکرانی ہوتے ہوئے بھی مشرقی بلوچی لگتا ہے۔

مغربی لہجے میں مشرقی بلوچی کے اندر بہت استعمال والے 'غ'، 'ف'، 'ث'، 'ذ'، 'ژ'، جیسے حروف اپنی نزدیکی لسانی آوازوں میں بدل جاتے ہیں: گ، پ اور ت، س میں۔

******

یہ سب لہجے بلوچی زبان کی آنکھیں ہیں۔ ہر لہجے میں کمال ادب تخلیق ہوا ہے......اور بہت متین ادب تخلیق ہوا۔ لہجوں کے بارے میں فیوڈل تفاخر و تعصب غیر انسانی ہے۔ زبان کرامت رکھتی ہے۔ جس نے زبان کی (یا اُس کے کسی لہجے کی) توہین کی، زبان اُسے ضرور مار کھلائے گی۔

حوالہ جات

1- نصیر گل خان بلوچی عشقیہ شاعری۔ 1997۔ بلوچی اکیڈمی صفحہ 10

2- سندھی، حیدر- 1990۔ سندھی زبان و ادب کی تاریخ۔ مقتدرہ قومی زبان۔ صفحہ 77۔

3- ایکسی نوف۔ The Balochi Language of 2006. Turkmenistan۔ اپسالا۔ صفحہ 51

بلوچی رسم الخط کی تاریخ

بلوچی ابھی ماضی قریب تک ایک غیر تحریری زبان تھی۔ نہ صرف جدید بول چال میں غیر تحریری، بلکہ اس کا کلاسیکل اور فوک ادب بھی تحریری روپ اختیار کرنے سے ہزاروں سال قبل سے تخلیق کیا جاتا رہا ہے۔ ہمارا ساربان بغیر کاپی کتاب دیکھے اپنے لدے ہوئے اونٹ پر سفر کے دوران 'لیکو' اور 'ڈیہی' گاتا رہا ہے۔ ہمارا چرواہا بغیر الف بے سیکھے اپنے محبوبہ کی جدائی میں گُوکتا رہا ہے۔ ہمارے کسان نے اپنے کھیت پہ ہل چلاتے وقت گنگنانا، تختی نویسی سے صدیوں قبل شروع کیا تھا۔ ہماری مائیں مشقت بھرے دن کے ڈھلتے ہی اپنے بچوں کو ساتھ لٹا کر، کہانیاں سنا سنا کر انھیں نیند کی وادیوں میں جھُلا دیتی تھیں، ابجد کی ایجاد سے قرنوں قبل۔ مگر اس کے باوجود بلوچوں نے اپنی زبان کو برقرار اور محفوظ رکھا ہے۔

بلوچی زبان کا سب سے بڑا مسئلہ رسم الخط نہیں، بلکہ بلوچی میں نہ لکھنا ہے۔ جب لکھا ہی نہیں جائے گا تو رسم الخط والی بات تو بے معنی رہ جاتی ہے۔

لیکن جو لوگ اس میں لکھ رہے ہیں، وہ لکھ رہے ہیں۔ رسم الخط کبھی رکاوٹ نہ بنا۔ مصنف کی بات قاری تک بہر حال پہنچ ہی رہی ہے۔ ہاں، یہ بات درست ہے کہ ہمارا رسم الخط اب تک یکساں نہیں رہا ہے۔ یہ تو ہمیں بالکل معلوم نہیں کہ نو ہزار قبل مسیح کے مہر گڑھ کا بلوچستانی کیا بولتا

تھا۔اور آیا وہ لکھتا بھی تھا۔یا پھر اپنی یادداشت پر ہی بھروسہ کرتا تھا؟۔خواہ وہ قصہ،شعر یا تاریخی واقعات تھے............

ہمیں اندازہ ہے کہ جب اولین بلوچ نے لکھنے کا رواج ڈالنا چاہا ہوگا تو اس کی کس قدر مخالفت کی گئی ہوگی۔اُسے تو اعتقادات کی خلاف ورزی، رواج کی مخالفت اور روایات سے غداری کے الزامات سہنے پڑے ہوں گے۔

اور پھر بھلا اُس نے لکھا کس طرح ہوگا۔زیادہ قرینِ قیاس تو یہ ہے کہ اس نے بس زمین پر یا چٹان پر لکڑی یا پتھر سے لکیر نکال کر کوئی تصویر، کوئی نقل، کوئی عکس کھینچی ہوگا جو ارتقا بھی پاتا رہا ہوگا۔مہرگڑھ کے برتن نقوش سے بھرے ہوتے تھے۔کیا انہیں علامات (تحریر) نہیں سمجھنا چاہیے!!۔اور اس عکس کاری میں مسلسل بہتری بھی آتی ہوگی۔ابتدا میں یہ عکس اشیا کا رہا ہوگا اور اُن اشیا کے متعلق خبر ہوتی ہوگی۔گائے، مویشی، اونٹ اور مرغی، یا پھر گھرانہ، اُس کے افراد کی تعداد ظاہر کرنے کی ضرورت اُن کا عکس بنواتی رہی۔ جو جلد ہی مٹ جاتا ہوگا۔تبھی تو لکڑی کے جلے ہوئے کوئلے کی کالک بہترین اور دیرپا روشنائی (سیاہی) بنی۔اور زمین کی بجائے ہموار پتھر تختی بنی۔ یا پھر کٹے ہوئے بڑے درخت کا بڑا تنا ہمارے اجداد کی تختی رہی ہوگی۔اُس درخت کی چھال، جانور کی کھال سب کچھ کاغذ کا کام دینے لگے۔

اب جو سکول کی تختی ہے، جسے بار بار دھویا جا سکتا ہے اور پھر اس پر میٹ مل کر اسے لکھنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے.........شاید بلوچی تحریر کے مستقبل کی تاریخ ابد تک اسی تختی اور جلے ہوئے کوئلے کی احسان مند رہے۔یہی تو تحریر کی تاریخ کے ابتدائی زمانے رہے۔اِن عکسوں نے چینیوں کے ہاں مستقل رسم الخط کی صورت اختیار کی مگر ہمارے ہاں یہ مختصر ہوتے گئے،کم جگہ گھیرتے رہے اور باضابطہ تحریر کے لیے راہ صاف کرتے رہے۔یعنی عکس آہستہ آہستہ کم ہوتے گئے اور مظاہر ومدعا علامتوں سے ظاہر ہونے لگے۔اسی طرح لکھنے کے اوزار بھی ارتقا پاتے رہے۔اور یہیں سے تو درس وتدریس شروع ہوا۔علامتوں کی شُد بد دوسروں کو تو دینی ہی تھی نا!۔فلاں علامت فلاں چیز کو ظاہر کرتی ہے۔اسی کو پڑھانا لکھانا کہتے ہیں۔جو شخص اس علامت سے واقف ہوتا،خواندہ ہوتا۔

میرے گاؤں کے پاس ابھی حال ہی تک ایک پرچون کا دکاندار رہتا تھا۔وہ اَن پڑھ آدمی تھا جبکہ گاہکوں کے قرض، کاپی پر لکھنے تو ضروری ہوتے تھے۔لہٰذا وہ اُس شخص کے قد کا عکس نکالتا۔گُڑ کی ڈلی (ٹکیا) کی تصویر بناتا اور سیر کے باٹ کا عکس بناتا۔اگر گاہک دو سیر لے جاتا تو دو باٹ بنا لیتا۔اگر آدھا سیر تو سیر کے باٹ کے درمیان ایک لکیر لگاتا اور اگر پاؤ تو سیر کے باٹ یہ ایک افقی اور ایک عمودی لکیر لگاتا۔کچھ عرصہ کے بعد جب اس نے حروفِ ابجد سیکھ لیے تو جب بھی حیات خان کے نام کا کھاتہ لکھنا ہوتا تو وہ لکھتا 'ح'، اور زور زور سے پڑھتا 'ح، حیاتا یک سیرے گُڑ بڑتہ' (حیات ایک سیر گڑ لے گیا)۔سماج میں اتنی بے اعتباری بے ایمانی تو ہوتی نہ تھی کہ گاہک اس سے تاریخ پوچھ لیتا۔لہٰذا تاریخ کے لکھنے کی ضرورت بعد میں پڑی جب میرا گاؤں ترقی میں مزید پیچیدہ ہوتا چلا گیا......میرا گاؤں چالیس سال قبل، بلوچستان کا گیارہ ہزار سال پرانا مہرگڑھ ہی تو تھا۔

علامتوں کو سمجھنا خواندگی تھی اور علامتوں کو بنانا،لکھائی تھا۔یہی علامت نویسی رسم الخط بنی جس میں تغیر وتبدل جاری وساری ہے اور لازم ہے کہ جاری وساری رہے۔ورنہ موت ہے!۔

اوپر سے نیچے، بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں لکھنے کا رواج شروع ہوا۔انگریز محققین نے بلوچی کو سب سے پہلے رومن میں لکھنا شروع کیا: بائیں سے دائیں۔اور سب سے پہلے ایک انگریز سیاح لیچ نے اِس تاریخی قوم کی زبان وادب پر تحقیق شروع کی۔اور اپنی رپورٹ *جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال* میں چھاپ دی۔اس تحریر نے بعد میں دوسرے انگریز سکالروں کی توجہ اور دلچسپی اِس طرف کھینچ دی جو بلوچستان کے دور دراز کونوں تک گئے اور اِس کی آبادی کی زبان اور ادب کو جمع کیا۔ یوں لانگ ورتھ ڈیمز، ہیتو رام اور برٹن کی عظیم خدمات کی بدولت بلوچ کلاسیکل نظمیں اور فوک وقت اور بے حسی میں دھنس کر گم نہ ہوئیں۔اسی طرح میئر کی لکھی بلوچی کلاسیک (لندن 1900)، پیئرس کی ''اے ڈسکرپشن آف مکرانی بلوچی ڈائلکٹ'' (1877)، لارڈ بروس کی ''مینوئل اینڈ وکابلری آف بلوچی لینگویج'' اور ''نوٹس آن بلوچی ٹرائبز آف ڈیرہ جات'' خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ان ساری تحریروں میں رومن رسم الخط استعمال ہوا ہے۔

بعد میں ہم نے اپنے پڑوسیوں کی طرح دائیں سے بائیں لکھنا چُن لیا۔اور بڑے پیمانے پر یہ کام مولانا محمد فاضل درخانی اوران کے احباب سے پہلے محمد حسین عنقا نے شروع کیا۔اس کثیر جہتی سکالر نے 1920 سے عربی اردو سکرپٹ میں بلوچی لکھنی شروع کی اور پھر لکھتا ہی چلا گیا۔ شاعری، نثر، اخباری مضا مین وادار یے۔عنقا صاحب کی طرح نسیم تلوی، یوسف عزیز مگسی، عبدالعریز کرد، اور محمد امین کھوسہ اِس رسم الخط کی آبیاری اور شاخ تراشی کرتے رہے۔اِن لوگوں نے عربی رسم الخط میں موجود حروفِ تہجی کی مخصوص اشکال وضع کر کے بلوچی طرزِ تحریر بنایا جو واحد دستیاب انتخاب تھا۔وہی بغیر کسی مخالفت کے رواج پا گیا اس لیے کہ متبادل تو تھا نہیں۔ترمیم و تنسیخ کے پیہم عمل سے بلوچی اب اسی رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے۔پہلے زبر زیر، پیش، کھڑی زبر زیر اور ڈبل زبر زیر اور پیش اڑا دیے گئے اور اب تو 'ہمزہ' کی خیر نہیں۔

ہمارے سارے منطقے کی دیگر زبانوں (سندھی، فارسی، اردو، پشتو اور بلوچی) نے بھی اپنی ضرورتوں کے پیشِ نظر عربی کے حروف میں کمی بیشی کر کے اپنا کام چلانا شروع کر دیا۔ہم نے سارے اردو کے حروف کو اپنا لیا ہے'پشتو کے ساتھ بہت عرصے تک مشترک 'ڑ'، 'گ' اور 'ڈ' والے طرزِ تحریر کو ایک جیسا لکھنا اب ہم نے ترک کر دیا ہے'سندھی کے تین یا چار نکتے بھی بلوچی میں نہ چل سکے۔عربی والا 'ض' بلوچی میں معدومیت کی طرف جاتے جاتے رک جاتا ہے، ظ کے زندہ رہنے کے دن تو یقیناً تھوڑے لگتے ہیں۔

ہماری زبان کے لیے رسم الخط پر بہت بحثیں ہوتی رہیں۔بیسویں صدی کی پچاس کی دَہائی میں بلوچ قلم کاروں نے کراچی میں ایک اجلاس منعقد کیا۔اس میں فیصلہ ہوا کہ 'ءَ' 'ءِ' اور 'ءُ' کو ترک کر دیا جائے۔اس کے علاوہ ءَ، ءِ، اور ءُ کو بھی بہت کم کرنے پر اتفاق ہوا۔اُن کے اس فیصلے کو عملی جامہ آزات جمالدینی نے پہنایا۔وہ محنتی انسان اپنا رسالہ سارے کا سارا خود لکھ کر کاتب کو دیتا تھا تا کہ رسم الخط مصنف کی عادت کے بجائے کراچی فیصلہ کے مطابق بنایا جائے۔اسی طرح محمد حسین عنقا بھی تسلسل سے اس رسم الخط کے ارتقا کے ہر مرحلے پر اس کی نوک پلک سنوارتا رہا۔ایک بہت بڑا موڑ سید ظہور شاہ ہاشمی نے بھی دینے کی کوشش کی اور باقاعدہ بلوچی لکھنے کا 'صحیح' طریقہ

بتانے کے لیے ایک کتاب تک لکھ ڈالی۔مگر اُس کی کتاب 'ایک انتہا سے دوسرے انتہا تک چھلانگیں مارتے رہنا'، ثابت ہوئی۔اسی لیے بے سود رہی۔پھر کچھ لوگوں نے کچھ الفاظ کے اوپر چھوٹا دائرہ لگا کر ایک اور مشکل پیدا کر دی۔مگر پھر روانی کے سیلاب نے ہر ایسی بات کو بہا ڈالا جس نے بلوچی زبان کے ابلاغ میں دشواری پیدا کر دی ہو............اب بھی سب لکھنے والے عربی، فارسی رسم الخط میں لکھتے رہتے ہیں۔

سنگت اکیڈمی آف سائنسز سے متعلق احباب، بلوچی کے تین بڑے نام یعنی، ڈاکٹر نعمت گچکی، عبدالحکیم بلوچ اور عزیز بگٹی اب ہمزہ کے زیادہ سے زیادہ خاتمے کے لیے کوشاں ہیں۔ بالخصوص ہمزہ پیش 'ءُ' کو تو بالکل غیر ضروری قرار دیا گیا۔اسی طرح 'ءَ' کو بھی 'آ' یا 'ہ' نے پرے دھکیل کر بے فائدہ قرار دیا گیا۔صرف 'ءِ' کے استعمال (اور وہ بھی شاذ و نادر استعمال) کی مجبوری کو روا قرار دیا گیا۔

دلچسپ بات ہے کہ مذہب کے زیرِ اثر دنیا میں بے شمار زبانوں کو عربی میں لکھا جاتا ہے جو بہت مختلف خاندانوں سے ہیں۔مثلاً سامی، ترکی، پھر انڈو یورپین زبانیں مثلاً فارسی، پشتو، اردو، کردی اور بلوچی۔ بلوچی میں جس نے چاہا اپنے قبیلوی لہجے کی مطابقت میں عربی رسم الخط میں بلوچی لکھ ڈالی۔عربی کا 'ث'، عربی تلفظ دینے والا 'ذ' مشرقی بلوچی میں بولنے اور لکھنے میں بہت استعمال ہونے والے حروف ہیں جبکہ یہ دونوں حروف مغربی بلوچستان اور رخشانی لہجوں میں استعمال ہی نہیں ہوتے۔اسی طرح 'غ' اور 'ف' بھی مغربی بلوچستان میں نہیں بولے جاتے۔مگر جس وقت ظہور شاہ ہاشمی نے بغیر سوچے سمجھے قلم کے ایک ہی جھٹکے میں ث، ذ، ف، خ اور غ کو بلوچی زبان کے ریوڑ سے نکال باہر کر دیا تو بلوچوں نے اِس انتہا پسندی کو قبول نہیں کیا۔بلوچی بھیڑوں کو بھیڑیوں کے حوالے نہ کرنے کے نتیجے میں آج تک یہ سارے حروف استعمال میں ہیں۔اسی طرح عبداللہ کے نام کا 'ع' کہیں کے عمل جائے گا۔صمد خان کا 'ص' بھی رہ جائے گا، حق حقوق والا 'ح' بھی سلامت رہے گا۔علیٰ ہذا القیاس۔

میر گل خان نصیر جب وزیرِ تعلیم تھا (ستر کی دَھائی میں) تو ایک اور بحث نے بہت زور

پکڑ لیا تھا۔ وہ یہ کہ کیوں نہ رومن (لاطینی) رسم الخط کو اختیار کیا جائے۔ دلچسپ قسم کے ردِعمل سامنے آئے۔ اُن دنوں موجودہ عربی رسم الخط کے حق میں بھی انتہا پسند دلائل دیے گئے اور رومن رسم الخط اختیار کرنے پر بھی۔

واضح رہے کہ رومن رسم الخط نے یونانی تحریری رسم سے ترقی کی۔ بالکل اُسی طرح جس طرح رومن تمدن، یونانی تمدن کی ترقی کے ستونوں پر کھڑا ہے(1)۔

رومن رسم الخط کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں لکھنا اور ٹائپ کرنا آسان ہے۔ ایک حرف کو دوسرے کے ساتھ ملانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ رومن رسم الخط پر تقریباً عمومی اتفاق ہے۔
مگر ایک مسئلہ یہ ہے کہ پھر اُس ذخیرے کا کیا جائے جو موجودہ عربی رسم الخط میں محفوظ ہے اور تیزی سے محفوظ کیا جارہا ہے (ایک سے زیادہ ممالک میں)۔

دوسرا پرابلم یہ ہے کہ بلوچ میں خواندگی بہت ہی کم ہے۔ عربی، فارسی اردو تو پھر بھی مذہبی یا ریاستی پشت پناہی کی وجہ سے پڑھی لکھی جاتی ہے مگر بائیں سے دائیں لکھے جانے والے رومن کے لیے ہماری خواندگی بہت ہی کم ہے۔ رومن تو پھر انگلش بھی نہیں بلکہ انگلش کے حروف پر عجیب قسم کے اعراب لگانا ہے، جو اور مشکل ہے۔

لگتا ہے کہ رومن رسم الخط کے سائنسی ہونے اور بلوچی کے تمام تر تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت کے باوجود، ہم موجودہ رسم الخط ہی کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔ اس لیے وہ انقلاب ابھی دھندو تاریکی کی دبیز تہہ کے پیچھے ہے، جس سے نہ صرف قومیں آزاد ہوا کرتی ہیں بلکہ اُن کی زبانیں بھی ترقی کی زقندیں بھرا کرتی ہیں۔ ہمارا رسم الخط ہماری خواہشوں کے باوجود لگتا ہے، یہی رہے گا جو موجود ہے۔ اس لیے کہ اتنے بڑے فیصلے کے پیچھے ریاست کے کھڑے ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بلوچی زبان پاکستان، افغانستان، ایران، خلیجی ممالک، ترکمانستان اور ہندوستان میں بولی جاتی ہے اور کچھ جگہوں میں تو پڑھائی بھی جاتی ہے۔ ان تمام ممالک میں اسے عربی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ لہٰذا حتمی بات یہ ہے کہ بلوچی کا رسم الخط یہی عربی فارسی اور اردو والا رسم الخط ہی رہے گا اور اسی میں ترقی وارتقا جاری رہے گا۔

کمپیوٹر آیا تو امید پیدا ہو چلی ہے کہ اب بلوچی رسم الخط یکساں ہو جائے گی۔ گو کہ اس راہ میں بہت ساری رکاوٹیں ہیں مگر نئی ٹکنالوجی (فیس بک، ایس ایم ایس اور انٹرنیٹ) اِن رکاوٹوں کو ضرور توڑ دے گی۔

حوالہ جات

1- جمالدینی، عبداللہ جان، رومن لکھوڑ و بلوچی، ماہنامہ اولس، اگست 1983، صفحہ 33

بلوچی کا مستقبل

بلوچی زبان والے ممالک میں سے افغانستان میں بادشاہت رہی، ایران میں بھی بادشاہت اوراب ملّا آمریت ہے اور پاکستان میں مارشل لا۔ چنانچہ یہ تینوں ممالک بطور ریاست اپنے عوام کے دشمن رہے ہیں۔ وہاں عوام کے جاہل اور گنوار قرار پانے کے اسباب میں ایک طرف ''مغربی جمہوریت یہاں نہیں آ سکتی'' کا سرکاری فتویٰ جاری رہا، مگر دوسری طرف اس جاہل و گنوار و عوام کی بولی جانے والی زبانوں کو گھٹیا، بے کار اور غیر تہذیب یافتہ قرار دیا جاتا رہا۔

مگر باطل کو بہرحال باطل ہو جانا ہے۔ مغربی جمہوریت بھی پیر پھیلا رہی ہے اور اقوام متحدہ کی برکت اور عوام الناس کی اپنی جدوجہد کی بدولت زبانوں کے بارے میں آمریت کے نظریات بھی پس پا ہونے لگے ہیں۔

مگر اِس دوران کتنے لعل کال کوٹھڑیوں میں تڑپتے سسکتے رہے، کتنے مہذب انسان جلاوطنی اور جیل کی بدتہذیبی کا شکار ہوئے اور کتنے مقدس سر کاٹ دیے گئے۔ انھی نجیب انسانوں کی قربانیوں کے ایک ایک جان گُش لمحے پر کھڑی ہے بلوچی، اور اس کا مستقبل۔

کسی بھی موجودہ زبان کی تندرستی اور مضبوطی کو پرکھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ یہ زبان سماج میں استعمال کہاں ہو رہی ہے۔ اگر ایک زبان گھر میں بھی استعمال ہو رہی ہو، کام

کی جگہ میں بھی، دفتر اور تعلیم میں بھی، تجارت، انتظامیہ، مذہب میں بھی، تفریح میں بھی، اور میڈیا میں بھی، تو پھر سمجھو وہ زبان خوب ترقی کر رہی ہوگی۔

بدقسمتی سے بلوچی کے معاملے میں یہ ساری شرائط پوری نہیں ہو رہیں۔ بلکہ ایران اور پاکستان میں تو ون یونٹی حکمرانوں کو خبط پڑا رہا کہ پورے ملک کو ایک قوم بنا لیا جائے۔ لہٰذا ایک قومی زبان، (یعنی ایک قابض زبان ہو)۔ باقی بس 'علاقائی' زبانیں ہوں۔ لہٰذا مادری زبانوں میں تعلیم ممنوع اور باقاعدہ غداری ٹھہری۔ بس صرف کمیونسٹ دشمن اور سوویت مخالف پروپیگنڈہ کے لیے بلوچی زبان میں ریڈیو نشریات اِن دونوں ممالک کی مجبوری ٹھہری۔ ریڈیو ایران، زاہدان اور ریڈیو پاکستان کوئٹہ و کراچی۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ زندہ زبانوں کو ماضی کی دھند میں دھندلایا نہیں جا سکتا۔ زندہ زبانیں عہدی تقاضوں کی تکمیل کی خاطر نئے نئے رنگ اور نئی نئی صورتیں اختیار کرتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ دونوں سرکاروں کی بلوچ خوفزدگی کے باوجود نئی ایجادات واختراعات نے، نئے نئے الفاظ اور ضرب الامثال نے، بلوچی کو غنی بنا دیا۔ بلوچی زبان وسیع عوام الناس کا میدانِ عمل رہی ہے۔ ہزارہا سالوں کے عمل میں اپنی ضروریات کے مطابق بلوچ اپنی قومی مادری زبان میں اضافے اور ترامیم کرتے رہے ہیں۔ زبان سے غیر ضروری جڑی بوٹیاں اکھیڑی جاتی رہی ہیں اور یہ غیر ضروری جڑی بوٹیاں ذہنوں کے دور دراز گوشوں (اور سٹوروں) میں پھینک دی جاتی رہی ہیں۔ ذہن کے یہ گوشے غیر ضروری الفاظ کا مرگھٹ ہوتے ہیں۔ نئے الفاظ خاموشی سے شامل ہوتے جاتے ہیں اور بے کار الفاظ بغیر ڈھنڈورا پیٹے خاموشی سے گوشہ نشینی کے اعتکاف میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر بہت شرافت سے خودکشی کرتے جاتے ہیں۔ سوئی گیس جب آئی تو اپنے ساتھ بے شمار نئے الفاظ لائی اور ساتھ ہی لکڑیاں چُننے کے کئی الفاظ، رسوم اور ضرب الامثال کو کباڑ خانے میں پھینک گئی۔ جب پِسائی کی مشینوں کی وجہ سے ہاتھ سے چکی پیسنا ختم ہوا تو ساتھ میں بے شمار الفاظ و اصطلاحات بھی دفن ہوئے ٹیوب ویل کے ساتھ رہٹ اور کاریز کی اصطلاحات متروک ہوگئیں۔ ٹریکٹر کے ساتھ پرانے ہل اور کاشتکاری کی پرانی اصطلاحات نقش برآب ہوگئیں۔ یوں ہر دم نکھرتی سنورتی زبان

حضرتِ انسان کی نہ صرف روزمرہ زندگی کو مربوط کرتی رہی ہے بلکہ اس کی روحانی اور ثقافتی لطافتوں کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی رہی ہے۔

دوسری زبانوں سے بلوچی کے میل جول کا یہ عمل حالیہ دَہائیوں میں تو سر چکرا جانے والی تیز رفتاری سے چلا۔ افغانستان میں انقلاب نے اگر ایک طرف مارکسزم کے سیاسی، معاشی اور فلسفیانہ اصطلاحات کی فوج ظفر موج سے بلوچی کا سامنا کرایا تو دوسری طرف امریکی سامراج نے اِس انقلاب میں مداخلت کے لیے بلوچ علاقوں پر مشتمل ممالک کو ذریعہ بنالیا اور سیکڑوں نئے الفاظ، اور ضرب الامثال ہماری زبان میں منتقل کردیں جنھیں یا تو ہم نے ثابت وسالم اپنی زبان میں مدغم کردیا، یا انہیں تراش خراش کر کے بلوچی کے بڑے خزینے میں شامل کردیا۔

پھر زبانوں میں ترقی کے بے شمار متبادل بھی در آئے ہیں۔ اب انٹرنیٹ، فیس بک، ایس ایم ایس اور دیگر بے شمار ذرائع موجود ہیں جہاں ہماری زبان اپنی بقا اور ترقی کے مواقع دیکھ سکتی ہے۔ فلمیں، ویڈیوز اور ٹی وی جیسی سائنسی دنیا میں بلوچی کی معدومیت کا مفروضہ اب باقی نہ رہے گا۔

بلاشبہ آج کی بلوچی زبان وہ زبان نہیں جو پندرہویں صدی میں ہوا کرتی تھی۔ یہ وہ زبان نہیں رہے گی، جو آج اکیسویں صدی میں ہے۔ جس طرح کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ ایک ماں باپ اور ایک خون کی نسل سے آئی ہے۔ اسی طرح کوئی بھی زبان اور ثقافت یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ محض اپنے رہنے والوں کے اٹھنے بیٹھنے کا نتیجہ ہے اور اس نے آس پاس سے کوئی اثر نہ لیا۔ بلوچی، سماجی تقاضوں کو پورا کرتے رہنے والی زبان ہے۔ یہ اپنے بولنے والوں کے جذبات و خواہشات، اور خیالات و افکار کی ترجمانی و ابلاغ کا حق مکمل طور پر ادا کرتی رہی ہے۔ اس کا قدیم، ہمہ وقت جدید ہوتا جاتا ہے۔ ناتواں الفاظ، نوزائیدہ کو جگہ دیتے دیتے فوت ہوتے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی خاصیت ہے جو کسی زبان کو مرنے نہیں دیتی۔

پھر یہ بھی ہے کہ دنیا کا ایک بھی ملک ایسا نہ ہوگا جو وحدت اللسانی ہونے کا دعویٰ کرسکے۔ ہم تو کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کریں گے۔ بلوچستان کثیر اللسانی خطہ ہے۔ اس لیے ہماری زبانوں نے ایک دوسرے کو سننا ہوتا ہے، ایک دوسرے کو امیر و غنی بنانا ہوتا ہے۔ بلوچی کی تقدیر بہت روشن ہے۔

بلوچی زبان کے مسائل کا حل

پاکستان، ایران، افغانستان میں بڑی تعداد میں بولی جانے والی بلوچی کو تینوں ممالک کی حکومتوں کی طرف سے معاندانہ رویوں کا سامنا ہے۔ بالخصوص ایران اور پاکستان کے تعلیمی ادارے، ادبی اکیڈمیاں، نشریاتی ادارے اور ابلاغ عامہ کے ذرائع اپنے اپنے جُثہ کے مطابق بلوچی کو پیچھے دھکیلنے والی کہنیاں مارتے رہے ہیں۔ اسے سرکاری، قومی، تجارتی اور سائنسی زبان نہ بننے دینے کے بے شمار بہانے اور جواز اُن کی جیبوں میں موجود رہتے ہیں۔ (مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان میں آپ بلوچی زبان کی ترقی ترویج کے بارے میں کم از کم بات تو کرسکتے ہیں، مطالبہ تو کرسکتے ہیں، اور کبھی کبھی اپنی بات منوا بھی سکتے ہیں۔ مگر ایران میں اس سب کچھ کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے)۔

حالیہ پوری صدی بلوچی پر ایک یلغار کی صدی رہی ہے۔ ایسی ہمہ طرفہ یلغار کہ اگر بلوچ عورتیں، اور محنت کش موجود نہ ہوتے تو بلوچی تو کب کی فوت ہو چکی ہوتی۔ نیم خانہ بدوش مویشی بانوں، دیہی کاشتکاروں اور وسیع سمندر میں مچھیروں نے اسے ابھی تک بچائے رکھا ہے۔ مگر بلوچی زبان کے دوستوں کو ہمہ وقت خبردار رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ شہر نے رات کو کہانیاں سنانے والی ماؤں کو سبکدوش کرلیا ہے، اب بچے کارٹون نیٹ ورک کے حوالے ہو چکے ہیں، اور وہ بھی انگریزی یا

ہندی میں ۔سکول میں تدریسی زبان انگریزی یا اردو ہے، ریاست بلوچی کو سرکاری زبان بناتی نہیں، ہماری اپنی کوئی مشترک منڈی نہیں ہے۔ نیز بلوچ کوئی صنعتی پیداوار نہیں کرتے۔............ بلاشبہ بلوچی بہت بڑے خطرات میں ہے۔

تو پھر کیا کیا جائے؟!اسے کس طرح مرنے سے بچایا جائے؟!اسے کس طرح غنی اور امیر بنایا جائے؟!!

مندرجہ ذیل اقدامات سے ہم ایسا کرسکتے ہیں۔

1. تراجم:

سارے سرکاری، ادارتی، گروہی، قبائلی اور افرادی وسائل کو صرف ایک کام پر جھونک دیا جائے، ترجمہ کے کام پر۔ ہمیں پتہ ہے کہ آج تک کی ساری سائنس، فلسفہ، مذہب اور سیاست ہمارے ہاں ترجمے سے آئے ہیں۔ اسی طرح اب تک کا سارا عالمی ہنر اور علم ترجمہ سے آیا ہے۔ ترجمہ عقل و شعور، اور ترقی و تہذیب کے دَر کھول دیتا ہے۔ انگلش، روسی، فرانسوی اور عربی زبانوں کی ترقی کا ایک سب سے بڑا زینہ یہی ترجمہ رہا ہے۔ بے شمار لہجوں والی بلوچی، الفاظ سے بھری پڑی ہے۔ ذخیرہِ الفاظ کے لحاظ سے یہ دنیا کی امیر ترین اور فربہ ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ لہٰذا اس زبان میں ترجمہ کرنا بہت آسان ہے۔

2. مادری زبان ذریعہ تعلیم:

پوری دنیا میں بلوچی بولنے والے علاقوں میں بلوچ بچوں کو کسی اور زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ پاکستان میں اردو انگلش، ایران اور افغانستان میں فارسی پشتو، خلیج میں عربی اور ترکمانستان میں ترکمن یا روسی زبانوں میں۔ یعنی یہ تحریری زبان اب تک نہ بن سکی۔ اس ہی کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ بلوچ آپس میں بحثوں کے اندر وہی بالادست زبان استعمال کرتے ہیں۔ یوں بلوچی صرف گھروں میں بولی جاتی ہے۔

ہر انسان اپنی مادری زبان میں سوچتا ہے، اُسی میں خواب دیکھتا ہے، اُسی میں اپنی بے

پناہ مسرت یا انتہائی غصے کا اظہار کرتا ہے۔ زندگی بھر ہمارے دماغ کو ہماری مادری زبان چلاتی ہے ......پنگھوڑے سے لے کر قبر تک۔ بچے سے سب سے پہلے اس کی اپنی ماں بات کرتی ہے، اور وہ اپنی مادری زبان میں بات کرتی ہے۔ اُسے گود میں دودھ پلاتے، اسے پیار کرتے، اسے ڈانٹتے، اُسے آں اوں کرنا سکھاتے ہوئے ماں اپنی مادری زبان ہی بولتی ہے۔ بچہ بات کرنا سیکھ کر جو اولین بات کرتا ہے، وہ اُس کی مادری زبان کا لفظ ہوتا ہے۔ سکول جانے کی عمر تک وہ ایک ہی زبان سنتا، سمجھتا اور بولتا ہے اور وہ زبان اس کی مادری زبان ہوتی ہے۔ اُس عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ آس پاس کی ساری چیزوں کو اپنی زبان میں پہچانتا ہے۔ اس کے علاوہ سردی گرمی، بھوک پیاس، درد اور تھکن کے احساسات بھی وہ اپنی مادری زبان میں جانتا ہے۔ یوں مادری زبان سب سے فطری اور شناسا زبان ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر سکول کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہو تو اس کے سیکھنے کے جاری عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی اور جاننے کا عمل تیز رفتاری سے جاری رہتا ہے۔

چنانچہ، ابتدائی تعلیم کے حصول کے لیے مادری زبان بہترین میڈیم ہوتی ہے۔ اگر سکولی تعلیم مادری زبان میں ہو تو بچے کو سکول جانے میں کوئی گھبراہٹ، کوئی رکاوٹ، کوئی نفسیاتی جھجک نہیں ہوگی۔ وہ سکول جانے کو بہت Comfortable محسوس کرے گا۔ کوئی اجنبیت نہیں لگے گی۔ نیز اُسے کتاب میں لکھی چیزوں کی تفہیم فوری اور زیادہ تیزی کے ساتھ ہوگی............ اور تفہیم ہی تو تعلیم ہوتی ہے۔ تفہیم کبھی بھی کسی خارجی زبان کی محتاج نہیں ہوتی۔ مادری زبان موجود مواد کے تیز رفتار سیکھنے میں سہولت دیتی ہے۔ اس لیے کہ زبان کا ذخیرہ تو پہلے ہی اس کے پاس موجود ہوتا ہے۔ اُسی زبان میں نئی چیز سیکھتے ہوئے اسے مسرت ہوتی ہے، اس میں جوش اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بیگانگی جتنی کم ہوگی تفہیم اُسی قدر زیادہ ہوگی۔ اور تفہیم جتنی زیادہ ہوگی، دل اتنا زیادہ لگے گا۔ بچہ کبھی سکول سے بھاگے گا نہیں۔

ایک بات واضح ہونی چاہیے؛ علم یعنی تفہیم اور امتحان میں اچھے نمبر لینے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ امتحان میں اچھے نمبر لینے کے لیے آپ کو رٹہ وغیرہ لگانا پڑتا ہے جبکہ علم تو رٹے کی بجائے تفہیم سے حاصل ہوتا ہے۔ اس تفہیم اور اس کے اظہار دونوں کے لیے مادری زبان زبردست

نعمت ہوتی ہے۔ مادری زبان کو تفہیم کے عمل سے باہر رکھنا، بچے کے لیے تباہ کن ہوتا ہے۔

مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ آپ صرف ایک چیز سیکھ رہے ہوتے ہیں؛ یعنی وہی چیز جس کا سکھانا مقصود ہو۔ جبکہ وہی چیز اگر آپ بچے کو کسی خارجی زبان میں سکھا دیں گے تو اصل میں آپ اُس کو ڈبل تکلیف میں ڈال رہے ہیں۔ بچہ وہ چیز بھی سیکھ رہا ہوتا ہے جس کا سکھانا اسے مقصود ہوتا ہے، اور ساتھ میں اُس چیز کو ظاہر کرنے والا لفظ بھی سیکھنا ہوتا ہے جو آپ کی اپنی زبان کا نہیں ہوتا۔ یعنی مادری زبان میں تعلیم نہ ہو تو بچہ کئی سال زبان سیکھنے میں ہی برباد کر لیتا ہے۔ بجائے سائنس، ریاضی میں تعلیم کے بچہ دوسری زبان میں الجھا رہتا ہے۔ خارجی زبان کے ذریعے تعلیم، بچے کی خود تعلیمی کو روک دیتی ہے۔

بچے کو خارجی زبان میں پڑھانے کا کیا مطلب ہے؟...... یہ کہ اُس کی اپنی مادری زبان کمتر ہے اُس میں تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ تو جس انسان کی ماں بولی کمتر گردانی جاتی ہے تو دراصل اُس کی ماں کمتر گردانی جا رہی ہے، خود اُسے کم تر گردانا جا رہا ہوتا ہے۔ ایک قسم کی شرمندگی، ایک طرح کا طعنہ۔ یہ احساس کمتری زندگی بھر مختلف شکلوں صورتوں میں اُس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ جو قوم اپنی زبان کو کم تر سمجھے وہ خود کم تر بن جاتی ہے۔ جس قوم نے اپنی زبان کھودی، وہ خود کو کھوگئی۔ یہاں ہم محض ایک بچہ، ایک فرد کی بات نہیں کر رہے، پورے بلوچستان کی بات کر رہے ہیں۔

خارجی زبان پڑھا کر صرف یہی نہیں کہ ہم بچوں کو اُن کی اپنی شناخت پہ شرمندگی سکھا رہے ہیں بلکہ ایک اور شرمندگی و احساسِ کمتری بھی۔ وہ یہ کہ خارجی زبان کے تلفظ اور گرائمر پر کبھی بھی اس کی مکمل دسترس ممکن نہیں ہوتی۔ یعنی بچہ اپنی مادری زبان پہ بھی شرمندہ رہتا ہے اور خارجی زبان کے استعمال میں غلطیاں کرتے رہنے کی بھی شرمندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔

فِن لینڈ، جاپان وغیرہ تعلیم میں مادری زبان استعمال کرتے ہیں اور وہ انگریزی زبان کے بغیر ہی سارے شعبوں میں عمدہ ترین ہیں۔ روس اور جرمنی کا بھی یہی حال ہے۔ صوبہ خیبر پختونخواہ میں باچا خان فاؤنڈیشن دس ہائی سکول چلا رہی ہے، جہاں سارا کورس مادری زبان میں ہوتا ہے۔ سندھ میں تو عرصے سے مادری زبان ہی ذریعہ تعلیم کے بطور رائج ہے۔ لازم ہے

بلوچستان میں بھی تعلیم مادری زبان میں ہو۔

3- سٹینڈرڈائزیشن کا جنون:

ہمارے پس ماندہ اور ایک دوسرے سے بے رابطہ، وسیع طور پر پھیلے عوام کے لیے ایک لہجے میں بات سمجھنا اور کرنا ناممکن رہا ہے۔ جب تک ہماری ایک مشترکہ منڈی نہ ہو، رسل و رسائل کے وسائل میسر نہ ہوں اور عوام کا باہمی میل جول عام نہ ہو جائے، زبان کے لہجے مختلف ہی رہیں گے۔ اس لیے آج بلوچی زبان کو سٹینڈرڈائزیشن کی چکی میں ڈالنا تباہ کن ہوگا (بالخصوص پرائمری کے بچوں کے لیے)۔ مادری زبان میں بے شمار لہجے کسی زبان کا خزانہ اور اُس کے لازمی اور بنیادی ستون ہوتے ہیں۔ ایک کو بھی گرانا یا کمزور کرنا پوری زبان کو تباہ کر دے گا۔ (کوئی بدبخت شخص ہی گھر میں موجود پیسہ سے بھرے بے شمار بکسوں میں سے صرف ایک اٹھا کر، باقی پھینک دیتا ہے)۔ کسی ایک لہجہ میں بات کرنے والی کمیونٹی کے بچوں کو ایک دوسرے لہجے میں تعلیم دلانا نہ صرف جابرانہ، ظالمانہ اور غیر جمہوری ہے بلکہ مجموعی طور پر اُس مادری زبان کے لیے ایک اضافی نفسیاتی بوجھ بھی ہے۔ مکران کا بچہ اور جیبک آباد کا بچہ پہلی جماعت ایک لہجہ میں نہیں پڑھ سکتے۔ انہیں اُن کے اپنے لہجے میں سکولی تعلیم دینا ہوگی۔ اور ایسا ایک دو سال تک نہیں بلکہ اگلے پچاس برس تک یہی کچھ کرنا ہوگا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر ضلع اپنے لہجے میں نصاب کا ترجمہ کرے۔ نصاب تو وہی ہے جو بلوچستان ٹیکسٹ بورڈ کا منظور کردہ ہے، جس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اسے صرف ترجمہ کرنا ہے اپنی مادری زبان میں اور اپنے ضلع کے لہجے میں۔ (اور اس خالصتاً غیر سیاسی، اکیڈمک، اور تعلیمی کام کو متعلقہ ضلع کے ڈی ای او کی سربراہی میں تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے)۔ آٹھویں جماعت کے بعد ایک یکساں لہجے والی مادری زبان کے بارے میں دھیرے دھیرے قدم اٹھائے جا سکتے ہیں۔ وہ اِس طرح کہ مڈل کلاسز تک ہر ضلع نصاب میں اپنے لہجے سے باہر کے 30 فیصد الفاظ استعمال کرے، اور میٹرک تک مشرق و مغرب اور شمال و جنوب ایک یکساں، مخلوط اور سٹینڈرڈائزڈ زبان بن چکی ہوگی۔

اِسی طرح عالمی سائنسی اصطلاحات کو مادری زبانوں میں ترجمہ کرنے کی غلطی بالکل نہیں کرنی چاہیے۔ دنیا بھر میں اصطلاحات زیادہ تر یونانی زبان میں ہیں، کچھ لاطینی میں۔ بہت کم اصطلاحات انگریزی زبان سے آئی ہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں نے ان اصطلاحات کو اُسی بنیادی زبان والا ہی رہنے دیا، اُن میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ یہی اصطلاحات انگریزی زبان میں بھی استعمال ہوتی ہیں، اور ہمیں یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ یہ انگریزی زبان کی اصطلاحات ہیں۔ یہ اصطلاحات اب عالمگیر ہیں اور ہر زبان میں اِسی طرح جگہ بنا چکی ہیں۔

4- انگلش دشمنی چھوڑ دیجئے:

ایک بات کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم انگلش سے مقابلہ کر رہے ہیں، یا ہماری مادری قومی زبان کسی صورت انگلش کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ یاد رکھیے انگلش زبان کو مسترد نہ کیجیے۔ انگلش ایک گلوبل زبان ہے۔ سائنس ٹکنالوجی میں بھی، اور دیگر روزمرہ کے معاملات میں بھی۔ ایک گلوبل ولیج والی دنیا میں رہتے ہوئے اس گلوبل زبان سے تعلق واسطہ روزمرہ کا معمول ہے۔ اس زبان سے آنکھیں چرانا، اسے نظرانداز کرنا، یا جذبات میں بہہ کر اِس واحد سائنسی عالمی زبان کو پسِ پشت ڈالنا اپنی آنے والی کئی نسلوں سے دشمنی کے مترادف ہے۔ جی ہاں دشمنی، اپنی اولاد کے ساتھ۔

انگلش ایک نعمت ہے، ایک آلہ، ایک ذریعہ ہے جس سے ہم عالمی علم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ انگلش آج تحقیق و ریسرچ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ یہ سارا علم ہمارا ہے۔ ساری انسانی ترقی ہم سارے انسانوں کی مشترکہ میراث ہے۔ انگلش زبان سے دوستی، ایک روشن فکر ریاست وسماج، اور ایک صنعتی معاشرہ بلوچی زبان کی ترقی ونشوونما کے تین بڑے ذریعے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک پر زور دینا بلوچی دشمنی ہے۔

ہم جو انگریز کی نوآبادی رہے ہیں، ہمارے لیے انگلش سیکھنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ یہ ہماری نفسیات کا ایک حصہ سا ہے۔ لہٰذا چوتھی جماعت سے انگلش کو دھیرے دھیرے، ساتھ ساتھ

رکھنا ہوگا۔

مادری قومی زبان تو دسویں جماعت تک، اور اُس کے بعد پی ایچ ڈی تک تدریسی زبان ہونی لازمی ہے۔ ساتھ ساتھ انگلش رکھی جائے۔ پی ایچ ڈی انگلش میں بھی ہو سکتی ہے۔ دونوں انتخاب موجود ہونے چاہئیں۔ اردو رابطہ زبان (Link Language) کے بطور زندہ و پائندہ رہے گی۔

5- انڈسٹریلائزڈ بلوچستان:

صنعت کے بغیر ایک پچھڑی زبان کا ترقی یافتہ زبانوں تک پہنچنا اب ناممکن بات ہے۔ اور صنعت کاری کے سامنے بلوچستان میں سب سے بڑی رکاوٹ یہاں کا فیوڈل ازم ہے۔ فیوڈل ازم کے ساتھ پیر، ملا، بیوروکریسی اور فوج کا اتحاد ہے۔ یہ سارا نظام فرد کی آزادی کو روکتا ہے، آزاد فکر کو پروان چڑھانے سے روکتا ہے اور سوچ پر طرح طرح کی پابندیاں لگا کر ایک تنقیدی فضا قائم کرنے نہیں دیتا۔ زبانوں اور سماجوں کی ترقی بڑی بڑی گاڑیاں درآمد کرنے، دبئی جیسی بلند عمارتیں بنوانے اور انگریزی بولنے سے نہیں ہوتی۔ سماج اور زبان وہی ترقی کرتے ہیں، جن میں سائنس دان پیدا ہو رہے ہوں، فلسفی پیدا ہو رہے ہوں، ریاضی دان پیدا ہو رہے ہوں......خود سماج کے اندر سے۔

اس بات پہ زور دیا جانا چاہیے کہ یہ بات سوفیصد درست نہیں ہے کہ یورپ نے ترقی صرف اس لیے کی کہ وہاں تعلیم مادری زبان میں ہے۔ اگر مادری زبان میں تعلیم دینے اور بہت دولت مند ہونے سے ترقی ہوتی تو عرب ممالک آج سائنس ٹکنالوجی اور معاشی ترقی کی بلندیوں پہ ہوتے۔ ترقی اور مادری زبان کے تعلق کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔

اصل بات یہ ہے کہ ترقی انھی ممالک نے حاصل کی، جن ممالک میں سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں بورژوا انقلاب فتح مند ہوا۔ وہاں پیداواری قوتوں اور ٹکنالوجی کی ترقی کو سائنس اور فلسفہ کی متوازی ترقی کے ساتھ کمک دی گئی، جس نے کلیسا کی نظریاتی بالادستی کو ہمیشہ کے

لیے ختم کر دیا۔ یہاں موجودہ بھیڑ چال والی طرزِ حکومت میں ذہنوں، لسانوں کی صنعتی ترقی ناممکن ہے۔ ایک صنعتی نظام چاہیے انسان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے۔ صنعتی نظام معہ اپنے پورے پیکیج کے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ غاروں کے سماج والی بودوباش رکھیں اور آپ کی زبان جدید بنے۔

6- نصابِ تعلیم :

آگے مسئلہ یہ آتا ہے کہ نصابِ تعلیم کیسا ہو۔ نصاب کے ہاتھوں ہم برباد ہو رہے ہیں۔ ہمارے عام عوام (اور دانش ور بھی) تعلیم کی اہمیت پہ تو بہت زور دیتے ہیں۔ مگر انھیں اندازہ ہی نہیں کہ نصاب کتنا اہم ہوتا ہے۔ پاکستان، ایران اور افغانستان میں نصاب انتہائی ماضی پرست، قدامتی اور روایت پرست رہا ہے۔ آج سارے ڈگری یافتہ لوگ ہی سب سے بڑے رجعتی ہیں، مستقبل سے ڈرنے والے، لکیر کے فقیر۔ ساری ڈگریاں پیروں، نجومیوں اور پامسٹوں کے قدموں میں ڈال کر رہن شدہ زندگیاں گزار رہے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے بسیار نویس فلسفی اور انقلابی، سٹیزن ٹام پین نے کہا تھا کہ ''زندہ زبان، ہمیشہ سائنسی زبان ہوا کرتی ہے''۔ بلوچی زبان زندہ ہی تب رہ پائے گی اگر وہ سائنسی زبان ہو گی۔

نیچرل سائنس کے علوم (جن میں فزکس، حساب، الجبرا، جیومیٹری، کیمسٹری، بیالوجی، باٹنی، فزیالوجی، جیالوجی وغیرہ شامل ہیں) دسویں جماعت تک پڑھنے لازمی ہوں۔ بعد میں جس سپیشلائزیشن کی طرف جانا ہو، اسی سے متعلقہ مضامین نصاب میں ہوں۔ سوشل سائنسز کے علوم میں اکنامکس، تاریخ، جغرافیہ، پولیٹیکل سائنس، سوشیالوجی، سائیکالوجی اور شعر و ادب شامل ہیں۔ ، اِن کا بھی دسویں جماعت تک پڑھنا لازمی ہو۔ یہاں ہمیں اپنی نوجوان نسل کو بیورغ، شہ مرید، جام درک، مستیں توکلی، گل خان نصیر، آزات جمالدینی اور عطا شاد کو پڑھانا چاہیے۔ مراد ساحر جیسے لکھاریوں کا افسانوی ادب پڑھایا جائے۔ میر عبداللہ جان جمالدینی اور اُس کے شاگردوں کا تحقیقی خزانہ بھی کورس میں شامل ہو۔ پڑوسی زبانوں کے بلوچی میں ترجمہ کردہ ادب کے منتخب حصے بھی اس

کورس میں شامل ہوں۔

جو طلبا میٹرک کے بعد ٹیکنالوجی سیکھنا چاہیں، انہیں مشینری اور انجنوں کی تربیت اور تعلیم دی جائے تاکہ وہ صنعتوں کے پیداواری عمل میں حصہ لے سکیں۔ سائنس کے بغیر ٹیکنالوجی اور ٹیکنالوجی کے بغیر سائنس ترقی نہیں کر سکتی۔ جہاں تک سوشل سائنس کے علوم کا تعلق ہے، اِس میں بنیادی علم اکنامکس کا ہے اور اِس کے بغیر پولیٹیکل سائنس، سوشیالوجی، سائیکالوجی اور دوسرے علوم کا درست ادراک ناممکن ہے۔ اُس کی تعلیم ازحد ضروری ہے۔

7- جدید ذرائع کا استعمال:

تعلیم کے علاوہ بھی بلوچی زبان اور ادب کو ترقی دینے کے دیگر ذرائع اور اوزار بھی موجود ہیں، جنھیں زبان کی ترقی کے لیے استعمال کرنا اشد ضروری ہے۔ یعنی موبائل فون، انٹرنیٹ، ٹی وی، ریڈیو، اخبار، رسائل اور ثقافتی ادارے جیسے ذرائع۔ بلوچی زبان چار جگہوں پر قائم ہو جائے تو اس کی بقا، ترقی اور رنگارنگی کی ضمانت ہو سکتی ہے: تدریس میں، میڈیا میں، مارکیٹ میں اور ریاست میں۔ اگر کوئی انسانوں والی ریاست ہو تو اِن سارے ذرائع کو استعمال کر کے بلوچی کو ترقی جا سکتی ہے۔ مگر انسانوں والی ریاست تو لانی پڑے گی، بنانی پڑے گی .... بلوچی زبان کی ترقی کے لیے بھی !!۔

دوسری فصل

بلوچی فوک لور

(مائیتھالوجی میں گندھا ہوا)

بلوچی فوک

ہمارا فوک ادب محبت کی کہانیوں ، ہلا دینے والی جنگی داستانوں، رقص و موسیقی، اور فطرت دوستی سے زندہ ہے۔ یہ بے تُرس و بے طرف ہے۔اس کے سیکھنے کا مدرسہ انسانی باہمی ملاپ و گفت شنید ہیں۔فوک کا مصنف نامعلوم ہے۔فوک ادب موسیقی ہے۔

لیکن، اگر ایک فقرے میں پوچھا جائے کہ بلوچی فوک ادب کی خصوصیت کیا ہے تو اُس کا ایک ہی جواب ہے: مائتھالوجی۔

بلوچی فوک کہانی ،فوک شاعری، ضرب الامثال، استعارے سب کا سب مائتھالوجی ہے۔............جتنی پرانی یہ قوم ہے، اُتنی وارئٹی اس کے فوک ادب کی مائتھالوجی میں ہے۔

البتہ، بلوچی فوک ادب میں موبد کا تذکرہ نہیں ملے گا، حالانکہ آتش پرستی صدیوں تک یہاں کا عقیدہ رہا۔اُس کے بعد بدھ مت آیا مگر آپ کو بھکشو کا تذکرہ بھی ہمارے ادب میں نہیں ملے گا۔حتیٰ کہ ہمارے فوک میں ملّا کا ذکر بھی نہیں ہے۔اور اگر اِکا دُکا کہیں مل بھی جائے تو سو فیصد سمجھ جایئے کہ اُسے منفی انداز میں بیان کیا جارہا ہوگا۔یعنی بلوچ کے ہاں منظّم عقیدہ کبھی قدم جما نہ سکا۔عقیدہ موجود مگر اُس کا نمائندہ یا نمائندگی کا دعوے دار قطعاً قبول نہیں۔عقیدہ بھی بہت کھلا ڈھلا والا ہوگا۔فطرت سے زبردست بے تکلفی، اپنے رب سے بہت گہری دوستی............اور گہری دوستی میں

بلاتکلف اپنی ضرورتوں، حاجتوں کا تذکرہ۔

ہاں ایسے بوڑھے دانا کا تذکرہ جگہ جگہ ملتا ہے جو عقل وفہم سے بھرا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ کرامت و مافوق الفطرت قوتوں کا مجسم نمائندہ ہوتا ہے۔ اسی طرح راکھشس (راکس) کے تذکروں سے ہمارا ادب بھرا پڑا ہے، جو ہمیشہ منفی کردار میں ہوتا ہے۔

زرزوال کا گھوڑا اڑ سکتا تھا، شہ مرید تا ابد زندہ ہے، دزگند (پامسٹ) بڑھیا محبوبہ کو اُس کے محبوب کے آجانے کی تاریخ بتانے کا علم رکھتی ہے، وہاوگند (Dreamer)، جنگ وامن، بادوباراں، قحط ومکڑ کی پیشن گوئی پر مشتمل خواب دیکھتے ہیں۔ بڑھیا اپنی دانائی کے زور سے حاملہ عورت کے پیٹ میں اولاد کی جنس کے بارے میں بتاتی ہے۔ بکری یا بھیڑ کے شانے کی ہڈی پڑھ کر ہرطرح کی مستقبل گوئی کی جاسکتی ہے۔ پرندوں کی آواز اور اُن کی پرواز کی سمتیں خوش یا بدبختی کا اشارہ کرتی ہیں۔ بھیڑ اور گائے سراپا تقدس ہیں، اُن کا احترام کرنے کے درجوں سے نعمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ بیل طاقت واستقامت کا نشان ہوتا ہے۔

تیز شاعری اور اُس کی ہم آہنگ تیز موسیقی جن، جادو، (ہسٹیریا) کے امراض کا آج بھی بہترین علاج ہیں۔

ہماری فوک شاعری اور کہانیاں نظریاتی نہیں لگتیں مگر اگر غور سے دیکھا جائے تو اُن میں تصورات، خیالات، آئیڈیاز ہیں۔ بلوچ فوک ادب حتماً روزمرہ زندگی سے وابستہ رہا ہے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس لیے کہ کلاسیک اور فوک نے وہ بنیادیں مہیا کردی ہیں۔ نیز بلوچ کے سیاسی حالات اس طرح رہے ہیں کہ زندگی ہی ادب اور موسیقی کا مرکزہ رہی ہے۔ یہ انسانی جذبات وکیفیات کا بلا واسطہ اور بے غرض اظہار ہے، جس میں عالمگیر صداقت کا جوہر پنہاں ہوتا ہے۔ عام فہم اور سادہ الفاظ میں زندگی کے جبر ومہر کا سچا اظہار۔

بلوچی فوک ادب میں قحط سالی کے عذاب بہت تفصیل سے بیان ہیں؛ ٹڈی دَل، سیلاب، برادرکش قبائلی جنگیں اور دیگر آلام کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح مسرت وانبساط کے مواقع کو خوب خوب منایا جاتا ہے۔ شادی، نرینہ اولاد کی پیدائش اور دیگر بشری خوشیوں کا دل کھول کر بیان ہے۔

محبت ہمارے فوک ادب کا من بھاتا موضوع ہے۔ اُس کی ساری کیفیات اور رنگوں کا نظارہ ہمارے فوک ادب میں موجود ہے۔ البتہ، یہ گراں ناز وگراں بہا محبت نکوکاری کے دکھاوے سے پاک ہے۔ بلوچ، افلاطونی محبت پر تین لعنتیں بھیجتا ہے۔ فراق کے طویل دکھ وصال کے لمحہ بھر میں نیست ونابود ہوجاتے ہیں۔ ہمارے فوک ادب میں اُن، آپ، حضور نہیں ہوتا۔ مصنوعی حجاب کو گولی ماردی جاتی ہے۔ اُس کی جگہ فطری بھاری پن لے لیتا ہے۔ چنانچہ یہاں محبوبہ کے جسم کے اعضا کا تذکرہ موجود ہوتا ہے۔ مگر بہت بھاری پن کے ساتھ۔ بلوچی فوک (دنیا کا ہر فوک) ادب کبھی لچر، ہلکا اور بازاری نہیں ہوتا۔

بلوچی فوک ادب، وطن سے بے پناہ محبت کا ادب ہے۔ حملہ آور کے خلاف، غاصب کے خلاف، اور بغیر عوامی حمایت کے اوپر سے مسلط شدہ کے خلاف ہمارا ادب ہماری تلوار اور ڈھال کی ہمیشہ راہنمائی کرتا رہا ہے۔

ایک کمال معکوسی ارتقا ہے۔ عورت کی تعظیم کے ناقابلِ بیاں اذکار سے ہوتے ہوتے جب ہمارا سماج پدرسری میں داخل ہوتا ہے تو ہمیں اپنے فوک ادب میں عورت کی نظرانداز گی، اُس پہ ہلکا سا طنز اور پھر بالآخر پست مقامی نظر آتی ہے۔

ہمارے فوک ادب کے بہتے رواں دریا میں نئی نئی باتیں شامل ہوتی رہتی ہیں۔ سائنس کی نئی ایجادات، فلسفہ کے نئے نظریات اس میں جگہ پاتے رہتے ہیں۔

ہماری یہ ادبی وراثت سینہ در سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو ثابت یا تغیر پذیر شکل میں منتقلی ہوتی رہتی ہے۔ موسیقیت میں، اختصار میں، پُر اثر انداز میں۔

فوک کہانی

بلوچ کے ہاں کہانی، شاعری جتنی ہی قدیم ہے۔اور دونوں نے ساتھ ساتھ چل کر الگ صنفوں کی صورت اختیار کرلی۔ حالانکہ دونوں بنیاد میں ایک ہی تھے۔شاعری میں کہانی بیان ہوتی تھی اور کہانی کو شاعری میں بیان کیا جاتا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ بلوچ اپنے بچوں کو پریوں کی کہانیاں سناتے تھے۔تب پریاں آسمان میں ہوا کرتی تھیں۔اسی لیے بلوچی میں اِن کہانیوں کو آسمانک یا آزمانک کہتے ہیں۔

بلوچی ادب کا ابتدائی ارتقا شاید خوبصورت انداز میں ہماری لوک کہانیوں میں موجود ہے۔بلوچی فوک کہانیاں اپنی لطافت،تغزل اور بُنت میں ادب کا حسین ترین حصہ ہیں۔

بلوچوں کی کہانیاں بہت شہرت رکھتی ہیں، جو قصہ گووں کی طرف سے انتہائی مہارت کے ساتھ سنائی جاتی ہیں۔قصہ گو، کا لہجہ زیروبم کے ساتھ،ترنم وگھن گرج کے ساتھ، کہانی کی سچویشن کی مطابقت میں اٹھتا کرتا ہے۔قصہ گو انتہائی مترنم ومتغزل زیروبم کے ساتھ کہانی سناتا ہے۔کہانی اُس کے دل کے اندر گھر بسائے ہوئے تھی۔اب وہ اُسے بچوں کو سنا کر اُس کے لیے کئی نئے گھر، کئی نئے دل مہیا کرتا ہے۔بچوں کا معصوم اور وَرجن دل، جسے خدا نے کہانی سے محبت کرنے کے لیے بے شمار سیل عطا کر رکھے ہیں۔

بوڑھی عورتیں یا مرد بچوں کو رات کو سوتے وقت کہانی سناتے ہیں۔لمبی زمستانی راتیں بھلا بغیر کہانی سنائے گزرتی ہیں!۔بچوں کو تو دنیا بھر میں، کہانی مٹھائی سے بھی اچھی لگتی ہے۔شام ڈھلنے لگتی ہے تو بچے قصہ گو کے گرد چکر لگانا شروع کردیتے ہیں۔ضد کرتے ہیں، منت کرتے ہیں، دھمکی دیتے ہیں، منہ بسورتے ہیں اور قصہ سن کے ہی رہتے ہیں............۔اور قصہ گو کی ادائیگی کا انداز اتنا موٴثر ہوتا ہے کہ اکثر اِدھر قصہ گو نے قصہ شروع کردیا اور اُدھر بچے نے خراٹے لینے شروع کردیے......لوری ہے قصہ۔

ہمارے سماج کی اپنی ترقی سے اس کے ادب میں بھی ترقی ہوتی گئی۔انسانوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل ہوتے رہنے اور دوسرے انسانی گروہوں سے ثقافتی لین دین نے بھی کہانی کو بہت امیر بنادیا۔

مشغول رکھنے کی اس صنف میں دیومالائی باتیں بھی تھیں اور ہماری زمین پہ موجود مادی حقیقتیں بھی۔مگر ایک بات عیاں ہے کہ کہانی کا ایک اخلاقی سبق ضرور نکلتا تھا۔بہادری، سخاوت، قول کی پاسداری، کمزور کی حمایت، فطرت کی آفاقی اصولوں کا احترام............

بلوچ کہانی ہمیشہ سے میوزیکل رہی ہے۔اس کا ابتدائیہ باقاعدہ شعر نما ہوتا تھا۔درمیان درمیان میں بھی کبھی اصل اور کبھی مجہول فقرے بار بار استعمال کرکے اسے دلچسپ بنایا جاتا تھا۔عموماً پسندیدہ فقرہ ہوتا ہے: ''روش باز روش کم، ٹوک بس تکائی مدا گزنت دیر''۔(دن بہت دن تھوڑے، بات ہوتی ہے تیزی کے ساتھ مگر وقت تو گزرتا ہے دیر سے)۔اور اس کا خاتمہ بھی بہت خوبصورت الفاظ میں ہوتا تھا:

قصہ   میں   جھرا
مس   پہ   درا
پکہ   درژ   بر
ما   واڑتہ   میور
بانگھا سُر گذی ایں لڈے گزی
ترا   ڈسّانی

ترجمہ:

کہانی گری انگاروں میں

میں رہا باہر

میوے پک گئے ہیں

ہم نے میورنامی میوہ کھایا

کل صبح سرخ پوش قافلہ گزرے گا

تمہیں دکھاؤں گا

ہماری ابتدائی لوک کہانیوں میں ہمیں زرتشتی عہد سے لے کر بدھ ازم تک جیسا زمانہ ملتا ہے۔ جہاں بس فطرت ہے اور انسان ہیں۔ فطرت کی مہربانیاں ہیں اور انسان ہے اور فطرت کی قہرمانیاں ہیں اور انسان ہیں۔ راکھشس ہیں، انسانی جنگ و استقلال کے مظاہر ہیں۔ ہر شیطانی قوت سے ٹکرانے کے بعد انسان ہی کامیاب و سرخرو ہوتا ہے۔ انسانی آبادیوں سے ہزاروں میل دور عبادت میں مصروف فقیر ہیں، جوگی ہیں۔ بھائی چارہ ہے، باہمی مدد و امداد ہے اور ایک غیر طبقاتی معاشرہ قائم ہے، جہاں نیکی ہی نیکی ہے۔

یہ محض قصے کہانیاں نہ تھیں، یہ انسانی اعلیٰ اقدار کی ترجمان تھیں۔ یہ ظلم کے خلاف، سازش وغیبت و بیگانگی کے خلاف، دھوکہ، جھوٹ، ایذا رسانی اور استحصال کے خلاف ایک مسلسل کمپین تھیں۔ ان میں بھائی چارے کی تلقین تھی۔ سچ، حق، دوستی اور وفا کے تذکرے تھے۔ ان کے اندر انسان دوستی، وطن سے پیار اور فطرت دوستی شامل تھی۔ انکار، مزاحمت اور قربانی کی داستانیں تھیں۔

بعد ازاں جب بلوچ بادشاہی نظاموں کے ساتھ رابطے میں آئے تو پھر یہ لوک کہانیاں اُس عہد کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ بھئی، بادشاہ صرف مغل درباروں میں ظلِ الٰہی نہیں ہوا کرتا تھا، وہ تو اپنا نظریاتی عکس قدیم بلوچی ادب میں بھی ڈالتا رہا۔

قصہ گو ہر فقرہ موسیقیت سے سناتا ہے۔ اور ہر فقرہ اِس لہجے میں سناتا ہے کہ ہر فقرہ پر بچے کا لمبی تان میں ''جی'' بولنا لازم ہو جاتا ہے۔ ورنہ تو قصہ سپاٹ اور بے سُرا ہوگا۔ ہر کہانی کی

شروعات ہمیشہ یوں ہوتی ہے: بیثہ بادشاہے! ، یہاں وہ یوں رک جاتا ہے کہ سننے والا خود بخود کہتا ہے: ''جی''۔

''بادشاہ خدائیں کہ آزماں داشتئی بےتوڑیا''

''جی!''

''ہر کس وتی زمیں ٹوٹا بادشاہیا کنغیں............''۔

''جی!''

ہمارے بادشاہ میں عقل کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ رہی سہی کسر اُس کا دانا وزیر پوری کر لیتا ہے۔ بادشاہ مردانہ وجاہت سے بھی مزین ہوتا تھا۔ جواں مردی، شمشیر زنی، گھڑ سواری، عاشقی، انصاف، بہادری، ہمت، اور قوتِ فیصلہ اس کے خدائی داد ہوا کرتے۔ ساری قسمت اسے میسر تھی۔ وہ کرامت سے بھرا ہوتا تھا۔ لشکر، ہتھیار، ڈھول دھمامہ...... الغرض ہر لحاظ سے بادشاہ، ہیرو ہوتا تھا اور بلوچی لوک کہانیاں گہرائی سے اس کے اوصافِ جلیلہ بیان کرتی رہتی ہیں۔

بلا شبہ اس کے باغی بھی ہوتے ہیں، جو اُسے للکارتے ہیں، اُس کی حکمرانی کو چیلنج کرتے ہیں۔ مگر بلوچ کہانی کار اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہ بادشاہ، کا زیادہ ہم درد رہتا ہے اور بادشاہ اُس کا ملجا و ماویٰ۔ بادشاہ واقعتاً باپ کی طرح کا طرزِ عمل رکھتا ہے اور رعیت کو واقعی اولاد گردانتا ہے۔ لہٰذا وہی اس کا ہیرو رہتا ہے۔ وہ جو باغی نوجوان ہوتا ہے، اس کے پاس کوئی عوامی پروگرام نہیں ہوتا۔ بس ایسے ہی باغی ہوتا ہے۔ سوچ میں نابالغ، ناتجربہ کار...... پھر یا تو شکست کھا کر وہ بادشاہ کا مطیع ہو جاتا ہے یا، کامیابی کی صورت میں خود ظلِ الٰہی بن جاتا ہے۔ اُس دور کے کہانی ساز کو اور کوئی متبادل میسر ہی نہیں تھا۔ بادشاہت ہی طرزِ سلطنت ہوتا ہے۔ وہ اور کچھ نہ دیکھتا ہے، نہ سوچ سکتا ہے۔ ساری کامیابیاں بادشاہ کی اور ساری بدبختیاں باغی کی۔ اور دونوں مظاہر کی منظر کشی بہت ہی خوبصورت ہے۔ مثالیں، الفاظ، فقروں کا حسن بس دیکھتے ہی رہ جایئے۔ بے مثال، لاثانی......

چونکہ بلوچ ہمیشہ سے قبائل میں منقسم رہے ہیں اور ہر قبیلہ ایک قوم کی طرح آزاد اور خود مختار رہا ہے۔ اس لیے یہاں بلوچوں میں بادشاہ ہمیشہ سردار کے معنوں میں لیا جاتا رہا ہے۔

ہماری لوک کہانیوں میں نیچر کے خلاف انسان کی جدوجہد بھی موجود ہے۔ بادشاہ اپنی اُرد کے ساتھ جنگل جاتا ہے اوراس سارے سفر میں نیچر اور انسان کی لڑائی موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح لکڑہارا اپنے حوالے سے نئے نئے اوزار اور وسائل کے ساتھ نیچر پر فتح مند ہوتا جاتا ہے۔ کسان کاشتکاری کی نئی نئی اقسام اور آلات وضع کرتا رہتا تھا اور ہر لحاظ سے فطرت کو اپنا مطیع بناتا جاتا ہے۔ چرواہا جنگلی حیوانات کو پالتو بناتا جاتا ہے، اور درندہ کو مطیع کر کے رکھوالا کتّا بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں (بھیڑیوں، گیدڑوں، لومڑیوں، گوحوں) کے خلاف نئی نئی ٹیکنالوجی سے مسلح ہوتا رہتا ہے۔ وہ گھاس، اس کی اقسام اور چراگاہوں کے موجودگی کے علوم حاصل کرتا جاتا ہے۔

اس دور کا کہانی کار درندوں، پرندوں، درختوں اور پتھروں کو بھی اپنی کہانی کا کردار بناتا ہے، ان سے باتیں کرواتا ہے، اُن سے انسان کی طرف داری یا دشمنی کرواتا ہے، انہیں آپس میں محبت یا عداوت میں دکھاتا ہے۔

بعد کی لوک کہانیوں میں وطن، آزادی، قبضہ گری، اور حب الوطنی کی باتیں نظر آتی ہیں۔ گو کہ ابھی تک وطن بادشاہ کا ہی ہے مگر کہانی کار اپنی اور اپنے عوام کی شناخت بھی کچھ کچھ اپنی سرزمین سے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ادھر ہی ہمیں غلام اور لونڈی کا ذکر بھی ملتا ہے اور اُن کی زار حالت کا تذکرہ بھی۔ مدھم، دھندلا............

بلوچی فوک کہانیوں کو سب سے پہلے انگریز نے جمع کر کے چھاپا، ڈیمز قائد تھا۔ بعد میں کئی جلدوں پر مشتمل یہ کہانیاں بلوچی اور اردو میں چھاپ دی گئیں۔

حال حوال

خبروں کا تبادلہ انسان کی ایک عالمگیر عادت ہے۔ انسان اپنی دلچسپی کے امور کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیشہ سے کوشاں رہا ہے۔ ''حال حوال'' حیوان اور انسان کی سرحدوں کو واضح کرنے کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھنے والی چیزوں میں سے ایک ہے۔ اگر حال حوال اور اطلاعات کا تبادلہ نہ ہوتو ترقی یافتہ ساری انسانیت لکڑ بھگڑوں کی ٹولیوں میں بدل جائے۔ بے خبری، جانوری ہے۔

خانہ بدوش اور مال داری کے سخت ماحول میں، وسیع طور پر دور دور بکھرے ہوئے بلوچ، صدیوں سے اپنی بقا کے لیے کمیونی کیشن کے ایک عوامی نیٹ ورک پر انحصار کرتے ہیں۔ اطلاعات کے اس نیٹ ورک کو' حال حوال'' کہتے ہیں۔ بلوچ عوام عمومی طور پر سیاسی فیصلوں کے ساتھ ساتھ چراگاہوں، پانی کی جگہوں، اور دوسرے خانہ بدوش لوگوں اور کیمپوں کی نقل وحرکت کے بارے میں اطلاعات سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جوں جوں انسان ترقی کرتا چلا جاتا ہے، حال حوال اسی قدر مخصوص اور سپیشلائزڈ ہوتا جاتا ہے، اس کے رسل ورسائل کے وسیلے نازک تر ہوتے جاتے ہیں، خبر رسانی تیز رفتار ہوتی جاتی ہے۔ چیخ وپکار کر کے اپنی بات دوسرے تک پہنچانے کے ابتدائی طریق کی

بجائے وائرلیس اور ٹیلی فون آجاتے ہیں۔ دور کی خبروں کو جمع اور نزدیک لا کر ٹی وی اور ریڈیو انھیں کان میں کھسر پھسر کر کے انڈیل جاتے ہیں۔ ٹیلی پرنٹر، اخبارات اور رسائل بڑی پیشانی والی سائنسی دنیا کی خوشخبریاں لاتے لے جاتے ہیں۔ لیکن جب ٹکنالوجی کی یہ نعمتیں عوام الناس کے لیے نہ ہوں تو وہ اپنا متبادل نظام رائج کر دیتے ہیں۔ اور جہاں جہاں یہ سہولتیں چلی گئی ہیں، وہاں حال حوال کی رسم بہت لاغر ہوتی جا رہی ہے۔ مکمل ختم تو نہ ہوئی لیکن بہت مختصر ضرور ہوئی (دو ٹپائی حال)۔

گزیٹئر حال کے بارے میں لکھتا ہے کہ، ''یہ سختی سے اور مکمل طور پر ایک بلوچ رسم ہے''۔(1) بلوچ کا حال حوال اس کی اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے۔ بلوچ کو حال احوال کی ایجاد کے زمانے میں نہ تو کسی خلائی جہاز میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا، نہ اُسے اُس زمانے میں بنڈوگ کانفرنس کی شرائط یاد رکھنی تھیں اور نہ ہی ریسرچ کی دنیا میں پیش رفتوں کا جائزہ لینا تھا۔ اس نے تو مسافر اور راہی سے یہ معلوم کرنا ہوتا تھا کہ وہ کس سے ملا، اُس کا سفر کیسے کٹا، مویشی کا نرخ اور ریٹ کیا چل رہا ہے، غلہ کس بھاؤ میں مل رہا ہے، فصل کی حالت کیسی ہے، گُڑ اور پتی کی قیمت کیا ہے، سردار اور سرکار کی سیاست وسیاحت کی کیا خیر خبر ہے، بیماریوں کی آمد ورفت، 'بھائی بندی' کے جھگڑے جھمیلے، 'چچا زادوں' کے آپسی قتل وقتال، 'ہم قوموں' والی سیاسی وسیاہکاری کی چال و رفتار............ یہ تھیں بلوچ کی آنکھوں کی منزل وبصیرت کہ یہی اس کی ضرورتیں تھیں۔ ادب وفن تو اپنے لوگوں کی روحانی ومادی ضرورتوں سے ہی پھوٹتے ہیں۔ اور بلوچ خانہ بدوش کے لیے سب سے ضروری بات تھی بادل برسات کی، چراگاہ وگھاس کی۔ وہ آج بھی باقی ہر حال وخبر کو بے کار سمجھ سکتے ہیں مگر مال اور مال داری، لہٰذا بارش کے بارے میں کسی بات کو چھوٹی بات نہیں گن سکتے۔ مال داری اس کی ضرورت اور اس کی زندگی ہے۔ اس کے بارے میں ہر بات کو وہ دل کے کانوں سے سنتا ہے، اس انداز میں کہ اس کا منہ کھلا ہوا ہوتا ہے، آنکھیں حال سنانے والے پر ٹکی ہوتی ہیں اور وہ مکمل طور پر 'ہمہ تن گوش' اور بت کی طرح ساکن ہوتا ہے۔

حال حوال ایک عربی لفظ ہے جس کا مطلب ہے: خبروں کا بیان کرنا۔ مگر خود عرب، دنیا

کے سب سے بڑے خوابیدہ اور بے خبر لوگ ہیں۔ حاکموں کے لیے بہت اچھا ہے کہ عرب عوام نے خود کو محض ''اھلاً وسھلاً مرحبا'' تک روک رکھا ہے۔ اگر حال حوال وہاں بھی موجود ہوتا تو پھر تپتے ہوئے ریت کے ٹیلوں کے کالے سائے اتنی دیر تک دوام نہ پاتے۔

حال حوال کی رسم سوشلائزیشن پراسیس کا اہم حصہ رہا ہے۔ لازم ہے کہ حال حوال خود بلوچ کی طرح سچ ہو، اُس کی گُندھی ہوئی خوبصورت داڑھی کی طرح حسین ہو، اس کی روح کی طرح سادہ اور اس کے دل کی طرح صاف ہو۔ حال حوال کا اصل مطلب تازہ ترین خبر سے باخبر ہونا ہوتا ہے۔ اس کام کو ترتیب دینے، اسے باقاعدہ بنانے اور اسے مستقل بنانے ہی کو تو رواج کہتے ہیں۔ یوں حال احوال کرنا بلوچ کا رواج بن گیا اور رواج کی پیروی کرنا ہر 'شلوار پہننے کی عمر کے' مرد پر فرض ہوتا ہے۔ لہٰذا نہ تو حال طلب کرنا کوئی شرم کی بات ہے اور نہ حال نشر کرنا کوئی احسان یا بوجھ تصور ہوتا ہے۔ حال ایک امانت ہے جسے آگے ہی پاس کرتے رہنا چاہیے۔ اور یہ ٹریفک یک طرفہ نہیں ہوتی۔ یہ ایک قسم کا تبادلہ ہے اور اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان انفارمیشن سبک رفتاری سے پھیل جاتی ہے۔ گوکہ حال حوال کی سرحدیں اور رقبہ بہت محدود ہوتا ہے، مگر پھر بھی لوگ اس کی وجہ سے تازہ ترین تبدیلیوں سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ اور انفرادی طور پر، یا مل کر React کرتے ہیں۔

جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے بلوچ اپنی ضرورتوں کی خبریں سننے اور انہیں ایکسچینج کرنے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ یعنی حال حوال کی خاطر اُسے ایک نادیدہ اور بھوکی قوم کہا جا سکتا ہے۔ یہ بھوک قرنوں سے اس کے اندر موجود ہے۔ یہ پیاس اس کے جینز کے اندر ٹھاٹھیں مارتی ہے۔ اس کے دل کی رگ رگ پیاسی ہے حال حوال کے لیے۔ اصل میں یہی بھوک ہے جو بلوچوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کسی راہگیر کو 'بے حال' نہیں چھوڑتے۔ ہر سلام کہنے والے شخص کا حال لینا لازمی ہے، وگرنہ سخت بے رواجی ہو جائے گی۔ سلام کہنے والے شخص کے تئیں اس کا حال طلب نہ کرنا گویا اُس کو کم تر درجے کا شخص قرار دینا ہوتا ہے، اُس کا استحقاق مجروح کرنا ہوتا ہے۔ جس کے بڑے تباہ کن نتائج نکلتے ہیں۔ لہٰذا سارا بلوچ پابند ہے کہ جب باہر سے آنے والا شخص کہے:

''سلامالیک''

تو وہ جواب دیتا ہے، ''والیکم سلام، بیاٹ و بیادشا تکئے''

''دارہ باشئے، مہیرا'' سلام والا شخص کہتا ہے۔

''دارھئے، خو شئے، ھیر بیث، ھیر میر......تہ دارھئے خو شئے''

''ھیر بیث، ھیر میر''

اس ''دوبرہ دارہی'' یا خیر خیریت پوچھنے کی ترتیب بھی بالکل میوزیکل انداز میں وضع کی ہوتی ہے۔ خاص کر، اگر لوگ زیادہ ہوں تو ایک ہی آواز میں یوں بولتے ہیں جیسے ساون کے بادل گرجے ہوں۔ بلوچ کا خیریت پوچھنا بھی گویا ایٹمی دھاکہ ہو، دبدبہ سے بھرا ہوا۔ کسی دوسرے سماج میں تحکم اور فوجی کاشن جیسا خیریت پوچھنے کا انداز شاید ہی ہو۔

سختی سے پابندی کیا جانے والا ایک رواج یہ ہے کہ خیریت پوچھنے کے بعد میزبان اس سے پیاس کے بارے میں لازمی طور پر پوچھتا ہے۔ اور پانی پلانے کے بعد اس سے حال مانگتا ہے، تبھی وہ اپنی خبریں شروع کرتا ہے۔

سلام اور خیر خیریت پوچھنے کا سلسلہ ہر ہر قدم پر ایک قاعدے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً سوار شخص پہل کر کے پیادہ کو سلام کہتا ہے، بلندی کی طرف سے اترائی کی طرف آنے والا شخص سلام میں پہل کرے گا۔ آنے والا شخص بیٹھے ہوئے شخص کو سلام کہتا ہے۔ بلوچوں میں سلام کہنے کے لیے کم سنی اور بزرگ سنی کی اہمیت نہیں ہے۔ عورت سے سلام اور حال حوال نہیں ہوتا۔ سلام کہنا اگر رواجاً لازم ہوتے ہوئے بھی نہ کہا جائے تو احتجاج کا حق حاصل ہے حقدار کو۔ اور احتجاج کی حد اور سرحد اور انداز و شمار بلوچ وطن میں متعین نہیں ہے۔

حال لینے اور نہ لینے کی سنت اور فرض اس قدر باریکی سے بنائے گئے ہیں کہ آدمی ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ بلوچ اس میں کوتاہی کرنے پر دو دن بھی نہیں بخشتا۔ بلوچ کے ہاں 'قانون دے ہتھ' کچھ زیادہ ہی لمبے ہوتے ہیں۔ سرکار کچھ پوچھے نہ پوچھے، سردار کچھ پوچھے نہ پوچھے مگر بھائی، چچازاد بھائی، پڑوسی وغیرہ کسی صورت معاف نہیں کرتے۔

ایک رواج یہ ہے کہ سلام کہنے والے شخص کا حال لینا ہر حال میں ضروری ہے، خواہ آپ کو حال اور خبر کی ضرورت ہو یا نہ ہو، یا حال سنانے والے شخص کا موڈ ہو یا نہ ہو، رواج تو بہرصورت پورا کرنا ہی ہے۔ گھنٹے دو گھنٹہ کے لیے بھی باہر گئے تو واپسی پر خبروں کا بلیٹن ضرور ہوگا۔ اس رواج کو اس قدر دلائل کے زور سے مضبوط بنایا گیا ہے، اس قدر قصے بنا بنا کر بلوچ رواجوں کو مستحکم کیا گیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک قصہ یہ ہے کہ ایک شخص محفل میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے باہر چلا گیا پیشاب کرنے۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو محفل کو سلام کہا۔ اب چار پانچ منٹ کے فراق کا کیا حال حوال؟۔ لہٰذا لوگوں نے اس سے حال نہیں لیا۔ اس شخص نے احتجاج کیا کہ میرا حال کیوں نہیں لیتے؟۔ محفل کے لوگوں نے کہا کہ ''بھائی ابھی ابھی تو یہاں سے گئے ہو، کیا حال لیں؟۔ تمہارے پاس کونسا دہلی کا کوئی حال ہے؟''۔ بہرصورت اس کا حال لیا گیا۔ اس نے حال میں بتایا کہ ''میں پیشاب کرنے گیا تو کھڈے میں ایک لاش پڑی دیکھی''۔ کم آبادی والے بلوچستان میں لاش بہت بڑی خبر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ مثال صدیوں سے ایک ڈھال بن گئی، حال حوال والے رواج کے لیے۔ اگر کوئی حال نہ لے تو فوراً اس قصے کو دہرایا جاتا ہے۔ لہٰذا 'نظریہ پاکستان' کی خلاف ورزی کون کرسکتا ہے۔ سبز رنگ کے طوطے کی طرح سر جھکا کر بولنا ہوتا ہے، ''جی حالاں دئے..........''

ایک، دو یا تین مسافر یا راہگیر کئی اطراف سے بہ یک وقت آجائیں تو ''پہلے آؤ، پہلے پاؤ'' کے اصول پر، باری آنے پر حال حوال دیتے جاتے ہیں۔ میزبان بغیر کسی رکاوٹ کے ہر ایک کو Deal کرتا رہتا ہے۔ البتہ جواب میں میزبان کا حال تو ظاہر ہے کہ ایک ہی شخص نے لینا ہوگا۔ رواج یہ ہے کہ حال لینا آخری شخص کا 'حق' بن جاتا ہے۔ اگر وہ خود خدائی خدمت گار بن کر کسی اور کو اپنا حق عطا کرے تو ٹھیک ورنہ سارے لوگوں سے اجازت لیتا ہے اور جوابی حال میزبان سے وصول کر کے ''رسید لکھی''۔ اب جس وقت یہ بہت ہی فارمل فریضہ پورا ہو جائے تبھی دونوں فریق ذرا سا Relax ہو جاتے ہیں۔ گردن کی پھولی ہوئی رگیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہیں، چہرے کا سرخ ہونا کم ہونے لگتا ہے۔ آسمان واپس اوپر چلا جاتا ہے اور زمین واپس نیچے آتی ہے، ہنگامی حالت ختم ہو جاتی ہے، چلم پیا جاتا ہے۔ حال حوال کا ختم ہونا سمجھو کہ جنگ میں ذاتی

بہادری دکھانے کا مرحلہ ہوتا ہے اور خیر خیریت سے جب یہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے تو ظاہر کہ آدمی فتح کے احساس میں شکر اور چین کا سانس لیتا ہے، اس لیے کہ بہت دفعہ کئی لوگ بڑے مجمعوں کے اندر بالکل بند ہو جاتے ہیں۔ وہ حال کہنا شروع تو کرتے ہیں۔ مگر پھر اچانک ان کی بولتی بند ہو جاتی ہے اور وہ ایک لفظ تک نہیں کہہ سکتے۔ بہت سے سفید ریش افراد، باتونی، گپ شپی، محفل و دیوان کے لوگوں کا منہ اس طرح بند ہو جاتا ہے جیسے مری میں میھکانڑیں کے جادو سے دشمن کی بندوقیں چلنا بند ہو جائیں۔ اچھا، فرض کرو کہ الف نے ب کو اپنا حال دیا۔ مگر ب سے حال لینا بھول گیا، تو صاحب اسے رواجاً ایک دنبہ جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ یا پھر صدق دِل کے ساتھ بلند آوازی سے ایک غیر مستحسن آواز، غیر مستحسن جگہ سے نکالنی ہوگی۔ تاکہ ساری دنیا کو خبر ہو جائے۔ (بلوچ کے استحقاق کے مجروح ہونے کی اتنی بڑی سزا!)۔

بلوچ کا حال شروع سے لے کر آخر تک خدا کی بزرگی، نعمتوں پہ شکر، خیر کی دعا کے کلمات اور جی و جان سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ بلوچ، آرٹ کے اس ٹکڑے میں بہت ہی خوبصورتی اور ترتیب کے ساتھ الفاظ کو پروتے جاتے ہیں۔ مثلاً 'جی خدا کو جس نے نبی پیدا کیا'۔ 'جی خدا کو جو لائق ہے جی کے' وغیرہ۔ خیر کا ورد سمجھ میں آجاتا ہے کہ جنگ بلوچ کی سب سے بڑی دشمن ہے، اور اُس کا Antidote خیر ہے۔ اس لیے بلوچ کے حال حوال سے اگر لفظ 'خیر' نکال دیں تو پھر گویا کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ بلوچ جس قدر بھی خیر اور امن مانگے، خیر اور امن اسی قدر دور بھاگتے جاتے ہیں۔ بلوچ کہتا ہے 'روٹی'، روٹی نایاب ہوتی جاتی ہے۔ بلوچ کہتا ہے 'سُکھ'، سکھ قریب نہیں پھٹکتا۔ بلوچ کہتا ہے 'بارش'، بادل موٹی بدصورت بڈھی عورت کی طرح کمر لچکاتے پیٹھ دکھاتے ہیں..........شالا منظور ہوں ہماری دعائیں اور ہم پہ امن کی نہ تھمنے والی بارش دائمی طور پر رم جھم کرتی رہے۔

حال حوال محض خبر اور اخباری قصہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ادب اور کلچر کا ایک بڑی شان والا آئینہ ہے۔ بلوچ اپنے حال کو شاعری کے انداز اور ادبی خوبصورتی کے ساتھ، اپنی آواز کو موسیقیت بھرے انداز میں زیر و بم دیتے ہوئے ایک خاص آہنگ پیدا کرتے جاتے ہیں۔ سانس لینے کے

لیے وقفہ کو اس انداز میں استعمال کرتے ہیں کہ حال لینے والا ہارمونیم کے انداز میں خود بخود کہہ دیتا ہے۔ 'جی، ی، ی..........'۔ الفاظ کا انتخاب، ان کی ترتیب، ان کی ادائیگی میں آواز کی بلندی پستی، حال حوال میں روانی اس قدر میوزیکل اس قدر سٹائلش اور اس قدر رنگین ہوتے ہیں جتنا کہ ایک اچھی، دوڑنے والی، اصیل گھوڑی ایک لمبے میدان میں سے دوڑتی اِتراتی آتی ہے۔ اس کے سموں کی ٹاپیں، اس کا آگے کا نکلا ہوا سینہ، گردن اور دُم کا خم، ہر ایک ادا کی اپنی خوبصورتی، اپنی رنگینی، اپنی جاذبیت ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہے ہمارا ''حال حوال''۔

بلوچ کا حال حوال 'نظریۂ ضرورت' کے تحت طویل یا مختصر ہو سکتا ہے۔ اگر تو دونوں فریق جلدی میں ہوں تو بس 'دو جملوں والا' حال طلب کیا جاتا ہے۔ اور اگر ٹائم بہت ہے تو حال حوال، خبروں کے تبادلے کے علاوہ 'ٹائم پاسی' کا کام بھی بہترین انداز میں دے گا۔ حال حوال اگر سردار اور عام بلوچ کے درمیان ہو تو عام آدمی اپنے حال احوال کو اچھی طرح طول دیتا ہے۔ الفاظ تولتے ہوئے ادا کرتا ہے اور ہر تفصیل اور وضاحت بیان کرتا جاتا ہے۔ لیکن سردار انتہائی مختصر حال دیتا ہے۔ عام آدمی تو سردار، وڈیرہ اور معتبر کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ اس پہ تو لازم ہے کہ ہر بڑی چھوٹی خبر 'انھی' کو سنا دے۔ مگر 'مالک' کو تو ایسی کوئی مجبوری نہیں۔ وہ بہت آہستہ آہستہ آواز میں دو جملوں میں حال ختم کر دیتا ہے۔ ہاں...... عام آدمی کو اللہ کے عذاب نے جکڑ رکھا ہے قرنوں سے، اس پہ لازم ہے کہ پسینہ میں شرابور اپنی پوری صلاحیتیں یہیں بروئے کار لائے اور اس چڑھائی کو طے کرے۔ موت آئے طبقاتی نظام پہ!۔

ہمارے حال حوال کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ گھنٹہ بھر لمبے حال حوال کو شروع کرتے وقت بلوچ کہتا ہے، 'میں نے خبر کوئی سنی نہیں' یا 'میں کسی سے ملا نہیں'۔ (ما چی نیش کشہ، ما کز نئیشہ)۔ مطلب تو یہ ہے کہ میرے پاس سنانے کو کوئی حال نہیں ہے مگر پھر بھی وہ پورے ایک گھنٹے تک تازہ اور ضرورت کی خبریں براڈکاسٹ کرتا جاتا ہے۔ اور وقفے وقفے میں کہتا جاتا ہے کہ 'میں نے کوئی خبر نہیں سنی'۔

بڑے بڑے مجمعوں، محفلوں، دیوانوں کے اندر حال لینا کسی بھی فرد کے لیے

اعزاز اور سٹیٹس کی بات ہے، اور حال دینا ایک ناموس کی بات ہے۔ ایسی جگہوں پر ہر عام و خاص آدمی نہ تو حال دے سکتا ہے اور نہ لے سکتا ہے۔ ایسی جگہوں پر حال حوال کرنے والا شخص حکمران خاندان کا فرد ہوتا ہے۔ گو کہ ہر چرواہا حال حوال کا ماہر ہوتا ہے، مگر قبائلی ہیرارکی کی موجودگی میں وہ اس وقت صرف 'جی آپ' کہے گا جب 'بڑا' اُسے کہتا ہے کہ 'تمہیں بھی حال حوال کرنے کی پیشکش کی جاتی ہے'۔

بہر حال بلوچ عوام دور دراز آباد ہیں، ملکی، علاقائی اور بیرونی دنیا کے حالات سے باخبر ہونے کا کوئی اور وسیلہ نہیں۔ نہ چھٹی، نہ ٹپال، نہ ڈاک نہ تار، نہ انٹرنیٹ و موبائل اور نہ ٹی وی۔ لہٰذا عوام نے اپنا متبادل راستہ بنا دیا جس کا نام انہوں نے حال حوال رکھا۔ اس کے بلٹن دن میں بہت بار بہت سے سٹیشنوں سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اور میر مٹھا خان مری نے برحق طور پر اس رسم کو ''کثیر الورد'' کہا۔(2) مگر یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ حال حوال کی رسم صرف اور صرف مرد کی ہے۔ عورت نہ تو حال لینے دینے کی حقدار ہے اور نہ پابند۔

اگر ایک شخص حال حوال کے وقت موجود نہیں ہو اور بعد میں آ جائے تو وہ حال حوال کے حق سے محروم نہیں ہوتا۔ جتنے لوگ آتے جائیں گے حال حوال کی کاروائی چلتی رہے گی۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ اب حال حوال کوئی اور شخص کرے گا جو کہ سابقہ سیشن میں موجود تھا۔

آج جبکہ سولائزیشن بڑھتی جا رہی ہے، انفارمیشن کے سائنسی وسائل پھیلتے جا رہے ہیں، تعلیم زیادہ ہوتی جا رہی ہے اور ترقی تیز رفتار ہوتی جا رہی ہے، اسی لحاظ سے حال حوال کا پرگنج خزانہ گھٹتا جا رہا ہے۔ حال مختصر تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ ''زال پول'' (عورت والی پوچھ گچھ) لیتا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک ادبی اور ثقافتی دریا خشک ہوتا جا رہا ہے۔ یہ حال حوال ''خیر'' کے الفاظ سے شروع ہو کر خیر ہی کے کلمات پر ختم ہوتا ہے۔ جہاں Passive نہیں بلکہ جوش اور جاندار انداز میں دونوں فریق حال حوال کو اختتام بخشتے ہیں۔ حال دینے والا آخر میں کہتا ہے:

''اور خیر ہے''

حال لینے (سننے والا) لمبی تان میں جواب دیتا ہے:

''خیر ہو جائے، کہ اچھا میوہ بھی خیر کا ہوتا ہے!''

(اس بلوچ جملے کا نعم البدل تو لا کر دکھاؤ)۔

موسیقی

بلاشبہ موسیقی تمام اقوام اور بالخصوص بلوچ معاشرے میں اونچا مقام رکھتی ہے۔ یہ محض گانے کی ساتھی کی حیثیت سے، اور رقص کے لیے آہنگ پیدا کرنے کے لیے ہی نہیں بجائی جاتی بلکہ یہ تو نفسیاتی بیماریوں کے علاج کے بطور بھی استعمال ہوتی ہے، اور خوب استعمال ہوتی ہے۔موسیقی، رقص، اور گانے رومانس، ہیروازم اور آزادی کی محبت کے اظہار کے ثقافتی ذرائع ہیں ہی..........(3)۔

آئیے ذرا اُس موسیقی اور اُس کے آلات کا مختصر تذکرہ کرتے چلیں جس کے بغیر بلوچی شاعری، بلوچی کلچر اور بلوچ کی زندگانی کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔

موسیقی اور موسیقی کے آلات دراصل اس شاعری کے ساتھی ہوتے ہیں جس میں بہادروں کے قصے بیان ہوتے ہیں، حسن وزیبائی کے مجسمے تراشے جاتے ہیں، وفا کی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں، جفا کی دل سوز تفصیلیں ہوتی ہیں، نازک رفیقوں کی جلا ڈالنے والی جدائی ہوتی ہے، سورماؤں کی موت پہ آنسو بہائے جاتے ہیں، اور مرشد ومحبوبہ کی توصیف ہوتی ہے۔

بغو (Bagho)

یہ واضح طور پر چرواہے کا 'ساز' ہے۔ گلے سے خوش الحانی کے ساتھ 'دستانغ' کی مطابقت

میں آواز نکالی جاتی ہے اور ہاتھ کی انگلیوں کے سرے سے نرخرے کے اوپر بہت آہنگ اور موسیقیت سے سٹرائیک کیا جاتا ہے۔ بغو میں گلہ، دہن اور انگلیوں کی سنگت شامل ہوتی ہے۔ بیابان ہو، پہاڑ ہوں، مویشیوں کی بجتی گھنٹیاں ہوں، پہوال کا بغو ہو اور اس کی بازگشت ہو تو سمجھیے آپ بلوچستان میں ہیں۔

شفیلی (Shafeely)

ہمارے چرواہے کی بانسری ہوتی ہے۔ مگر بلوچ کی شفیلی بیرونی دنیا کی بانسری سے فرق رکھتی ہے۔ یہ پانی کی عام جھاڑی 'کوندر' (سرکنڈے) سے چاقوں سے کاٹ تراش کر بنائی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی 'سرکاری' بانسری سے ذرا کم ہوتی ہے۔ اسے نڑ کی طرح سر کی طرف سے پھونک مار کر بجایا جاتا ہے، نہ کہ بانسری کی طرح درمیان کی کسی سوراخ میں پھونک مار کر۔

ڈؤو (Dau)

یہ نڑ سے باریک ومختصر مگر شفیلی سے لمبا اور موٹا ہوتا ہے۔ اس کی آواز بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ سرّی گا بھی سکتا ہے۔ ڈؤو بھی لوگ مقامی طور پر بناتے ہیں۔ یہ دستانغ کا انسٹرومنٹ ہوتا ہے۔

نڑ (Narh)

موسیقی کے اِس آلے کو شہروں سے خریدا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ صرف مچ کے مقام پر پیدا ہونے والے کوندر سے بنایا جاتا ہے۔ جس کی لمبائی پونا گز اور قطر آدھ انچ ہوتا ہے۔ کپڑے کے رنگین پوش کے اندر چرب کردہ نڑ چرواہے کے شوق کی تکمیل کا زبردست وسیلہ ہوتا ہے۔ بس صرف سُرّی کی کمی ہے جو کہ اس کے ساتھ ساتھ گائے۔ اب یا تو کوئی دوسرا چرواہا ملے جسے سُر گانا آتا ہو، یا پھر کوئی مہمان مسافر ایسا ملے جو سر گانا جانتا ہو، تو پھر تو جنگل میں منگل ہوجاتا ہے۔ بلوچستان کا پہاڑی وطن، دور افتادہ آبادیاں.......... یہاں میلہ تو کبھی کبھی نصیب ہوتا ہے۔ مگر جب ہوتا ہے تو پھر جم کے ہوتا ہے۔

نڑسر محض دل خوش کرنے، وقت گزاری کرنے اور محظوظ ہونے کے لیے نہیں ہوتا۔ یہ

پورے بلوچ سماج کا احاطہ کیے رہتا ہے۔ یہ ہمیں سامراج دشمنی کی داستانیں سناتا ہے، مناظرِ فطرت سے لطف اندوز کرتا ہے، جنگ وننگ کی خبریں سناتا ہے، حسن ومہر کے گیت عطا کرتا ہے، ہماری مائتھالوجی سے ہماری زبان وثقافت کی بنیادیں دکھاتا ہے، حرب وطرب کا سامان کرتا ہے، توصیف وطعن کی روایتیں تعمیر کرتا ہے۔

اس کے موضوعات 'دستانغ' کہلاتے ہیں۔ ہر دستانغ بجانے گانے کا طرز الگ ہوتا ہے۔ ابھی حال تک بلوچستان میں جو استاد اور نامور ناڑی پیدا ہوئے اُن میں مینگلا اور بجار مشہور ترین رہے۔

بین (Been)

اسے سندھی میں الغوزہ کہتے ہیں۔ اور بلوچستان کے کچھ علاقوں میں اسے 'دونلی' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شاید سریندا کے بعد سارے بلوچی سازوں میں سے میٹھی اور شیریں ترین ہوتی ہے۔ باید ہے کہ یہ بچوں اور بڑوں کو سکھایا جائے تاکہ بلوچستان کا یہ زبردست میلوڈی والا ساز بلوچستان کے کوہ ودمن کا زیور بنا رہے۔

اس پر سُر کے ساتھ دستانغ گائے جاتے ہیں۔ سُر کے اسے الگ بھی بجایا جاتا ہے۔ دُھن بھی ضروری نہیں کہ دستانغ والی ہوں۔ کچھ ایسی دُھنیں بھی اس پہ بجائے جاتی ہیں جن کے ساتھ شاعری گائی نہیں جاتی۔ انہیں ''لہرو'' کہتے ہیں۔

شینزار (Shenzaar)

یہ تو ہر انسان کے لیے سب سے سستا اور زیادہ بجنے والا ساز ہے۔ یہاں آلہِ موسیقی خود آپ کے اپنے ہونٹ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے پھونک کو کنٹرول والے انداز میں ہونٹوں کو سکیڑ کر ایک بنے سوراخ میں سے گزارتے ہیں۔ جو آواز نکلتی ہے اُسے موسیقی میں ڈھالنے کے لیے نچلے جبڑے اور زبان کو بہت ہی استادانہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

چرواہا تو مزدور ہے۔ اس کی محنت ہی اسے زندہ رکھتی ہے......اس کے وجود کو بھی، اور اس کے دل اور روح کو بھی۔ محنت انسان کو خود مجبور کرتی ہے کہ اپنی روح اور فن کی ہمیشہ آبیاری

کرتا رہے۔ اور اگر چرواہے کی کوئی محبوبہ بھی ہو تو اس کے منہ کو روس اور امریکہ بھی سیٹی بجانے سے نہ روک سکیں۔

دمبیرو (طنبورہ) (Dambeerav)

یہ بہت خال خال نظر آنے اور استعمال ہونے والا میوزیکل انسٹرومنٹ ہے۔ اب تو اس کے مخصوص فنکار اور گھرانے بن چکے ہیں۔ اسے بجانا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس قدیم انسٹرومنٹ میں سُر کی طرح آواز بھاری اور موٹی کر کے گانا نہیں پڑتا۔ بلکہ عام گانے کی طرح گانا ہوتا ہے۔ مشرقی بلوچستان میں اس کا استعمال بہت ہوتا ہے۔ اب یہ ہر چرواہے کا ساز نہیں رہا بلکہ اب یہ مخصوص اور تربیت یافتہ فنکاروں سے مخصوص ہو چکا ہے۔ یہ ساز پرپغ نامی درخت سے بنایا جاتا ہے۔

سریندا (سروز) (Sareenda)

یہ بہت ہی میٹھا اور پرسوز ساز ہے۔ قدیم بلوچی میں اسے شاغ بھی کہتے ہیں۔ یہ وسطی ایشیائی جمہوریاؤں کے علاوہ ایران، پاکستان اور افغانستان کے تمام بلوچوں میں یکساں مقبول ہے۔ یہ بلوچستان میں بہت مقبول ساز ہے۔ انگریزوں کا وائلن اس سے ملتا جلتا ساز ہے۔ پرپغ نامی لکڑی سے بنا ہوتا ہے۔ اس میں پانچ تار ہوتے ہیں جن کے نیچے پانچ مزید تار ہوتے ہیں۔ اسے چھوٹے چھوٹے منکے، آئینہ کی ٹکڑیاں چپکا کر بہت خوب صورت بنایا جاتا ہے۔ یہ بھی خاص فنکار لوگوں کے ہاتھ میں بولتا ہے۔ آرٹسٹ آلتی پالتی مار کر بیٹھتا ہے، سریندا اپنی گود میں رکھتا ہے اور سامعین کی طرف رُخ کرکے اسے بجاتا ہے۔ دائیں ہاتھ میں لمبی تاریں کمان میں سجائے سروزی اُس سے آوازیں نکلواتا ہے اور اوپر کے حصے میں بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے وہ اُس کی ٹائمنگ اور دھن ترتیب دیتا ہے، بہت باریکی سے، بہت حاضر دماغی سے۔ کچھ سازندے (سروزی) تو سریندا بجاتے بجاتے ساتھ میں گاتے بھی ہیں مگر بلوچستان کے کچھ حصوں میں گانے والا (سُری) الگ ہوتا ہے اور سروزی الگ۔ حضرت مست توکلی کا بھائی پیرک سریندا بجانے میں ماہر تھا۔ زہرو، تنگو اور سچو بگٹی اوجِ کمال تک پہنچے فنکار رہے سریندا کے۔

چنگ (Chang)

چنگ بھی بلوچستان کے تقریباً ہر علاقے میں بجایا جاتا ہے۔ یہ نوجوانوں کی جیب میں سما جانے والا ساز ہے اور قیمت میں بھی ان کی پہنچ میں ہوتا ہے۔

بنجو (Benjo)

بنجوتو آج کے دور میں تاج محمد تاجل کے نام کے ساتھ گویا لازم وملزوم ہے۔ مری قبیلے میں وڈیرہ سہراب خان سومرانڑیں بہت خوبصورت بنجو بجاتا تھا۔ بہت سے لوگ بالخصوص میوزیکل گروپس اس کی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں۔

پہیلی اور ضرب الامثال

پہیلیاں ہر انسانی معاشرے کی طرح باقاعدہ ہمارے بھی روزمرہ کا حصہ ہیں۔ خصوصاً بچوں میں۔ رات کو کھانے کے بعد گاؤں کے گھروں میں جب بچے آنکھ مچولی، کلشغ، گھمر اورٹوپی لیو جیسی نیم آؤٹ ڈور نیم اِن ڈور کھیلوں کا درمیانی وقفہ دیکھتے ہیں تو وہ پہیلی ٹورنامنٹ ضرور منعقد کرتے ہیں۔ اسے بلوچی میں، بند، بجھارت اور چاچ کہتے ہیں۔ چیلنج یہ ہے کہ اگر آپ پہیلی نہ بوجھ سکے تو آپ کو ایک جغرافیائی علاقہ دوسرے فریق کو بخش کر پہیلی کا جواب لینا ہوگا۔ مثلاً پہیلی آپ نہ بوجھ سکیں تو پہیلی پوچھنے والا کہے گا جواب نہیں آتا تو ایک علاقہ میرے حوالے کردو۔ مجبوراً علاقے کا نام لے کر کہا جائے گا مثلاً سیوی، قلات، ماوندیا'' ڈیرہ بگٹی تئ ایں''۔ اب پوچھنے والا بہت موسیقیت سے کہے گا: '' دیرو باپُل، دیرو باجُھل' مئیں میشانی دفابا''۔ نئ چراگاہ جومل گئی۔ چنانچہ علم و معلومات وتفکر کے زور سے، بغیر تیر وتلوار چلائے ایک علاقہ اُسے مل گیا۔ اوراس کا اچھا استعمال تو بطور چراگاہ کے اپنے بھیڑوں کو عطا کرنا ہوتا ہے۔ عقل وعلم نہ ہونے سے وطن سے دست برداری کا خطرہ ہوتا ہے، اس لیے کوشش کی جاتی ہے کہ پہیلی بوجھ لی جائے اوراپنا وطن بچایا جائے۔ یہ جواب لینا اور دینا دونوں لازمی ہوتے ہیں۔ جب علاقہ مل گیا تو اب پوچھنے والا اپنی پہیلی خود بُوجھ لیتا ہے۔

****

محاورے، کہاوتیں اور ضرب الامثال کسی بھی زبان کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ بلوچی ایک بہت ہی وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے۔ جو نہ صرف چار پانچ ممالک پر مشتمل ہے، بلکہ اُس علاقے کے آپسی روابط اور رسائل و رسائل بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا بنیادی ساخت کو برقرار رکھتے ہوئے الگ الگ علاقوں کے ضرب المثل بلوچی کے مشترک خزانے میں جمع ہوتے رہے ہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بلوچی میں ضرب الامثال کس قدر زیادہ اور کس قدر متنوع ہوں گے۔ اس میں اُن اصناف کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جو زیادہ تر مویشی بانی، شکار، ماہی گیری اور تجارت کے تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ آفاقی، اخلاقی باتیں ہیں۔ یہ سب بہت مختصر ہوتے ہیں اور موسیقیت بھری بھی۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیا کی ساری زبانوں کی طرح بلوچی میں بھی پڑوسی زبانوں سے تین چار ضرب الامثال، انھی زبانوں سے سالم انداز میں سفر کر کے بلوچی کے بن چکے ہیں۔ بلوچی زبان میں دوسری زبان کی سالم ضرب المثل اُسی زبان میں۔

بلوچ محقق و قلم کار بہت ہمت و کوشش سے اِن کو اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ ضروری ہے، ورنہ بہت سی دانائی گم ہو جائے گی۔ دانائی جو پوری انسانیت کا ورثہ ہوتی ہے۔

جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے، پرانی ضرب الامثال اپنی افادیت کھوتی جاتی ہیں اور اُن کی جگہ نئی بنتی جاتی ہیں۔ بالخصوص اُن ضرب الامثال کو بہت خطرہ ہے، جو اب کی فیوڈل اور سرمایہ دارانہ طرزِ زندگی پر پورا نہیں اترتیں، مگر جو خانہ بدوش سر قبیلوی نظام میں عام استعمال کی باتیں ہوتی ہیں۔

****

شاعری

قدیم اور فوک بلوچی شاعری تحریر کی سہولت سے محروم رہی ہے اور لوگوں نے اپنے سینوں (سروں) میں اِن شعروں کو محفوظ کر لیا اور اگلی نسل تک منتقل کر دیا۔ یہ طریقہ ہمیشہ اِن خطرات سے پُر ہوتا ہے کہ شاعری مکمل یا پھر جزوی طور پر گم ہو جائے، یا اُس میں اتنے اضافے اور تحریفیں ہوں کہ اُس کا چہرہ بگڑ جاتا ہے۔

ہماری شاعری طویل شاعری ہوتی تھی۔ یہ جنگی واقعات کا بیانیہ تھے، ہماری قومی تاریخ کا سرچشمہ بھی اور محققوں کے لیے منبع بھی۔ یہ طویل بیانیہ والے شعر بھاری کوہستانی چشموں کی طرح نکلتے ہیں اور بہتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی زبان بہت رواں، شیریں اور چُست ہے۔ منظر نگاری اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔ اس میں بہت خوب صورت ڈرامہ نگاری موجود ہے۔ ہماری شاعری قافیہ، ردیف کی پابندی سے مبرا ہے مگر بحر کی پابندی ہر جگہ موجود ہے۔ بلوچی کے یہ بیلیڈ بے مثال ہیں۔ بلوچی کلاسیکل شاعری کا حجم اور ذخیرہ حد سے زیادہ بڑا ہے۔ بہت کم زبانوں کی قدیم شاعری اس قدر امیر ہے۔ یہی حال ہماری فوک شاعری کا بھی ہے۔

جیسے کہ ذکر ہو چکا ہے کہ عوام الناس نے ہماری شاعری کو اپنے سینوں کے مضبوط قلعوں میں محفوظ رکھ کر گم ہونے سے بچا لیا۔ پھر کچھ لوگ اسی ایک کام کے سپیشلسٹ ہوئے کہ اس شاعری

کو یاد رکھیں اور بلوچوں کی محفلوں تقریبوں میں سامعین کے سامنے اپنے مخصوص انداز میں پیش کریں۔ ایسے لوگ مغربی بلوچستان میں 'پہلوان' کہلاتے تھے۔ یہ ایک ادارہ ہوتا تھا جسے اب نئے زمانے کی 'ترقی' نے برباد کر ڈالا۔ جی ہاں ریڈیو نے، ٹی وی نے۔ مشرقی بلوچستان میں 'پہلوان' کا باقاعدہ ادارہ تو موجود نہیں ہے، البتہ معمر لوگوں کو یہ سب کچھ یاد رہتا ہے اور وہ اُسے ہر جگہ سنانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھاتے۔

اس شاعری نے بلوچ قوم کی فطرت اور قومی کردار کو ایک عظیم خصوصیت عطا کردی اور قوم کے مزاج اور نفسیات پر بڑا اثر ڈالا۔ بلوچ قوم نے اپنی ساخت کے تاریخی عمل میں صدیوں سے اپنے داخلی اور خارجی بدخواہوں سے جنگ کر کے خود کو زندہ رکھا اور اور اِن جنگوں یا پھر، رومانی داستانوں کو آج تک زندہ رکھا ہوا ہے۔

بیسویں صدی سے پہلے سو فیصد، اور اس کے بعد بھی بڑی حد تک بلوچی شاعری میں موجودہ اصناف (غزل، نظم، رباعی، نیٹ، ہائیکو) ناپید تھیں۔ اور یہ شاعری قلم کاغذ پہ کانٹ چھانٹ والی بھی نہ تھی۔ تین تین چار چار سو مصرعوں پر مشتمل طویل شاعری۔ خود گل خان یہی شاعری کرتا تھا۔ اس کے خیال میں بلوچی:

''شاعری سیکھنے کی چیز نہیں ہوتی کیونکہ یہ کوئی ہنر یا حرفہ نہیں۔ شاعر کو کسی اُستاد کی ضرورت نہیں ہوتی...... شاعری ایک خداداد ملکہ، ایک لاہوتی استعداد اور ایک ایسی اِلہامی کیفیت ہوتی ہے جسے ہم وَحی نہیں تو وَحی کے مترادف کہہ سکتے ہیں جو شاعر کے دِل پر نزول کرتی ہے اور اس کی زبان سے بے ساختہ الفاظ ایک مترنم، روانی، وزن اور ترتیب کے ساتھ پھوٹ پڑتے ہیں''۔

بلوچی میں ردیف و قافیے والی شاعری بعد کی عالمانہ ایجاد ہیں۔ ورنہ تو ہماری خوب صورت شاعری ان کی پابند نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی ہماری شاعری کو علم العروض سیکھنا پڑتا تھا۔

ہماری گیدی (فوک) شاعری میں ایک دریائے معانی پوشیدہ ہے۔ مناظرِ فطرت ہوں یا فطرت میں موجود انسانی دوست دشمن، قبائلی معاملات ہوں یا طبقاتی حقائق و جدوجہد، ہماری فوک شاعری بہت امیر اور متنوع ہے۔ بلوچی فوک شاعری کے مالک خواندہ نہ تھے، مگر اُن کے حقیقی

شاعر ہونے سے کون انکار کرسکتا ہے۔

شاعری بلوچ کی قدیم ترین ثقافتی تخلیق اور روایت رہی ہے۔ شاعری سننا، یاد رکھنا اور اکٹھ و اجتماعات میں سنانا ایک بہت ہی خوبصورت اور باوقار معمول ہے۔ اس کے علاوہ چیدہ چیدہ اور چنیدہ چنیدہ مصرعے تو روزمرہ گفتگو میں ہر خاص و عام بلوچ استعمال کرتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح عام بلوچی بول چال بھی ضرب الامثال اور شعروں مصرعوں سے مزین ادبی بول چال ہوتی ہے۔

ہماری فوک شاعری نہ صرف شتربان کے طویل سفر کا ساتھی ہوتی ہے بلکہ یہ تو قالین ساز اور دری بُننے والے مرد و زن کے خشک و یکساں کام کو رنگین بناتی ہے، اُسے مہمیز دیتی ہے۔ یہ شاعری ہماری لینڈ سکیپ کی توصیف ہے، ماحولیاتی حسن و سکون کا اظہار ہے، بارشوں کا انتظار ہے، سرسبزی کی دعا ہے۔ بلوچ فوک شاعری بادلوں کے اجتماع کا رواں تبصرہ ہے، عرشی قطرہ پاشی کے ایک ایک لمحے اور پینترے کا تذکرہ ہے، آسمانی رنگت کے بدلنے، اس کے صوتی و بصری کرشموں کی دفتر نویسی ہے، اور بارشوں کے بعد نم زمین کی بھینی خوشبو سے لے کر، سبزہ پھوٹنے سے لے کر اس کے پھول ہونے تک اور اس سبزہ سے ماحولیاتی حسن اور مویشی بانی تک کے ہر ایک پہلو کا بیانیہ ہوتی ہے۔ یہ ہمارے نسلی شجرے کا ریکارڈ بھی ہے۔

شاعری ہماری آبادیوں کی آبادکاری کی تاریخ کی کتاب بھی ہے۔ انسانوں کے باہمی تعاون، امداد اور اجتماعی محنت کی ثنا خواں ہے۔ ہماری آباد زراعت اور تجارت کی زباں ہے۔ ہماری آبادیوں کی ثقافتی زندگی ہے۔ اگر چرواہوں اور خانہ بدوشوں نے شاعری کی تو آباد مراکز نے اس شاعری کو محفوظ رکھا، اسے شائستہ بنایا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔

بلوچ شاعری تو میراث ہے چرواہے کی۔ یہ بات بغیر کسی شک کے کہی جاسکتی ہے کہ جاں فشاں اور دریدہ پاپوش و پوشاک چرواہا ہی شعر کہتا ہے، وہی اُسے گاتا ہے، اور وہی اُسے یاد اور محفوظ رکھتا ہے۔ اس کی شاعری انتہائی متاثر کن، نیچرل اور بلاواسطہ ہوتی ہے۔ اس میں کوئی ٹیڑھا ترچھا پن، اگر مگر، چکنا چپڑا پن اور دروغ دغا نہیں ہوتا۔ انتہائی عمیق اور جاندار شاعری ہوتی ہے

ہماری۔ جو ہماری رنگینیِ خیال کی عکاس ہوتی ہے۔

ہر قبیلے کا اپنا شاعر چلا آ رہا ہے۔ وہ امن کے زمانے میں فطرت کی ستائش، ماضی کی اچھی یادوں کی شاعری کرتا ہے۔ اور جنگ کے زمانوں میں وہ اپنے لوگوں کی بہادری، اور دشمن کی بزدلی کمزوری کے علاوہ جنگ میں بہادری دکھانے والے اپنے افراد کا نام لے لے کران کی توصیف کرتا ہے، میدانِ جنگ میں کام آنے والے سورماؤں کی تعریفیں کرتا جاتا ہے، اور بزدلوں کو برا بھلا کہتا ہے ،وہ جنگ کے لیے اپنی صفوں میں لوگوں کو بہادری دکھانے کے لیے اکساتا ہے۔ بہت سے محققین اس بات پر غلطی پر ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ قبیلے کا شاعر اپنے سورماؤں کے شانہ بشانہ لڑتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ہم اپنے شاعر کی اس قدر عزت کرتے ہیں کہ اُسے، سردار کو، اور پدّ و دار کو بندوق، تیر کمان اور تلوار کی حد سے دور بٹھاتے ہیں۔ ان میں ایک تو ہمارا جنگی کمانڈر ہوتا ہے جس کا سلامت رہنا ضروری ہوتا ہے۔ دوسرا دشمن کے خلاف اپنی کرامت کا استعمال کرتا ہے۔ اور دشمن کے تیغ اپنی ولایت کے ذریعے بند کر لیتا ہے، اس لیے اس کا زندہ رہنا بھی ضروری ہے۔ اور تیسرا ہمارا جنگی نامہ نگار ہوتا ہے، جس کی سلامتی ضروری ہوتی ہے۔

ہمارے جنگی شاعر کی شاعری مارشل ٹیون والی ہوتی ہے۔ ایسی، جسے نڑسُر میں گایا جا سکے۔ مگر اسے ہلکا نہیں ہونا چاہیے۔ دشمن کو برا تو کہے مگر اس کی بے توقیری نہ کرے۔ کچھ بھی ہو، ایک دوسرے کی لاشیں گراتے ہوئے دشمن قبیلوں کا شاعر نفرت سے مغلوب ہو کر گری ہوئی بات کبھی نہیں کرے گا۔ یہ جنگی وقار کا، اخلاقیات کا کوڈ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر بات کا بتنگڑ نہیں بنائے گا۔ وہ خواہ مخواہ کسی کی تعریف نہیں کرے گا کہ جنگ کے میدان کا سپاہی جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑتا ہوا اور آپ اس کا بغیر کسی وجہ کے کسی سے کم تذکرہ کریں تو کون برداشت کرتا ہے۔ سچ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے شاعری کرو کہ بلوچ نہ سستی تعریف کرے گا نہ ہلکے پن والی تنقید۔ اِس مؤرخ (شاعر) کو پتہ تھا کہ اُس وقت پورے دو قبیلے تاریخ بنا (بگاڑ) رہے ہیں، مبالغہ کرے گا تو اعتبار کھو دے گا۔ اور قبائلی دنیا میں اعتبار کھو دینا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے۔ قبائلی دنیا میں ویسے بھی لوگ لفظ کو بہت چھان کر بولتے ہیں اور بہت چھان کر سنتے ہیں، کہ بقول سارتر ’’لفظ بھرا ہوا پستول ہوتا ہے‘‘۔

محترم عطا شاد کی ’دنیا و دین کے سوداگروں‘ سے یہ شکایت شاید درست ہو کہ وہ، ’’بھکاری کو پیر کہتے ہیں مگر شاعر کو ولی نہیں کہتے‘‘۔ مگر بلوچ عوام الناس کی بابت ایسی کوئی بات نہیں۔ بلوچ کے ہاں شاعر ولی ہوتا ہے۔ اُس کی تکریم ہر حال میں ضروری ہوتی ہے۔ بالخصوص جب وہ شاعری سنا رہا ہوتا ہے تو لوگ اسے کرامت و وجد و الہام کا دریا سمجھتے ہیں اور بہت ہی ادب سے الہامی کلام جان کر اُسے سنتے ہیں۔ آ آہ، واہ واہ، ہمارے ہاں بہت معیوب، گستاخی اور ہلکا پن سمجھا جاتا ہے۔

بلوچستان کا معروض یکتا قسم کا ادب تخلیق کرواتا رہا ہے۔ یہ بارانی اور خشکابہ وطن ہے۔ بارشیں ہوں تو ہم دنیا کے رنگین ترین تخلیقی لوگ بن جاتے ہیں۔ بارشیں نہ ہوں تو ہماری شاعری کا پورا لہجہ دھیرے دھیرے غم کی سیاہ چادر تانتی جاتی ہے۔ ہمارے وطن کے مختلف علاقوں حتیٰ کہ خود انسانوں کے نام بارش، بادل اور پانی کی نسبت سے رکھے جاتے ہیں۔ اور ہمارے ادب کا تو فیصلہ کن حصہ بادل و برسات کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ محنتی کسان طویل مدت تک بارش نہ ہونے کے سبب محبوب بلوچستان کو چھوڑ کر ہزاروں کی تعداد میں محنت مزدوری کرنے کے لیے سندھ چلا جاتا ہے۔ اور یار، یاروں سے الگ ہو جاتے ہیں۔ وصل، مٹھائی، نڑسر، عطر، سرمستی سب کالعدم ہو جاتے ہیں۔ زندگی تکلیف دِہ سکوت کی بھٹی میں گھر جاتی ہے اور ٹھنڈی آہیں اور سوکھے ہونٹ ہمارے عوام کا مقدر بن جاتے ہیں:

اللہ ہیر کی ہوراں دئے
پُر کس اوٹھاں شیریناں
گڑدیں مڑداں دیریناں
بھاگیا یاں مزں لیٹریناں
زالاں گھمرو چیڑ یناں
کوڑی روشترو کم ایناں
(کہ) من تو پروشا گالی بوں
درائیا بروں حالی ہوں

ترجمہ:

اے اللہ! خیر کی بارشیں برسا/ میٹھے پانی کے تالاب
بھر دے/ دور دراز جانے والے پردیسیوں کو واپس
لا/ مویشی رکھنے والے بڑے بڑے مالداروں کو/
ہارسنگھار کی ہوئی عورتوں کو واپس لا/ یہ دنیا چند روزہ
ہے / محبوب کے ساتھ وصال نصیب ہو / اور ہم
وصال کے موقع پر دل کی باتوں کا تبادلہ کریں۔

بلوچی شاعری کے عشقیہ حصے میں عورت کے لیے قابلِ احترام برابری کے جذبات نظر آتے ہیں۔محبت کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ جب ایک بار استوار ہوتی ہے تو پھر کوئی دشمنی، کوئی شکوہ، شکایت، کوئی تعصب اور کوئی اونچ نیچ نہیں رہتی۔ سارے رنج، غم، قبائلی منافرتیں اور مرد کی برتری ختم ہو جاتی ہے۔ عشق وہ واحد کام ہے جو عورت اور مرد کو برابری عطا کرتا ہے۔ دونوں دوستوں کے درمیان ہر عمل، اختیاری ہے۔کوئی جبر، کوئی زور اور ناروائی نہیں ہے۔ یہ وہ واحد صالح عمل ہے جس کے اندر کوئی خود غرضی نہیں ہوتی۔ محبوب کو کوئی تکلیف، کوئی ایذا نہ پہنچے، دل و جان دوست کے لیے قربان۔ قبائلی نظام کی جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہے، محبت کی شاعری۔

آیئے عظیم امریکی فوک سنگر پیٹی سیگر کا تذکرہ کرتے ہیں۔اُس کو امریکہ کے ظلمت و سیاہ دور یعنی میکھارتھی دور میں بلیک لسٹ کیا گیا تھا۔اس نے بالآخر پابندی توڑ دی اور ایک شو میں نمودار ہوا۔

ایک انٹرویو کرنے والے نے پیٹی سے سوال کیا: ''کیا اب فوک میوزک ختم نہیں ہوا؟ ۔کیا ایسا نہیں ہے کہ لوگ پرانے فیشن کی موسیقی سے باہر آئے ہیں؟''

جب پیٹی نے ہنسنا بند کیا تو بولنے لگا: ''فوک میوزک اور موت؟ ارے نہیں، کبھی نہیں۔فوک میوزک کا کیا مطلب ہے؟ folks(عوام، لوگ) کی موسیقی، عوام کی موسیقی۔کبھی ، اپنے بنانے والے لوگوں کی طرح یہ بھی انڈر گراؤنڈ ہونے پر مجبور ہو جاتی ہے، اُسے چھپا دیا

جاتا ہے، اور کچھ عرصہ کے لیے بھلا دیا جاتا ہے۔مگر عوام کی طرح، یہ واپس آ جاتی ہے۔ جب عوام کھڑے ہو جاتے ہیں اور انصاف کے حق میں بات کرتے ہیں تو فوک، فوک شاعری، اور فوک موسیقی بناتے ہیں۔لوگوں کی طرح، فوک کی طرح، فوک شاعری اور فوک موسیقی کبھی نہیں مرے گی۔''

شعری اصناف

ایک قبیلے، یا پورے بلوچ کی تاریخ، نسب وشجرہ اور کلچر کو ہماری شاعری نے محفوظ کر رکھا ہے۔ چونکہ یہ ہماری تاریخ کا منبع وسرچشمہ ہے اسی لیے بلوچ خود کو اپنی شاعری کے ساتھ ہی جوڑے رکھتے ہیں۔ بلوچی فوک شاعری میں بشمول دستانغ کے سب اصناف ساز کے بغیر بھی گائی سنائی جاسکتی ہیں۔ گویا انفرادی طور پر انہیں کہا اور گنگنایا جاتا ہے۔ اسی لیے تو یہ مقبولِ عام ہیں۔ مگر اب ہماری فوک اصناف کو معدومیت کا بہت خطرہ لاحق ہو چلا ہے۔ آج کی ساری اخباری، رسالوی اور ریڈیو ٹی وی والی شاعری ہماری اپنی اصناف میں نہیں ہو رہی۔ سب لوگ درآمد شدہ غزل ونظم وقطعہ کی جگالی کرتے پھرتے ہیں۔ بڑے پیمانے کی ایک تحریک چاہیے بلوچی کی اپنی اصناف میں شاعری کرنے کے لیے۔

فوک شاعری کی بہت ہی خوبصورت اور تعداد میں کثیر اصناف، یہ ہیں:

1- لولی

لولی بلوچی ادب میں بہت قدیم طرز ہے۔ ماں اپنے بچے کو گوانزغ (پنگھوڑے)، شاغ یا سری بند میں جھلاتے ہوئے پیار بھری آواز سے لولی گاتی ہے۔ یہ شاعری بچے کے مستقبل کے لیے دعائیں اور اچھے اوصاف پیدا ہونے کی خواہش سے بھری ہوتی ہے۔ اس میں بچے کی

سلامتی اور اس کی درازیِ عمر کی تمنا ہوتی ہے۔

یہ قدیم ترین صنف ماں کی ہوتی تھی اور اس لیے اسے اچھی طرح سے یاد بھی رکھا گیا۔ ماں لوری ہے، لوری ماں ہے۔ لوری کو بلوچی میں لولی کہتے ہیں۔ ماں پنگھوڑے میں اپنے بچے یا کبھی کبھی بچی کے لیے گاتی ہے۔ بچہ جو رات کو سونے نہیں دیتا۔ ماں گاتی بھی تقریباً اُسی وقت ہے جب ساری دنیا سوئی ہوتی ہے۔ لہٰذا تخلیق کے لیے مکمل تنہائی، مکمل سکوت............ ماں لوری گاتی جاتی ہے اور نئی لوری بناتی جاتی ہے۔ دل کے ارمان، اپنی سماجی مادی معاشی حالت، بچے کے لیے خواہشات کی تفصیل، اس کے لیے دعائیں............ ایک بھرپور شاعری ہوا کرتی ہے یہ۔

لولی کا طرز تو تقریباً ایک ہی رہا مگر اس کے بول، مصرعے اور خیالات وسعت پاتے رہے۔ ماں پنگھوڑے کے قریب گا گا کر بچے کو جھلاتی رہتی ہے۔ ماں لولی بن جاتی ہے، اسی آواز میں تو ماں کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ ماں، جس کا کوئی نعم البدل نہیں...... جو ایک بار ہی ملتی ہے، اکیلی ہی ملتی ہے۔ اُس کی ہمسری کرنے والا پورے لولاک میں کوئی نہیں ہوتا۔

دنیا میں ہر جگہ ہمدردی اور مہر کا سمندر، یعنی ماں موجود ہے۔ اور جہاں ماں ہو وہاں بچے کے لیے اس کا احساس اور محبت بھی موجود ہوتی ہے۔ ہر ماں چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا لڑائیوں میں بڑے بڑے سورماؤں کا مقابلہ کرنے میدان میں اترے۔ وہ نیک ہو، بات کا پکا ہو۔ وہ یہ ساری دعا، یہ ساری تربیتی باتیں بہت آرام دہ اور ہلکے ہلکے جھولوں کے دوران میٹھی اور نرم آواز سے اُسے بتاتی جاتی ہے۔ گو کہ لولی محفل و دیوان کی صنف نہیں ہے مگر بلوچی ادب میں سمی و دودا کی داستان میں لولی کے بلند وارفع نمونے ملتے ہیں۔

لولی کی زبان بہت سادہ وشیریں ہوتی ہے۔ اس میں قبائلی سماج کے مظاہر مثلاً غیرت، بہادری اور جنگ وغیرہ کی بڑی تکرار ہوتی ہے۔ مائیں اپنے شیرخوار بچوں کو خودداری، خود اعتمادی اور ننگ وغیرت کا سبق دیتی رہتی ہیں۔ یہ گیت بچوں کو سلاتے وقت سنایا جاتا ہے............ میوزک میں سو جانا۔ گو کہ مائیں بچے اور بچی دونوں کو لولی سناتی ہیں مگر حتمی طور پر لولی کے سارے الفاظ بیٹے کو ہی مخاطب کرتے ہیں۔ عورت کی اپنی بے قدری، استحصال، دکھ درد میں اس کا نجات دہندہ تو بیٹا

ہوتا ہے یا بھائی، اس لیے وہ سارے ارمان بیٹے کے لیے کرتی ہے۔ اور اپنے سارے دکھ اور آپ بیتی اسی لولی میں بیان کرتی ہے۔

''لولی'' (لوری) عورتوں کی اپنی مخصوص اور ملکیتی فیلڈ ہے۔ مرد کبھی بھی لولی نہیں سناتا اپنی اولاد کو۔ لولی کی شاعر بھی عورت اور گلوکار بھی عورت ہوتی ہے۔

2- نازینک

سوئے ہوئے بچے کو جگانے کی موسیقی (شاعری) ہوتی ہے۔ اس کی فیکٹری بھی ماں کا دل ہوتا ہے۔ وہ گا گا کر بچے کو جگاتی ہے۔ بلوچ بچے کے مزے تو دیکھو، سلاؤ بھی گا گا کر اور جگاؤ بھی گا گا کر۔ ماں تم کیا انوکھی ہستی ہو!!

3- ڈیہی

ڈیہی بہت خوبصورت اور بہت مقبول صنف ہے جسے ہر عام وخاص، پیر وجواں، عاشق وغیر جانب دار اور مرد وزن کہتے بھی ہیں اور گاتے بھی ہیں۔ یہ جدائی کی تانگ، انتظار کی مہلک کیفیات، اور میل ووصل کے جلا ڈالنے والے، مگر سکون آواز لمحوں کے جذبات کے اظہار کی بے مثل صورت ہوتی ہے۔ اس کے گانے کے لیے نہ موقع محل کی ضرورت ہوتی ہے، نہ اجازت وپروانہ کی حاجت ہوتی ہے۔ نہ وقت وموسم کی قید اور نہ تنہائی ومحفل کی بندش۔ یہ مویشی کی چراگاہ میں بھی اپنی آمد کر سکتی ہے اور کاروانوں میں اونٹ پر ہچکولے کھاتے ہوئے بھی اس کا نزول ہو سکتا ہے۔ یہ محفلوں کی زینت بھی بن سکتی ہے اور بیت بازی کی طرح مقابلوں میں بھی موجوں کی صورت اپنی آمد کرتی ہے۔ کٹھن چٹانوں کی بازگشت میں بھی ڈیہی گونج سکتی ہے اور رات کے پچھلے پہر گھپ خاموشی میں بھی ہل چلاتا کسان ڈیہی 'کھینچ' سکتا ہے۔ دور افتادہ ندی نالوں میں لکڑیاں چنتی عورتیں بھی نرم لے میں ڈیہی کرتی ہیں اور میٹھے پانی کے تالابوں میں پانی بھرتی خواتین بھی اسے 'چہک' سکتی ہیں۔ الغرض ڈیہی ہر شخص کی رسائی والی صنف ہے۔ یہ شاید بلوچی شاعری میں ابد تک قائم رہنے والی صنف ہے، اس لیے کہ اس میں ماضی بھی موجود ہو سکتا ہے، حال کی نیرنگیاں بھی شامل کی جاسکتی

ہیں، اور روشن مستقبل کی تعمیر کے عزائم بھی ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ نوجوان کے امروز کی نقیب بھی ہے اور معمر کے دیروز کی گہری ولمبی آہ بھی۔

ڈیہی کی لے بہت ممتاز ہے۔ اکثر ڈیہی ایسی ہوتی ہے کہ اس کا پہلا مصرع بے معنی ہوتا ہے، ساری بات دوسرے مصرعے میں کہی جاتی ہے۔ ہائیکو کے دیوانے دانش ور، خاکروبی کر کے ڈیہی کے اندر سے بھی ناگا ساکی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ڈیہی تو صرف ڈیہی ہے۔ اسے ڈیہی ہی رہنا ہے۔ ہائیکو اس کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں۔

عطا شاد کی پیروی کرتے ہوئے ہمارے بہت سے دانش ور کہتے ہیں کہ 'ڈیہی' ڈیھ سے نکلی ہے، جس کا مطلب 'وطن' ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ تصور درست نہیں ہے۔ ڈیہی کے اندر وطن کا کوئی خاص تذکرہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ڈیہی ہر طرح کے نازک جذبات کے اظہار کی قالب ہوتی ہے۔ کھیترانڑ اور پشتون وطن کو 'ڈیھ' نہیں کہتے ہیں مگر اُن کے ہاں بھی ڈیہی موجود ہوتی ہے۔ وہ ڈیہی کو 'ڈی ہو' کہتے ہیں جس لفظ کا کہ وطن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے ڈیہی اور ڈیہہ کو زبردستی باہم نتھی نہیں کیا جاسکتا۔

4- لیلڑی

''لے لڑی'' بلوچ شعر و میوزک میں بہت ہی مقبول صنف ہے۔ اسے موسیقی میں بھی گایا جاتا ہے۔ اس صنف کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں لفظ لیلڑی بہت تکرار سے گائی جاتی ہے۔ اسی لیے اس کا نام ہی لیلڑی پڑ گیا ہے۔ ارے بھائی، لیلیٰ سے بھی کوئی خوب صورت لفظ ہو سکتا ہے۔ بلوچ کس قدر خوب صورت انسان ہوتا ہے۔ وہ 'سندھ' جیسی خوب صورت سرزمین کو مزید دلکش بنانے کے لیے 'سندھڑی' کہہ ڈالتا ہے اور لفظ لیلیٰ میں نزاکت وکشش میں لطیف اضافہ کے لیے 'لیلڑی' میں بدلتا ہے۔

یہ گانے میں بہت تیز صنف ہوتی ہے۔ اس کے ہر مصرعے کا مطلب جدا ہوتا ہے، مگر وزن اور قافیہ برابر ہوتے ہیں۔ یہ مہر ومحبت کی ترجمان ہوتی ہے۔ یہ بلوچی کا مقبول لوک گیت ہے۔

5- هالو

ہالو یاہلوطربیہ گیت ہوتے ہیں۔ جو شادی وشادمانی کے مواقع پر گائے جاتے ہیں۔اس میں طرز شاید ایک جیسا رہتا ہےاور **سگنیچر** مصرع بھی، مگر مائیں اپنے بیٹوں کے لیے بھلا کیا کیا ارمان نہ کرتی ہوں گی۔اور ہلو میں کیا کیا اضافے ہوتے ہوں گے۔

شادی بیاہ کی اس شاعری کو عورتیں کورس کے انداز میں گاتی ہیں۔ ہالواور لیلاڑو نشاطیہ صوت کے اوزان کی حیثیت رکھتے ہیں۔اور وہ تمام شیئر جو ہالواور لیلاڑو کے وزن پر پورے اترتے ہیں، ہالواور لیلاڑو گانے کے کام آتے ہیں۔'ہلو ہالوٗ' کی شاعر بھی عورتیں ہیں اور گانے والیاں بھی۔

یہ خوشی وخوشحالی کی رواں ندی ہوتی ہے۔کورس کا سا انداز اس طرح ہوتا ہے کہ ایک یا دو عورتیں باقی مصرعے بولتی ہیں اور باقی عورتیں مل کر کورس کے انداز میں کہتی ہیں؛''اے ہلو ہالو ہالووواے''۔

''ہالوٗ' کی اس بار بار کی تکرار کی وجہ سے اسے ہالو کا نام دیا گیا ہے۔

ہالو میں دلہن کی خوبصورتی، سگھڑپن اور دوسری اوصاف کی تعریف بھی ہوتی ہے، اور داماد کی صحت مندی، بہادری، نشانہ بازی، گھڑ سواری اور دیگر مردانہ صفات کی توصیف بھی۔ ہالو میں دلہا دلہن کی آئندہ کی زندگی کے لیے اچھی خواہشات اور دعائیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ رقص کے ردھم کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ یہ صنف صدیوں سے جاری وساری ہے۔اس کی کوئی شاعرہ، کوئی مالکن نہیں ہوتی بلکہ پورا بلوچ معاشرہ اس کا محافظ ہے، ساری عورت نسل اس کی شاعرہ اور اس کی پالن ہار ہوتی ہے۔ترنم اور نشاطیہ صنف کی اس شاعری میں صرف وزن برابر ہے۔ باقی، کتابی پٹواری پن والے شعری لوازمات کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔

6- لئی لا ڑو

لوک شاعری کی ایک صنف ہے، جن کی شاعرائیں عورتیں ہوتی ہیں۔ وہی اسے کمپوز کرتی ہیں اور وہی اسے گاتی ہیں۔ یہ بہت ہی پُرتفریح صنف ہے۔ ہالو کی طرح لئی لاڑو بھی عموماً شادی وجشن کے موقعوں پر گائی جاتی ہے۔اسے کہیں بھی، کسی بھی اچھے موقعے پر گایا جاسکتا ہے:

شادی بیاہ میں، جشن میں، اکٹھ میں۔

یہ بھی ہالو کی طرح مل کر کورس کے انداز میں گائی جاتی ہے۔ یہ دو وزن رکھتی ہے:

(1) لئی لاڑو لاڑو لئی لاڑو، لاڑو

اور......

(2) لئی لڑولاڑو لئی لڑولاڑو

تیسرے وزن کا نام ''لاڑے موز'' (لیلی مور؟) ہے جو وسطی بلوچستان سے ہوتا ہوا مشرقی بلوچستان آ پہنچا، جہاں یہ نسبتاً نیا ہے۔

لئی لاڑو، لولی اور ڈیہی بہ یک وقت محبوب کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں، بیٹے اور بھائی کے لیے بھی۔''چلوا کی تڑون'' نامی افغان ریسرچ میگزین اس کے بارے میں ایک اور بات بتاتا ہے؛''لئی لاڑو بہت تاریخی اہمیت رکھتی ہے، جس کے اندر عشق، گیت اور تلوار کا ذکر ہے۔جس دور میں بلوچوں کے اندر قبیلوی دشمنی عام تھی (کب نہ تھی؟) اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا تو جب دونوں طرف کے تلوار باز مردمیدان میں اترتے تو بلوچ دوشیزائیں انہیں جنگ پہ اکسانے اور ان کی ہمت بڑھانے مل کر ایسے گیت گاتیں، جس سے نوجوان شکست نہ کھاتا۔ عورتوں کے اس گیت نے بہت سی عورتوں کو بیوہ بنوایا''۔

پاکستانی بلوچستان میں البتہ اس پس منظر والا لئی لاڑو بہت کم ہے۔

7- سوت

یہ بلوچی فوک سانگز میں بہت مقبول صنف ہے۔ شادی بیاہ میں گایا جاتا ہے۔اور یہ ضروری نہیں کہ اس کی خالق عورتیں ہی ہوں۔ زیادہ تر مغربی بلوچستان میں مقبول ہے۔

8- زهیروك

ذاتی جذبات کی گہرائی کے اظہار کے لیے زہیروک سے زیادہ موثر صنف شاید ہی کوئی اور ہو۔گھر کی یاد، محبوب، والدین اور خاندان سے جدائی ہی اس کا موضوع ہوتی

ہیں۔'زہیر' یاد کو کہتے ہیں، انتہائی نرم دلی کو کہتے ہیں ۔کسی قریب ترین ہستی کو Miss کرنے کی عمیق،مگر لطیف ترین کیفیت کو کہتے ہیں ۔ایک کیفیت جو یاد اور جدائی کی انتہائی کسک پا کر اَن مٹ بے قراری بن جاتی ہے۔جس میں انسان کو کسی پل چین نہیں پڑتا۔اسی زہیر سے مشتق بلوچی میں ایک راگ ہے جسے زہیر یگ کہتے ہیں ۔ یہ راگ ، بے چینی کی اسی کیفیت کو دلدوز سُروں میں متشکل کرتا ہے ۔ یہ سیدھی سیدھی جدائی اور فراق کو چھیڑنے والی صنف ہے۔کبھی ساز اور کبھی بغیر ساز کے خوش الحان گلے اسے چھیڑتے ہیں۔زہیروک شتربانوں کی پسندیدہ صنف ہے۔

زہیروک مشرقی یا سلیمانی بلوچی میں بالکل ناپید صنف ہے۔یہ اصل میں رخشانی علاقے کی دل پسند صنف ہوتی ہے۔شتربان، چرواہے اور محنت کش کی لطیف صنف۔الفاظ تو ہوتے ہی پُر اثر ہیں،مگر اس کے گانے کا جو طرز ہے وہ سسکیاں بھر بھر کر محبوب کو یاد کرنے کی عکاسی کرتا ہے۔ بھلا کون کافر کہتا ہے کہ بلوچ سنگ دل ہے، یا وہ نرم دل نہیں ہے۔

ہماری ساری اصناف کو گم نہیں ہونے دینا چاہیے۔گل خان رہا نہیں جو کوشش کر کر کے اِن اصناف میں شعر کہتا تھا۔محبت وانسانیت کے اِن اصناف کو زندہ رکھ کر ہی بلوچ کا نرم رخ دنیا کے سامنے رہے گا۔

9- لیکو

اسے بھی شتر زبان زہیروک اور ڈیہی کی طرح گاتے ہیں۔لیکو کا بھی کوئی خاص شاعر نہیں ہے بلکہ یہ بھی سارے عوام کا مال و ورثہ ہے۔یہ خوب صورت استعاروں اور تشبیہوں سے مزین صنف ہے۔اس میں ایسی شاعری ہوتی ہے جس میں بڑی طاقت ، بہت جوش موجود ہوتا ہے۔ یہ چاگئے ،خاران،سرحد اور ہلمند کے علاقوں میں بالخصوص چرواہوں ، کسانوں اور شتر بانوں میں بہت مقبول ہے۔اسی لیے اس میں سفر کی مشکلات ومشاہدات بھی موجود ہیں، بھیڑ بکریوں کی باتیں بھی ہیں، پہاڑوں ریگزاروں کے تذکرے بھی ہیں،اور ہجر وفراق کی دل اکھاڑ

ساعتوں کے مرثیے بھی موجود ہیں۔اس کا طرز بھی ایسا ہے جیسے خود اونٹ کی سواری۔اونٹ کی سواری کے طویل سفر میں،رات کی تاریکی اور فطرت کی نامہربانیاں ہوں تو لامحالہ محبوبہ یاد آتی ہے،اس کی جدائی تڑپا دیتی ہے،گھر کا آرام اور اپنے علاقے کی یاد ستاتی ہے۔یہی جذبات لیکو بنتے ہیں۔

لیکو تقریباً وہی فوک گیت ہیں اور اس کے موضوعات بھی وہی ہیں،جذبات بھی وہی جو ڈیہی کے ہیں۔

10- ایمبا

یہ محنت کشوں کے اجتماعی کام میں قوتیں ملا کر زور لگانے کا گیت ہے۔بالخصوص ماہی گیر محنت کشوں کا۔

11- دستانغ

یہ بلوچی فوک سانگز کی گویا جان ہے۔رومان ورزم ومناظرِ فطرت پر مشتمل اس طویل صنف میں بقیہ فوک پوئٹری کے برعکس صرف دو مصرعے نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ بلوچوں کی شاعری کی واحد صنف ہے جو ہزار دو ہزار اشعار تک (خود کو دوہرائے بغیر) طویل ہوسکتی ہے۔گوکہ کلاسیکل کو بھی کبھی کبھی نڑسُر پر گایا جاتا ہے مگر اصل نڑسُر تو دستانغ کی ملکیت میں ہوتا ہے ۔ دستانغ گوکہ کلاسیکل شاعری کی طرح زوردار نہیں ہوتا مگر اپنی امارت اور حسن میں یہ کچھ کم بھی نہیں ہوتا۔ یہ کلاسیکل داستانوں سے بہت بعد کی صنف ہے۔دستانغ ایک ایسی صنف ہے جو رومانوی حکایات، فطرت کے مناظر،اور رزمیہ کہانیوں پر مشتمل ہوتی ہے ۔اس میں دین ،تصوف،اخلاقیات،ادب،عشق،بزم رزم،اور توصیف سب آتے ہیں۔'دستانغ' جنگی بھی ہوسکتی ہے جس میں کسی دوسرے قبیلے کے ساتھ یا پھر قبیلے کے اندر کسی لڑائی کا قصہ ہوتا ہے۔یہ ہنگامہ خیز واقعات کی ہنگامہ خیز واقعہ نگاری ہوتی ہے۔اگر آج بلوچ کی تاریخ مرتب ہوسکی ہے تو اس میں دستانغ اور شیر کا بہت بڑا حصہ ہے۔یہ روایتی بلوچی سادگی سے مزین صنف ہے۔جنوبی اور مشرقی

بلوچستان اس کا ٹھکانہ ہے۔

بلوچ اس صنف کے عاشق ہیں۔ جہاں کہیں بھی دو یا دو سے زیادہ آدمی ملیں دستان گوئی اور دستان سماعی شروع۔ اکثر 'دستانغ' کے شاعر نامعلوم ہیں۔

دستانغ ڈرامہ کی طرح کرداروں سے بھری ہوتی ہے۔ گم نام شاعری کے موتی جیسے الفاظ۔ یہ نڑ، دمبیر وا ور بین کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ دستانغ خصوصاً قبائل میں بہت مقبول ہے، اس لیے کہ اس میں قبائلی زندگی کی بہترین عکاسی موجود ہوتی ہے۔ جہاں فطرت مہربان بھی ہوتی ہے اور قہر و جبر سے بھرپور بھی۔ جہاں نیچر قریب بھی ہوتی ہے اور حسین وجمیل بھی، جہاں وفا اور جفا دونوں انتہا درجے کے ہوتے ہیں اور جہاں مہر وقہر لامتناہی ہوتے ہیں۔ ان دستانوں کے باقاعدہ نام رکھے ہوتے ہیں۔ مشہور دستانغوں کے نام ہم یہاں درج کرتے ہیں:

شیشک، تالنڑ (کہتے ہیں کہ زامری عالیانی اس کا شاعر تھا)، حیف، سوزاں پری یا نکو جنک (شاعر علی شیر رامکانی؟) پُلّیں بانک (میر خان پیر دادانی؟) سیاہ تالی (لڑنگ مھمدانی)، گھِمّا، دادھری، پرک، جابانی (جمال خان مری)، نکّو جنک (جمشید مری)، رفیس، جھرّا، جاڑو، شیر ہمد، چمکلو، لفنگ، پروپاغ، پیرہاں، سموّ، سخی، سوھری، یاعلی، جھمی، اللہ بیلڑی، چیڑول، مور، بوجلائیں مرگ، مزائیں مرگ، (شاعر، ملوسید یانی بگٹی؟) قادر (شاعر جمشیر رامکانی؟) سیاھیں رفیز' ھورانی شیر۔ آفانی پری، بارغ، پیرانی دستان، اللہ توئی، کمالھان، زیتون۔

''شیشک'' نامی دستانغ طویل ترین بحر والی ہے جب کہ ''حیف'' بہت مختصر اور تیز گایا جانا والا دستانغ ہے۔

مثلاً 'شیشک' دیکھیے:

کشّیں چاقو آں بُرّیں سُہرانی ڈانوڑاں
اے چاڑ دھیں ڈاچی مئیں یار نڑئے یہ پشکے نواں
ودھشہ چی اے مس پروہ پہ صدری اے گراں
صدری ئے جیوا ماں کناں یارا شکلّاں

ترجمہ:

چاقو نکالو اور اونٹنیوں کی رسیاں کاٹ دو
یہ چودہ اونٹیاں (بیچ کر) میری محبوبہ کا ایک قمیص بھی نہیں بنتیں
ہاں اگر کچھ پیسہ (اس کی قمیص) سے بچ گیا تو اپنے لیے واسکٹ خریدوں گا
اُس کی جیب میں محبوبہ کے لیے مٹھائی ڈال دوں گا

اب ذرا 'حیف' کا اختصار اور گرم رفتاری دیکھیں:

دوشی کہ مس وپتو و ہاوکشہ
ما پوپلڑی گالی دِہ کشہ
ما ساھانی سوزا کشہ
نَیں اُتر و نَیں باقی کشہ
ما سرپہ سریں سوزا جشہ

ترجمہ:

رات کو میں سویا
(خواب میں) میں نے اپنی محبوبہ سے ملاقات کی
ہم نے جانوں کا تبادلہ کیا
نہ اُس نے زائد دیا نہ میں نے
ہم نے برابری کی بنیاد پر جانوں کا تبادلہ کیا

اور اب ذرا دو دستانوں کا نمونہ ملاحظہ ہو:

جابانی

جمال خان مری

بیثغنت پاکئے کار نصیوانی
دیثغاں زڑ دیں زال کہیوانی
لڈغیں زالے نامیں جابانی
جُزغ و بھیراں پسکشہ غانی
کندغ و لیواں دل بڑتغانی
مس ترا نیلاں دیروہ کہنی
کوڑوہ کاراں گپتغاں دانی
گیراشت پارت چوکری آنی
دیروہ ماہ دیمیں پری آنی
(شاعر) تہ جنئے دستانے پہ مئے نامی
مس وس کثو سینگھار تہ زواذانی
گندغیں گالانہ نہ گوشانی
باز مناں دوست بیثہ دلہ کہنی
(اغہ) سیذ و سڑ دارے مس غلامانی
(اغہ) بادشاہے مس نوکرہ بانی
قولیں کہ تنخواھہ نہ گرانی
لوغہ نندااں چڑومس گندانی
مس چڑو ٹوکاں گوشہ دارانی
چلوے زڑدیں زالہ دستانی

کش و دئے یکے مارہ نشکانی
تئ ڈوبر اڈھو کا اث زوذانی
بگّڑیں دتان انت سوادھانی
شیفغیں پونزے پچماں سروانی
بیثغنت ژلکا تئ گنگروآنی
بے جُڑیں پرایاں گروخانی
دروشمہ کیثی عیدہ نوخانی
مس دِہ پہ دیذارا زرغانی
گھاڑ مناں پیدا غیں گنوخانی
نندغہ نیلاں لہر کفوتانی
چکثو جابہہ بستہ ملتانی
جھمبثو زڑتہ گانڈی جنگانی

****

نکوجنک

جمشید مری

کِلاں ہواں روشی ترا کہ استار قطبئے جزری
سھیل بیث ژہ کعبہ پلوا یا روش ژہ آنگو در کفی
میر چاکرہ ماڑی بُنا صدی حدیثانی گزی
گوخ زایاں بیاراں ماذنا برو مسلمانی جھی
یکے مری یکے سری لی آ ہماں روشی سذی
دانی کسن و کستریں نوخی بیئے تیلاں چڑی
مرگاں بالہ وہاو باڑ کندوخہ ورنائی وہی

گواشے کشی اژ ڈکنترا بلّیتغ آں درشکہ پلی
مس دہ ہذائی توکلا پریتغہ پُشتی وثی
کئے زاں ہیے درشکہ برے مئے پلوئے چکا کفی
ئیں ماہ گوں استاراں تڑیں نیں روح گوں تی زالے رلی
عاشق مناں معشوق توئے دستا مناں دے گل پری
نیلاں ترانکو جنک دانکو مہ وی مئے برادری
ہر باکہ تہ یارے کنئے مس آتلغاں کلّاں سری

مویشی بانی اور زراعت بلوچوں کا پیشہ اور روزی ہیں۔ بیل کے ساتھ دوستی دیکھنی ہو تو بلوچ کے علاقے میں جائیں۔ ہمارا کسان اپنے بیل کا سنگھار کرتا ہے، بجنے والی گھنٹی (شب) اُسے پہناتا ہے، اس کی بلائیں لیتا ہے۔ ہماری فوک شاعری میں ایک کسان ''جھرا'' نامی ایک داستان (نظم) میں جھرا نامی اپنے بیل کی تعریف میں سو سے زائد مصرعے کہہ گیا ہے۔ اس داستان کو ''چیڑول'' بھی کہتے ہیں:

جھرا شب و کنڈی آں نہ بنداں ذاتے بیکارا
نہ زئے گوخے ، نیئے روڑے ، نہ تخت جھرا تڑیں کارا
پنجاہ کاسغہ ریشاں ، جھّرا روشہ نگارا
جھرا کوتلی جزی ، ھیلا کیں سرہ مھارا
جھرا ڈھگوے جوائیں ، تئی تعریف دہ قندہارا
لٹاں ہلمہاں کاری ، چڑی جھرا گوں یہ تاڑا
ہزارا لوٹشہ ، جھّرا ، جمالی لوپہ سردارا
ہزار تہ چترے چینیں ، نہ داشہ ماخو بھوتارا

ترجمہ:

جھرا کی گھنٹیاں اور گھنگھرو میں کسی اور بیکار بیل پہ نہیں باندھوں گا
نہ کوئی گائے ایسا بچہ جنے گی نہ ہی کوئی اور بچھڑا جھرا جتنا کام کر پائے گا
میں ایک ہی دن میں جھرا کے ذریعے پچاس کاسہ بیج بوڈالتا ہوں
جھرا ناز ونخرے کے ساتھ، مہار ڈالے چلنے کا عادی ہے
جھرا زبردست بیل ہے جس کی تعریفیں قندھار تک ہوتی ہیں
بند کے لٹھ پر (چڑھائی) پر تو گویا حملہ آور ہو جاتا ہے اور اس کی رفتار بہت ہے
ایک ہزار روپیہ پہ مانگا گیا تھا جمالی کے سردار نے
ایک ہزار کچھ کم رقم تو نہیں ہوتا مگر میں نے اور میرے جاگیردار نے نہ بیچا

12- موتک

یہ حتمی طور پر بچھڑنے والے کے لیے وہ ماتمی شاعری ہوتی ہے، جو روتے ہوئے گا گا کر کہی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں موتک کی شاعری ماتمی ہوتی ہے۔ موت کی یہ شاعری دل کو چیرنے اور روح کو ہلا ڈالنے والی شاعری ہوتی ہے۔ انسان کی ساخت میں یہ بات شامل ہے کہ اس نے موتک بہر حال سننے بھی ہیں اور پھر ایک بار خود اپنی موت پہ موتک کہلوانے بھی ہیں۔ ایک بظاہر دائمی صنف، یعنی موتک سے بشر کو آزادی نہیں۔

موتک عورتوں کی صنف ہے۔ ماں، بہن، بیوی، بیٹی میّت سے مخاطب ہو کر ماتم کرتی جاتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں موتک کے اشعار کچھ زیادہ تحریر میں نہیں لائے گئے۔ سیمک کی شاعری کے سوا موتک کی شاعری چھپی ہوئی صورت میں بہت کم ملتی ہے۔ کاش موتک بلوچ ادب سے خارج ہو جائے۔ زمانہ، گواہ رہنا! وہ وقت ضرور آئے گا جب انسان صرف چیچک کی موت سے نہیں بلکہ ہر طرح کی موت سے نجات پا لے گا۔ موتک بلوچی ادب سے خارج ہوگا............ بہت سی نسلوں کے بعد ہی سہی!!

13۔ اخلاقی اور دینی

بلوچی شاعری میں حمد ایک الگ صنف کی طرح کبھی موجود نہیں رہی، نہ ہی نعت کوئی الگ صنف رہی ہے، مرثیہ بھی الگ شاخ کی صورت کبھی ہم میں جڑیں نہیں پھیلا سکا۔ بلکہ نعت وحمد ومرثیہ کا ایک آدھ مصرع بلوچ اپنی داستاں والی شاعری کی تینوں اصناف (یعنی عشقیہ یا رزمیہ یا مناظرِ فطرت) میں شامل کرتے ہیں۔

یعنی خدا، رسولؐ، حضرت علیؓ کا خاندان، ولی اور اولیا ہماری زندگیوں کی طرح ہماری شاعری میں بھی جگہ جگہ موجود ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے ساتھیوں کی طرح، ہمدردوں مددگاروں کی طرح۔انہیں ہماری زندگیوں سے علیحدہ کر کے الگ اصناف کی شکل نہ دی گئی۔زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ دستانغ کے اولین مصرعے انھی ہستیوں کے ذکر وتعریف پہ وقف کر کے اپنے موضوع کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔الگ سے حمد، نعت یا مرثیہ بہت بعد میں ضیاالحق کے دور سے بالکل اُسی طرح بے مغز اور پھُس پھُسے انداز میں برتے گئے ہیں جس طرح کہ سرکاری تقریبات میں ہوتا چلا آیا ہے۔ پیسے دے کر نعتیہ مشاعرہ منعقد کرانے کا رواج ایک سیاسی بات رہی ہے۔ بالخصوص مارشل لاؤں کے زمانے میں جہاں ٹی وی اور ریڈیو کی فیکٹریوں سے عوامی سیاسی عمل کا تدارک مقصود رہا۔قومی ترانے وغیرہ سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔نتیجہ یہ کہ کوئی بھی عوامی شاعری ان اصناف میں نہ ہوئی۔ ملّائی یا مذہبی شاعری کا دور صرف مکتبہ درخانی والا رہا ہے۔

جواں سال کو اِس زمرے میں پیش کرنے کی زبردست کوششیں انھی حلقوں کی طرف سے ہوتی رہی ہیں مگر وہ بھی شیخ سعدی کے رنگ کے شاعر ہوئے، سند یافتہ حمد یا نعت گو شاعر نہیں۔

فلسفیانہ شاعری، ایک زبردست طاقتور عوامی شاعری ہے ۔مگر پاکستان کی مارشل لا حکومتوں نے اُس میں ایسی ایسی ملاوٹیں کروائیں کہ اُس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔توکلی مست کو دیکھیں، پہلوان فقیر کو دیکھیں ، جواں سال کو دیکھیں...... آسمان تک پہنچا دیتے ہیں یہ انسان کی روحانیت کو۔سرکاری ریڈیو ٹی وی نے ہماری اِس عوامی، زندہ، متحرک اور عملی شاعری کو Passive اور جمود کی قوتوں کا ترجمان بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

14- ذکر، اور، چوغان

چوگان ذکری بلوچوں کا ایک مذہبی گیت ہے۔اسے ''سپت'' یعنی صفت بھی کہا جاتا ہے۔ذکری بلوچوں پر عمومی طور پر تحقیق بہت کم ہوئی ہے۔ جو معلومات رسالوں، کتابوں یا بوڑھوں سے ملی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے:

ذکری فرقہ کے ماننے والوں کا تعلق غریب طبقہ سے ہے۔یہ محنت کش اگر شہر میں ہیں تو مزدوری کرتے ہیں، ساحلی علاقوں میں یہ لوگ ماہی گیری کرتے ہیں اور اندرونِ بلوچستان کھیتی باڑی، مال داری اور چرواہا گیری کرتے ہیں۔

اُن کے فرقے سے وابستگی یا عدم وابستگی سے ہٹ کر اُن کے خلاف کچھ بہت ہی حقیر قسم کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ذکری بلوچ ہیں اور وہ بلوچ ثقافت کے دلدادہ ہیں۔ان کے فرقہ کے سارے ادب آداب اور رسومات کی ادائیگی عظیم بلوچ غیرت کی چوکھاٹ کے اندر رہ کر ہوتی ہے۔دوسرے صوبوں کے ملّا لوگ خواہ جو پروپیگنڈہ چاہے کریں، سچ بات یہ ہے کہ ذکری بلوچ یورپی اور امریکی لوگ نہیں ہیں، یہیں کے بلوچ ہیں اور بلوچوں کے بھاری اور گراں قدر کلچر سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔اور یہ ممکن ہی نہیں کہ بلوچ ثقافت سے ہٹ کر رسومات کر سکیں۔

چوغان خدا، رسول، مہدی، مذہبی نیکیوں، کوہِ مراد اور اس کے قریب واقع قدیم ذکری روحانی راہنماؤں کی قبروں والے شہر تربت کی تعریف وتوصیف پر مشتمل گیت ہیں۔چوغان نرم رفتار قدموں کی حرکت کے ساتھ گائے جاتے ہیں جہاں لوگ ایک دائرے میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔بلوچ دیہی طرزِ زندگی نے عورت کو مکمل پردے میں ڈالنے کی فضول خرچی کبھی نہ کرنے دی، اس لیے عورتیں اپنے بھائیوں، چاچوں ماموں شوہروں کے ساتھ اس عبادت میں شامل رہتی ہیں۔

چوغان ہر اہم مذہبی تہوار میں گایا جاتا ہے۔27 رمضان کو، شبِ برات، عید وغیرہ پر۔ اِس دائرے کے مرکز میں ایک شادہ شدہ بچوں والی خاتون (شاعر) گاتی جاتی ہے۔اسے بہت بلند

آواز میں گانا پڑتا ہے اور اس کا جواب کورس کے انداز میں دائرے کے لوگ دیتے ہیں۔ سب اونچی اونچی آواز میں ایسا کرتے ہیں۔ یہ نغمہ قدموں کے ساتھ ملاپ میں بلند ہوتا جاتا ہے، نغمہ بھی تیز ہوتا جاتا ہے اور قدم بھی رفتار بڑھاتے جاتے ہیں۔ نغمے پہ نغمہ...... جب تک کہ وہ چُور ہو جائیں۔ قدموں کا آہنگ چلتا رہتا ہے۔ رات صبح ہو جاتی ہے تو آخری چوغان گایا جاتا ہے۔ جس کے الفاظ اس طرح ہوتے ہیں:

مومنانی شب گزشت (مومنوں کی رات گزر گئی)

اور کورس جواب دیتا ہے: شپ پہ عبادت گزشت (رات عبادت میں گزر گئی)۔

قدموں کی رفتار اور طرز کے لحاظ سے چوگان کی تین قسمیں ہیں: چرغی (گھومنا)، رووآئی (جانی اور آنا)، اور جہل و برز (نیچے اور اوپر)۔

چوغان سب کا سب بلوچی میں ہوتے ہیں۔ البتہ کچھ الفاظ عربی اور فارسی کے اس میں شامل ہوتے ہیں۔ سیکڑوں چوغان کے گیت موجود ہیں۔ مثال کے طور پر:

شاعر کہتا ہے، ''حبیبی ربی جل اللہ، مارامد بو یا اللہ''

اور جوابی (کورس) جواب دیتے ہیں: ''مارامد بو یا اللہ، لا الہ اللہ''

ایک اور چوگان کے بول ہیں: حبیبی ربی کردگار، دائم استیں برقرار

جواب:

دائم استیں برقرار

لا الہ اللہ

اسی طرح ایک اور چوغان کے بول ہیں:

سبحان نورے جل اللہ

جوابی: مارامد بی یا اللہ

ایک تیز چوگان یوں ہے:

شاعر: یاہُو

جوابی: اللہ ہُو

یہ سارے چوگان پرانے زمانے (تقریباً سترہویں صدی) سے چلے آرہے ہیں۔ کسی شاعر کا نام معلوم نہیں۔

حوالہ جات

1۔ گزیٹیر آف بلوچستان، لورالائی، 1986، گوشہ ادب، جناح روڈ کوئٹہ، صفحہ 117

2۔ مری، مٹھا خان۔ ثقافت اور ادب وادی بولان میں، بزم ثقافت کوئٹہ، صفحہ 73

3۔ بریسیگ، تاج محمد'' بلوچستان نیشنلزم In Its Origin & Development ۔2004۔ رائل بک کمپنی کراچی، صفحہ نمبر 23

بلوچی زبان و ادب

جلد دوم

کلاسیکل دور کا ادب

شاہ محمد مری

انتساب

گوہر جتنڑیں

کے نام

جس نے بلوچوں کو برادر کشی سے باز رکھا

پیش لفظ

دنیا کی دیگر ساری زبانوں کے ادب کی طرح بلوچی ادب اپنی ساری تاریخ میں ہماری کٹھن اور رنگین زندگانی کی عکاسی کرتا رہا ہے۔ زندگی، جو کہ انسان کا انتخاب نہیں، نزول ہے۔ اور بقول بیدلؔ:

زندگی در گردنم افتاد بیدلؔ چارہ نیست
شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن

زندہ رہنے کا یہی جبلی چیلنج انسانی سرگرمیوں کا محور و مرکز رہتا ہے۔ ہمارا ادب بھی یہی کچھ کرتا ہے۔ انسانی زندگی کو ہر طرف سے خطرات کی موجودگی بے مقصدیت کا موقع کہاں دیتی تھی؟۔ لہٰذا آغاز ہی سے حیاتِ انساں کی بقا و بہبود قدیم بلوچی ادب کا سنگِ بنیاد رہا ہے۔ بلوچی ادب راست بازی، راست گفتاری، غیرت و محبت، سخاوت و مہمان نوازی، ہمساخ (پناہ لینے والے) کی حفاظت، قول و قرار کی پابندی، عزم و استقلال اور اخلاصِ عمل کی تعلیم دیتا ہے۔ میر مٹھا خان مری سچ کہتا ہے کہ ''اس اعتبار سے بلوچی قدیم ادب، 'ادب برائے زندگی' کے مسلک پر کار بند ہے'' (۱)۔

بلوچستان کے قبائلی اور ماقبل قبیلوی دور کا انحصار مجموعی طور پر مویشیوں پر تھا۔ زرعی زمین کی اتنی اہمیت نہ تھی۔ اس لیے کہ زراعت بلوچ (انسان) نے بہت دیر میں شروع کر دی۔

بارشیں اپنی کنجوسی میں اس قدر سخی کہ چراگاہوں کی فراوانی کبھی نہ رہی اور مویشی کی تعداد بھی بڑھتی جاتی تھی۔ چونکہ چراگاہوں کی تلاش میں قبیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہتے تھے۔ اس لیے زرعی زمین سے ان کو لگاؤ اور تعلق نہ تھا۔

اُن کا دوست اور بیلی تو بارشیں تھیں، چراگاہیں تھیں اور مویشی کی پیاس بجھانے کی آب گاہیں تھیں۔ ان کی زندگی میں ٹھہراؤ نہیں بے قراری تھی۔ خانہ بدوشی نے ان کی جڑوں کو زمین کے ایک ہی ٹکڑے پر دیر تک پیوست نہیں ہونے دیا۔

شہر کا جواز بھی نہ تھا، اور جب یہ وجود میں آ بھی گیا تو بھی خیموں کے رہنے والے بلوچ شہر پر انحصار نہیں کر سکتے تھے۔ سال میں ایک آدھ دفعہ 'سات اور جلوٗ' کے لیے شہر یا منڈی جانا ہی بڑا ایڈونچر ہوا کرتا تھا۔ دور دراز واقع آبادی مدنیت سے بہت دور تھی۔ تعلیم کی ضرورت نہ تھی اور تربیت حسب ضرورت وہیں 'ورک پلیس' کے اوپر مل جایا کرتی تھی۔ حال احوال کی رسم خبر رسانی کے شوق ر ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ موسیقی سادہ اور کم آلات والی ہوتی تھی۔ شاعری کے موضوع یا تو جنگی ہوتے تھے یا بارش اور فطرت والے، اور یا پھر وجہِ بقائے انسان یعنی مہری اور عشقیہ۔

اس قدیم دور میں موسیقیت والے اشعار آتے ہیں جس میں لئی لاڑو، ہالو، لولی، ڈیہی، تاریخی واقعات پر مبنی اشعار، جنگی قصوں، ڈرامہ، طنز و مزاح اور پند و نصیحت کے اشعار ملتے ہیں۔ بلوچی قدیم و کلاسیکل ادب میں قصیدہ سرائی نہیں ملتی کہ دربار ابھی منظم و متشکل نہ ہوا تھا۔ بہت ڈائریکٹ، بہت سچی، رواں اور پر لطف شاعری ہوتی تھی۔ قبائلی نظام والی شاعری میں غزل و نظم و رباعی و ہائیکو وغیرہ نہیں تھے، طویل نظمیں ہوتی تھیں جن میں صرف بحر کا خیال رکھا جاتا تھا۔ جنگی شاعری کو اولیت ہوتی تھی اور ہر قبیلے کا ایک آفیشل شاعر ہوتا تھا جس کا قبیلے میں موجود ہر ریوڑ اور فصل میں سالانہ ٹُک یعنی ٹیکس ہوتا تھا۔ شاعر ہمیشہ قابلِ احترام اور روحانی بزرگ تصور ہوتا تھا۔

ہمیں معلوم نہیں ہے کہ بلوچی زبان کا پہلا شاعر کون تھا یا اولین ادبی دور کا سورج کب اور کس علاقے میں نکلا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ شاعری رندوں کے عہد کی شاعری سے ہزاروں سال پہلے موجود تھی جو کہ تاریخ کے موٹے لحاف کی شکنوں میں کہیں کھو چکی ہے۔

بلوچ میں رندوں کے عہد کی شاعری کو کلاسیکل شاعری کا درجہ حاصل ہے۔ ارتقا پذیر مال مویشی سے بھرے ہوئے رندوں کے پاس خوبصورت زرخیز زمین تھی اور وہ خانہ بدوشی کے ساتھ ساتھ آبادکاری کے پراسیس میں داخل ہو رہے تھے۔ اسی دور میں ہانی شہ مرید، بیورغ وگراناز اور شہداد و ماہناز نامی داستانیں آفاقی شاعری کے بہترین نمونے بنیں۔ یہاں پیغام بھجوانے والی شاعری ہمیں بہت ملتی ہے، جسے ''پسّو'' کہتے ہیں۔

مجھے اگر اختیار ملتا تو میں اِس دور کو بیورغ کا دور قرار دیتا۔ فطری طور پر ہمیں اُس عہد کی شاعری میں کئی اوصاف نظر آتے ہیں، بہادری، عاشقی، اور کرامت کا مالک ہونا، وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سب اوصاف اس دور کے شاعروں کے کلام میں انتہائی خوب صورتی سے پروئے ہوئے ملتے ہیں۔ بالخصوص وہ شاعری جو ماہ جبینوں کی سیاہ زلفوں کے پیچ و خم میں گم گشتہ اور محبوباؤں کے بدمست کرنے والے حسن میں جکڑ سے نکلتی تھی، وہ آج بھی وادیٔ عشق کے راہروؤں کے دلوں کو معطر کرتی ہے، آج بھی وہ اُسے گنگناتے ہیں۔ محبت اور عشق ہماری اِس کتاب کا موضوع تو نہیں ہیں، لیکن اس کتاب کو پڑھنے والا ہر فرد یا تو اس کے کھٹے میٹھے ذائقے کو یاد کر رہا ہوگا، یا پھر زندگی کے اِس سبک اندام دور سے گزر رہا ہوگا۔ محبت زندگی کا جواز اور انسان کی شناختی علامت ہوتی ہے۔ محبت کے بغیر انسان کا اشرف المخلوقات ہونا بے معنی رہ جاتا ہے۔ ادب کے ساتھ زندگی کا لفظ اٹوٹ ہو جاتا ہے۔ انہیں آپ جدا نہیں کر سکتے......اور محبت تو زندگانی کا دل ہوتی ہے۔

اُس دور کی شاعری میں شہ مرید نہ صرف اپنی محبوبہ ہانی کے لیے فریاد بھری صدائیں بلند کرتا ہے بلکہ رقیب کے حوالے سے میر چاکر کی ان تمام کارستانیوں کو بھی کھل کر بیان کرتا ہے، جو وہ سردار کی حیثیت سے اس وقت کے سماج میں نچلے طبقات کے افراد کے خلاف کر رہا ہوتا ہے۔ سردار چاکر لوگوں سے دولت بٹورتا ہے، شریف اور بہادر انسانوں کے خلاف سازشیں کر کے انہیں قتل کروا دیتا ہے۔ اور عشاق کی تڑپ سے کھیلتا ہے۔

اُس دور کے شعرا نے رند و لاشار کے درمیان لڑی جانے والی تیس سالہ طویل ترین تاریخی جنگ کی مفصل تاریخ بھی پیش کی ہے۔ جنگ کی ہولناکیاں، انسانوں کا درد، بہادروں کے

کارنامے، بزدلوں اور بھگوڑوں پر لعن وطعن، انسانوں کے درمیان نفرتوں اور وحشتوں کے رونگٹے کھڑے کرنے والے واقعات، جنگ کی پیدا کردہ قحط و بھوک، اور پھر جنگ کے نتیجے میں وطن بہ در ہونے والوں کے دلوں میں اپنی سرزمین کی تڑپ کو اس دور کے شعرا نے جس انداز میں پیش کیا، وہ آج ہمارا بیش بہا ادبی ورثہ ہے۔ یہ عہد زیادہ تر ڈرامہ کے صنف پر مبنی شاعری کا عہد تھا۔ لگتا ہے کہ ہر شخص اپنی زبانی اپنے کردار کے حصے کی شاعری کر رہا ہو۔ ایسا ڈرامہ جسے عام بلوچ سمجھتے ہیں، اس زمانے میں لوگ شاعری میں باتیں کرتے تھے۔ مگر یہ تو ممکن نہیں کہ وہاں ہر بشر شاعر تھا۔

اس قدیم بلوچی شاعری میں تخیل کی بلندی، نفسیاتی و داخلی جذبات کا شعور و شناخت، الفاظ اور ضرب الامثال کا لاجواب انتخاب اور سب سے بڑھ کر اُس دور کی اقدار اور رواجوں کا مفصل اظہار، ایسی باتیں ہیں جو ہم عصر دیگر زبانوں میں آسانی سے نہیں ملتیں۔ الفاظ کی نزاکت اور خوبصورتی، ان کا صاف وستھرا پن داخلی جذبات کا اظہار اور منظرکشی، اور خیالات کی واضح نقل و حمل کا یہ دور، بلاشبہ بلوچی شاعری کا سرچشمہ دور ہے۔

چونکہ سارا بلوچستان تاریخی حوالے سے ایک ہی وقت میں یکساں معاشی نظام میں نہیں رہا ہے اس لیے سبی میں جو دور پندرہویں سولہویں صدی میں تھا، وہ معاشی سماجی حالت کوہِ سلیمان کے قبائلی بلوچستان میں اوائل انیسویں صدی تک جاری رہی۔ یہ ایک رواں، مترنم اور پُر معنی شاعری کا دور ہے۔ یہ جنگوں کی شاعری کا زمانہ ہے، یہ عمیق محبت کی شاعری کا زمانہ ہے۔ یہ فطرت سے قربت کی شاعری کا زمانہ ہے۔

کلاسیک سمیت بلوچی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ گم ہو گیا ہے۔ پرانی شاعری کی تو بات ہی الگ ہے، ابھی حالیہ شاعروں میں مست توکلی کی شاعری کا بہت ضخیم حصہ فراموشی کی تہوں میں دفن ہے۔ جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے وہ ہمارے باپ داداؤں کا اپنے باپ داداؤں سے وصول کردہ ورثہ ہے جو نسل در نسل، قبیلہ در قبیلہ تبدیلیوں، اضافوں، تحریفوں اور ترمیموں کی وادیوں سے گزرتا ہوا ہم تک آیا ہے۔

بلوچوں پر کی گئی دوسروں کی شاعری تو قدیم زمانے سے ملتی ہے۔ مگر بلوچوں کی اپنی

قدیم شاعری تاریخ کی دھند میں گم ہو چکی ہے۔ ہمیں بس رند و لاشار عہد کی بلوچی شاعری دستیاب ہے۔اور یہ زمانہ پندرہویں اور سولھویں صدی بنتا ہے............ کیا زبردست شاعری ہے وہ۔ بالغ لٹریچر کا چھلکتا جام ۔اس قدر امیر، اس قدر متنوع، اس قدر پُر معنی، اس قدر رنگین اور اس قدر متغزل، کہ بس جھوم جھوم جائیے۔

تاریخی، فلسفیانہ، اور مذہبی تصانیف کے سوا ہر زبان میں نثری ادب یعنی ناول، افسانہ، تنقید اور انشائیہ کی تاریخ آٹھ سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔(2) لیکن شاعری اتنی ہی قدیم ہے جتنا ادب۔ادب کی پہلی صنف شاعری ہے۔

بلوچ کی بحیثیت قوم ایران سے مکران، مکران سے سبی اور سبی سے پنجاب و سندھ تک مہاجرتوں کی پنگ پانگ کہانی مسترد کیے جانے کے لائق ہے۔ایک آدھ قبیلے کا یہاں وہاں نقل مکانی کرنا البتہ قابلِ فہم ہے۔کچھ بلوچ کلانچ سے کیچ پہنچے اور 1485 کو انہوں نے مکران کو الوداع کہا۔ڈیمز نے اس ہجرت کی ہمعصر شعری داستانوں میں سے ایک کو جمع کرلیا:''ان جیالوں نے اپنی محبوب بیویوں سے کہا: اپنے ایوانوں سے نیچے اتر آؤ، اپنے غالیچوں اور خوبصورت تکیوں کو لپیٹ لو۔اپنے پیالوں اور مکرانی قدحوں کو لے آؤ......فیاض رندوں نے اپنی قبائیں اور پگڑیاں پہن لیں۔لمبی لمبی سرخ جوتیاں پیروں میں ڈالیں۔خود، ڈھال، تیر کمان، خنجر اور جملہ ہتھیاروں سے خود کو مزین کیا۔تب چالیس ہزار شہسواروں نے میر کی آواز پر گھوڑوں کو ایڑ لگادی''۔

تاریخ ہمیں پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں مکران کے میر جلال خان رند بلوچ کی اولاد میں سے میر شھیک کو عمر میرواڑی سے قلات فتح کرتا دکھاتی ہے۔یہ سولھویں صدی کے اوائل کا زمانہ تھا جب رند درہ بولان سے نکل کر ڈھاڈر اور سیوی میں پھیل گئے ۔بلوچوں کا دوسرا فرقہ لاشاری درۂ مولا کی راہ سے گنج آبہ (گنداواہ) اور گاجان میں آباد ہوا۔سیوی اور کچھی کا علاقہ نہایت ہی زرخیز اور شاداب تھا۔اس خطے میں کپاس کی کاشت ہوتی تھی۔گنداواہ تو زرخیزی کی وجہ سے گنج آبہ کہلاتا تھا۔کچھی اور سیوی کا علاقہ گھوڑوں کی ایک زبردست نسل کے لیے بھی مشہور تھا۔

سولھویں صدی میں چاکر کا چچازاد بھائی میر ہان ہمیں ڈھاڈر میں قیام پذیر ملتا ہے۔میر

ہیتان کے لوگ گلوشہر اور بکھڑو کے گاؤں میں اپنے خیمے نصب کیے ہوئے تھے۔ بیورغ کا ڈھاڈر اور مٹھڑی کے درمیان دریائے ناڑی کے مغربی کنارے پر پڑاؤ تھا۔میر بجار پڑ کی سکونت تلی کے پہاڑوں کے قریب سیوی کے مشرق میں تھی۔نوہانیوں کا سردار عومرا اپنے قبیلے سمیت درہ تلی کے قریب قیام پذیر تھا جو کہ گاجان کے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔کھیری، کورزمین اور پلیجی کے میدانوں میں تھے۔کورائی قبیلہ بھاگ نامی علاقے میں تھا۔اور کھوسوں کی بستیاں روجھان اور مانجھی پور کے قریب تھیں۔

دو بڑے قبیلے یعنی رند و لاشار، بلوچ کنفیڈریسی کے مضبوط ستون تھے۔میر شھیک کے تدبر اور بلوچ عوام کی بہادری نے جام نندہ (سمہ خاندان) سے کچھی کا علاقہ (سیوی سے لے کر کوہ سلیمان تک) اور دریائے حب تک کا سارا علاقہ فتح کرلیا تھا۔میر شھیک کے مرنے کے بعد سب نے مل کر میر چاکر کو اپنا سردار بنالیا۔رند اور لاشار کی آپس میں رشتہ داری بھی تھی۔میر چاکر کی دو بہنیں محترمہ بانڑی اور محترمہ مذی، لاشاری خاندان میں عبداللہ خان اور ھدّے سے منکوحہ تھیں۔ رند و لاشار امن و امان میں تھے، خوشحال لوگ تھے۔سیر و شکار میں مشغول رہتے تھے۔رند سیوی، شوران، ڈھاڈر، نرمک، بارڑی، کرتہ، سنی اور شمالی کچھی تک آباد تھے۔انہوں نے شہر بسائے اور قلعے تعمیر کیے۔

ان کے پاس غلام موجود تھے جو صاحبِ ثروت و اختیار مالک کے لیے کاشت کاری کرتے تھے، ان کی بھیڑ بکریاں چراتے تھے اور ان کے گھریلو کام کاج کرتے تھے۔بلوچ فیوڈلوں کے پاس سبی میں بے شمار گھوڑے تھے۔اسی طرح بھیڑ، بکری اور دنبوں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔ان کی مستورات قلعوں میں رہتی تھیں۔ان کے فرش قالینوں سے رنگین تھے۔ان کے ہاں بالشت، بستروں اور چادروں کا رواج تھا۔وہ یہ سارا سامان ایران سے منگواتے تھے۔ان کے برتن زیادہ تر پیتل اور جست کے ہوتے تھے (اُن دنوں مکران برتنوں کی صنعت کاری کی وجہ سے مشہور تھا)۔امیروں کے پاس سونے اور چاندی کے ظروف بھی تھے۔

جنگ کے وقت سرکردہ لوگوں کے پاؤں میں چمڑے کے لمبے بوٹ، بدن پر زرہ اور سر

پر فولادی نوکدار ٹوپی ہوتی تھی ۔ان کے فولادی ہتھیار چمکتے تھے۔ان کے گھوڑوں کی زین پر پیتل کا عمدہ کام ہوتا تھا۔ان کے کمر بند اور چمڑے کا سامان خوشبودار چمڑے کا ہوتا تھا جس پر سبز مخمل پر زردوزی کا کام ہوتا تھا۔وہ چمڑے کا یہ سامان ہرات اور شیراز سے منگواتے تھے۔ان کے پاس تیر وکمان، نیزے اور دودھاری تلواریں ہوا کرتی تھیں۔

شہسواری میں وہ باکمال تھے، چست و چالاک ۔ وہ باری باری حملہ کرتے تھے۔ جب کامیاب نہ ہوتے تو ایک دم حملہ کر کے دشمن کو پریشان کرتے تھے۔ان کے گھوڑوں کو نعل لگے ہوتے تھے۔ان کے پاس گینڈے کے چمڑے کی ڈھالیں ہوتی تھیں۔

جنگ سے فراغت کے زمانے میں اشرافیہ سے وابستہ لوگ سیر کرتے تھے،شکار کھیلتے تھے،گھڑ دوڑ کرتے تھے،عشق اور شاعری کرتے تھے،رقص اور موسیقی میں مشغول رہتے تھے۔وہ چوغے، دستار اور کمر میں قیمتی شالیں لپیٹ کر محفل میں بیٹھتے تھے۔ان کی کمر میں خنجر آویزاں رہتے تھے۔وہ زلفوں اور کپڑوں پر عطر ملتے تھے جو اکثر وہ قندھار سے منگواتے تھے۔ ان کی محفلوں میں موسیقی اور سرود بھی تھا، دنبیرہ اور سریندا بھی۔ان کے اشعار زیادہ تر بہادری سے متعلق ہوتے تھے۔ امیروں کی عورتیں کمخواب اور زربفت کا قیمتی لباس پہنتی تھیں۔سردار نہایت ہی فیاض اور مہمان نواز ہونے کے پابند ہوتے تھے۔میر چاکر رند اور میر نوذبندغ لاشاری کی سخاوتیں اب بھی مشہور ہیں۔ نوذبندغ کو اسی لیے ''زرزوال'' کہتے تھے۔

مکران والوں کے قافلے سندھ اور گجرات تک مشک ختن، ادویات اور کھجور کی تجارت کرتے تھے۔اس کے علاوہ بلوچستان چونکہ ایران اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے اس لیے یہاں کے خطرناک پہاڑی دروں سے ان ممالک کا تجارتی سامان ہمارے خانہ بدوش ساربانوں کے قافلوں کے ذریعے چلتا تھا۔ چنانچہ خراسان اور قندھار کے خشک وتر میورے یہی لوگ ہندوستان کی منڈیوں تک پہنچاتے تھے۔نقرہ وطلائی سکے ان کی گرہ میں بندھے ہوتے تھے۔

تجارت پر تو وہ آٹھویں صدی سے قابض تھے۔ابنِ بطوطہ کے وقت بھی قلات، کیچ، سیوی، گنداواہ اور ملتان زبردست تجارتی منڈیاں تھیں۔شام،عراق اور مسقط کا کیچ سے بیوپار چلتا

تھا۔ یہاں سے بلوچ ساربان ان ممالک کی چیزیں ٹھٹھہ، گجرات حتیٰ کہ بڑودہ تک لے جاتے اور وہاں کی پیداوار سے اونٹ لاد کر لاتے۔قلات، پورے خراسان کے میوہ جات کا مرکز تھا۔ یہاں سے میوے درہ بولان سے گزر کر ہندوستان جاتے تھے۔سیوی میں غزنی اور قندھار کا مال(جس کا سلسلہ ہرات، سمرقند اور بخارا سے تھا) آتا تھا۔سیوی میں اُس زمانے میں کپاس کی کاشت ہوتی تھی۔اس کے علاوہ بلوچستان کے دنبے یہاں سے ہندوستان اور سندھ کو فروخت ہونے کے لیے جاتے تھے۔گنداواہ کے گھوڑے اور اونٹ ہندوستان میں ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ملتان اُس زمانے میں کپڑے کی تجارت کا مرکز تھا اور بلوچستان میں زیادہ تر کپڑا ملتان سے آتا تھا۔

لفظ وسرگرمی میں بلوچ تاریخ میں رندی عہد شاید سب سے متحرک دور تھا۔اس میں انسانی حیات ہمہ پہلو لپک جھپٹ میں نظر آتی ہے۔سرگرم زندگانی نے ہر شعبہ کو گرم کیے رکھا تھا۔ شعر وسخن کی زبان بلوچی تھی۔اور کیا عمدہ شاعری تھی۔زندگی کی خوب صورتی کے بیان سے بھرپور شاعری ۔ بہت ہی بالغ ، بہت ہی پختہ اور بہت ہی سنجیدہ وسنگین شاعری۔ واقعاتی شاعری، کردار نگاری کی شاعری............اُس دور کی شاعری میں انتقام، مہمان نوازی، قول پہ پورا اترنا، اور پناہ میں آئے ہوئے کے لیے جان دینا سماج کی قدریں بھی تھیں اور شاعری کا حصہ بھی ۔ کچھ شاعروں کے نام معلوم ہیں کچھ کے نامعلوم۔مگر اسی عہد کی شاعری نے بلوچی زبان کو عالمی ادب کے نہ صرف برابر کھڑا کر دیا بلکہ اُسے بہت پہلوؤں سے ممتاز بھی بنا دیا۔

دوسرے لفظوں میں یہ زمانہ وہ تھا جب بلوچ، رند سرداروں کی رہنمائی میں اپنے بڑے بڑے رم، ریوڑ اور گایوں اونٹوں کے جتھوں (گورم اور بگ) کے ساتھ ساتھ زرخیز زمینوں اور سرسبز چراگاہوں کے علاقوں میں آباد کاری بھی کر چکے تھے۔اور خانہ بدوشی والی مویشی بانی کے ساتھ ساتھ زراعت پر مبنی مویشی بانی بھی شروع ہو چکی تھی۔ایک طرف گنداواہ کی زرخیز زمین تھی اور دوسری طرف سبی وڈھاڈر کے بیجی اور بولان دریاؤں کے دہانے تھے۔گندم کی فراوانی تھی اور سبزے کی بہتات۔بھیڑوں کی افزائش خوب تھی اور شیر وروغن فراوان۔بجی، شکار، تیر اندازی، گھڑ دوڑ، اکھ، محفل، دربار............یہ سب کچھ ادب کی ترقی کے لیے ایندھن تھا۔

اس دور میں امرا کی عورتیں کانوں میں سچے موتی کے زیور اور ناک میں زیور پہنتی تھیں۔ ہاتھوں میں مُندری، گلے میں چاندی کے طوق پہنتی تھیں۔

لفظ کی اہمیت بلوچوں میں بہت زیادہ ہے۔ بلوچ کے مقدسات وحساسیات میں جن عناصر کو اہمیت حاصل ہے ان میں لفظ اہم ترین ہے۔ ویسے بھی انسان نے تباہی کی جتنی خطرناک چیزیں ایجاد کی ہیں ان میں سب سے خطرناک چیز 'لفظ' ہے۔ خنجر اور نیزے خون کے دھبے چھوڑ جاتے ہیں، تیروں کو دور سے دیکھا جا سکتا ہے، زہر معلوم کیا جا سکتا ہے مگر لفظ بغیر نشان چھوڑے برباد کرڈالتا ہے۔ بلوچی ضرب المثل ہے کہ: دف کلائے، دف بلائے (منہ کرامت بھی ہے، منہ بلا بھی ہے)۔

ہمارا کلاسیک کا یہ پورا دور ایک خاص امتیاز یہ رکھتا ہے کہ وہاں اشرافیہ کے ہر قابلِ ذکر نوجوان نے ایک قول دے رکھا تھا اور اُسے پالنے اور اُس پر پورا اترنے میں اپنے سرومال قربان کردیے تھے۔ مثلاً:

*ھیبو تان رند نے قول دیا کہ: کہ اگر کسی کا اونٹ میرے اونٹوں کے گَل میں آجائے تو میں اسے واپس نہیں کروں گا۔

* جاڑو نے قول دیا کہ: اگر کسی نے میری داڑھی کو ہاتھ لگایا تو میں اُسے جان سے ماردوں گا۔

*نوذبندغ سخی نے قول دیا تھا کہ: اگر کسی نے میرے شانوں کو ہاتھ لگایا تو میں اسے قتل کردوں گا۔

*شہ مریذ کا عہد تھا کہ جمعرات کو صبح سویرے بھکاری مجھ سے جو بھی مانگے گا، دے دوں گا۔

اومنی شاہی ہمدلیں یاراں
رِند و لاشارئے لسّ ئے سرداراں
قصوے اولی نیں مس گیر اراں
گوں اویشا نی وشیں اسراراں

اولی رند انی ھکل و جاکا
آں کیہ راہنگیں چاکر ہ وا کا
قول کشہ میرانا پرے نشکا
آں کسے نیاڑی گوں سرئے مشکا
مولداں بشکیشہ کناں مُختا
قول کتہ جاڑو آ جڑیں مستا
آں کہ مئیں ریشانہ بجنت دستا
زندغہ نیلا نیں دلہ کستا
گپتغنت ریشا اوکُشی بچا
قول کشہ میر عالی مزن مِنگہا
آں کسئے ڈاچی بئیث منی بگا
قولیں کہ ہچ کسہ نہ دیاں سگا
حدے آ باری ے کشہ کچھا

ترجمہ:

اے میرے معزز ہم دل دوستو
رند ولاشار کے سارے معززین!
میں ایک پرانی بات یاد دلاتا ہوں
امید بھرے میٹھے اسراروں کے ساتھ
گذشتہ عہد کے رند کا نعرہ اور بات تھی
چاکر کا حکم چلتا تھا
میران نے قول دیا
جو بھی خاتون سر پہ مشکیزہ اٹھائے

اسے مفت میں لونڈی بخش دوں گا

الھڑ نوجوان جاڑو نے قول دیا

جو کوئی میری داڑھی چھو لے گا

اُسے زندہ رہنے نہ دوں گا

داڑھی چھونے پر بیٹے کو قتل کر دیا

میر آلی بڑی شان والے نے قول دیا

جس کی اونٹنی میرے بگ میں آجائے

قول ہے کہ واپس نہ کروں گا

حدے نے کچھ میں حکمرانی کی

کلاسیک تو بہت لطف کی چیز ہوتی ہے۔ ہماری ادبی تاریخ کی یہ پوری صدی انہی قولوں کی پاسداری کی صدی تھی۔

یہ دور دراصل ہماری کلاسیکل داستانوں کے عروج کا دور ہے۔ بلوچ کی ڈیڑھ درجن سے زائد عالمی سطح کی داستانوں کا نصف اسی پندرھویں، سولھویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسا خوب صورت عہد جو ابد تک بلوچ زندگانی پہ قطب کے ستارے کی مانند دمکتا رہے گا۔ بلوچ کے خیر خواہ کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ معاشی عنصر کے بعد اگر کوئی چیز اُس کی قوم کو شادان و شاداب مستقبل کی راہ دکھا سکتی ہے تو وہ تاریخ دار مرحلوں پہ مشتمل اُس کا ادب ہے۔ بلوچ کا بدخواہ سمجھ لے کہ بلوچ کو صرف اُسی وقت تباہ کیا جا سکے گا جب پندرھویں سولھویں صدی کا اُس کا ادب اُس کی زندگی سے حذف کیا جائے گا............مگر کیا یہ ممکن ہے؟۔

بلوچی زبان ہی کی طرح بلوچ فوک اور کلاسیکل ادب بھی بہت دلکش، متنوع اور امیر وغنی ہے۔ وہ تو خیر اب جدید بلوچی ادب میں بھی کافی ترقی ہو رہی ہے، مگر میرا خیال ہے اس پورے خطے کی زبانوں میں بلوچی وہ واحد زبان ہے جس کا فوک اور کلاسیکل حصہ بہت وسیع وعمیق و رنگین ہے۔ سولہ سے لے کر انیس تک، شاعری سے لیس ایسی بھرپور داستانیں ہیں جن پر بین الاقوامی سطح

کی فلمیں بنائی جا سکتی ہیں، ناول لکھے جا سکتے ہیں اور لغات اور ضرب الامثال کی بے شمار جلدیں مرتب کی جا سکتی ہیں، اور ایک پوری زندگی ان کو یکجا کرنے اور مقبول بنانے پر لگائی جا سکتی ہے۔ ....اگلی نسل کے بے شمار لوگوں کو وقف ہونا ہو گا اِس پُر لطف دنیا پر۔

اس قدر خوب صورت و درخشاں ماضی پر اگر مضبوطی سے پیر جمائے ہوئے ہوں تو آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ بہترین ناول نویسی اور فلم سازی کر سکتے ہیں۔ ریسرچ، شاعری اور ڈرامہ نگاری کر سکتے ہیں، بڑے اعتماد کے ساتھ۔ مگر اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ اُسی زمانے کو واپس لانے یا خود اُس زمانے میں جانے کی کوئی خواہش کی جائے۔ وہ زمانہ نہ صرف بدل گیا بلکہ اس زمانے کے ساتھ ساتھ اُس کا پورا پیکج بھی بدل گیا۔ وہ سماج اور اُس کا معاشی نظام نہ رہا تو اُس کا فن و ادب بھی قابلِ استعمال نہیں ہے۔ وہ ادب اب کلاسیک ادب ہے۔ جس سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے، جس میں موجود عالمگیر صداقتوں کو رجعت و قدامت کی گرد سے جھاڑ پھونک کے ذریعے الگ کر کے جدید میں شامل کیا جا سکتا ہے، اور اُس کے قدیم کمیونزمی حصے کو مستقبل بعید کے جدید کمیونزمی عہد میں برتا جا سکتا ہے۔ لیکن لوٹ کر اُدھر جانا بلوچ دشمنی ہے۔ یا اُس دور کو واپس لانے کی خواہش بدترین قدامت پرستی ہے۔

کتابیات

1۔ مری، مٹھا خان، ثقافت اور ادب وادی بولان میں، بزم ثقافت کوئٹہ، صفحہ 135

2۔ صدیقی، محمد علی، توازن، 1976، ادارہ عصرِ نو کراچی، صفحہ 59

ہانی، شہ مرید

Haani - Sheh Mureez

جن دوستوں کا خیال یا دعویٰ ہے کہ بلوچی میں ناکام محبت موجود نہیں ہے، وہ بھی میری طرح بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔سسی اور رابعہ خضداری سے ہوتے ہوئے آپ شہ مرید تک پہنچ جائیں اور وہاں سے مست توکلی کے دربار تک آجائیں، آپ کو محبت میں ایسی ناکامیاں ملتی ہیں جو قرنوں تک محبت بھرے دلوں سے آہیں نکالتی جائیں گی۔

بلوچی میں چاکر کا درجہ بہت بلند ہے۔ہم سب اُسے 'چاکرِ اعظم' کہتے ہیں۔عام بلوچ بلکہ بہت سے عالم لوگ بھی اُسے بلوچوں کا جدِ امجد بھی کہتے ہیں۔مگر اُس سب کے باوجود ایک اتنا بڑا داغ اُس کی سوانح عمری سے چپکا ہوا ہے جو نہ نوخاف کے معطر و صافی پانی سے دُھل سکتا ہے اور نہ ایرانی سرف و صابن سے۔عام و خاص جب بھی شہ مرید و حانی کی عشقیہ داستان پر آجاتے ہیں تو اُن کے دلوں سے چاکر کی ساری قدر کرامت لمحہ بھر کے لیے بھاگ جاتی ہے۔اُس کی ہیروگیری پر بہت بڑا سوالیہ نشان نمودار ہوجاتا ہے۔

لازوالی چاکر کے حصے میں نہ آئی۔ بلکہ اُس ٹریجک محبت کی شاعری نے اُس کی بجائے

شہ مرید اور حانی کو امر کردیا۔محبت کی ناشاد گزیدگی نے شہ مرید کو بعد کے آنے والے شاعروں عاشقوں کا انسٹرکٹر بناڈالا۔جام اور مست اُس کی درخشاں مثال ہیں۔لیکن بے شمار اچھی باتوں کے ساتھ ساتھ بلوچی شاعری میں پژمردگی، پس پائی، عدم جدوجہد اور تسلیم و رضا کی آخری حد تک کا فلسفہ بھی، شہ مرید کی دین ہے۔

ایک بات واضح کردوں کہ بلوچی کلاسیک میں کوئی بھی داستان خالص مہر والی نہیں ہوتی۔ہمارے ہاں بزم کے ساتھ رزم لازمی رہا ہے۔ہانی اور مرید کی مہری داستان بھی اسی زریں ادبی عہد سے متعلق ہے۔ہانی، مندو (Mandav) کی بیٹی تھی۔حُسن کی نعمت بھی اُسے حاصل ہوگی، مگر اُس کی اصل شناخت تو عقل و دانش، تدبر و برداشت اور حیرت انگیز وفا جیسی صفات سے ہے۔مرید، مبارک کا بیٹا تھا۔وہ ایک شمشیر زن، قبائلی نوجوان، تیر کمان کا مالک، (لوہیں کوانہ واڑہ)، زبردست گھڑسوار، اور ایک صابر و جفاکش شکاری تھا۔

مرید و ہانی باہم منگیتر اور محبّ تھے............ میٹھے محبوب، لطیف محبت میں غرق، بے پرواہ جوڑی۔زندگی عام بلوچ کی سی تھی۔شکار کا شوقین مرید تیرکمان کا زبردست نشانہ باز ہے۔اور حانی ایک عام بلوچ دوشیزہ جس کی عقل مندی اور فراست نے ابھی آگے جاکر آشکار ہونا تھا۔

یہاں چاکر، رند کا سردار تھا، قوت اور اقتدار کا مالک۔شکار کا شوقین، تلوار کا دھنی............اور جی بھر کر سازشی بھی۔وہ شہ مرید کا پکا دوست تھا۔شکار ساتھی۔(اور یہ شکار ساتھی ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے والے دوست ہوتے ہیں۔ایک دوسرے کی محبتوں کے راز داں، پیغام رساں اور محافظ!)۔

سبی ہے، گرمی کا موسم ہے، اور گندم کی کٹائی ہو رہی ہے۔چاکر کو شکار کی سوجھی۔وہ مرید کو ساتھ لیتا ہے اور صبح سویرے شکار کرنے روانہ ہوجاتا ہے۔

چاکر شکارا سمبری
زیری مریذا سنگتی

ترجمہ:

چاکر شکار کو تیار ہو جاتا ہے
مرید کو ساتھ لیتا ہے

وہ دونوں ’شکار فیلوز‘ پہاڑی بکروں، ہرنوں کے شکار کے لیے سبی کے شمالی پہاڑوں پر نکل جاتے ہیں۔اور موسمِ گرما کے دن کا بڑا حصہ شکار کھیلتے ہیں۔ڈھلتی دوپہر کو وہ تھکے ہارے واپس آتے ہیں۔سخت پیاسے ہوتے ہیں۔چاکر کا سسر (جس کا نام معلوم نہیں، اور نہ ہی اس کی منگیتر کے نام کا پتہ ہے) اور مندو (مرید کا سسر) کے گھر، راستے میں پڑتے تھے۔چونکہ کٹائی کا موسم تھا، اس لیے سب لوگ اپنے کام کاج کے سلسلے میں گھر سے باہر تھے۔لیکن دونوں کی منگیتریں اپنے گھروں میں موجود تھیں۔بلوچ میں نکاح سے قبل، اور بالخصوص بڑوں کی غیر موجودگی میں اپنی منگیتر کے گھر جانا ٹھیک نہیں سمجھا جاتا تھا۔اس لیے فیصلہ ہوا کہ چونکہ اپنی منگیتر کے گھر جانا معیوب ہے، اس لیے دونوں ایک دوسرے کی منگیتروں کے گھر پانی پینے جائیں گے:

تہ گوئر منی منگا برو

مس گوئر تئی منگا رواں

پانی پی کر واپس ہوتے ہیں تو چاکر غصے میں آگ بگولہ نظر آتا ہے۔رند کا مضبوط سردار طیش میں ہوتا ہے۔معلوم ہوا کہ مرید کی منگیتر ہانؔی نے کٹورا خوب صاف کر کے پانی سے بھرا تو بہت سلیقے سے تھا مگر پھر اس پر جان بوجھ کر بہت سے تنکے توڑ توڑ کر ڈال دیے۔چاکر کو سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔پیاس سے بدحال چاکر کو پانی پینے میں بہت دشواری ہوئی اور تنکوں کو بار بار پھونک کر دور کرنا پڑا۔یوں اُسے ٹھہر ٹھہر کر وقفے وقفے سے پانی پینا پڑا تھا۔اُس نے اِسے گستاخی اور شرارت جانا اور لہٰذا وہ سخت طیش میں تھا۔

مگر جب اُس نے مرید کو قے کرتے دیکھا تو حیرت سے وجہ پوچھی۔اُسے اندازہ ہوا کہ ہانی کے برعکس چاکر کی منگیتر نے بغیر تنکے ڈالے کٹورا بھر کر مرید کو دیا اور پیاسے مرید نے بغیر وقفے کے غٹا غٹ پی لیا۔اس لیے اُسے الٹی آئی۔

چاکر تو حیرت میں ڈوب گیا۔وہ ہانی کی اِس عقل مندی اور فراست سے بہت متاثر ہوا۔

اور اس کے ذہن میں یہ شیطانی خیال آیا کہ کسی بھی طرح وہ ہانی کو حاصل کرے گا۔(غور کیجیے...... دنیا میں ہر جگہ عورت کے حسن اور اداؤں سے مرعوب ہوا جاتا ہے، جبکہ یہاں اُس کے برعکس عورت کی عقل، صلاحیت اور ذہانت کشش کا باعث بن رہی ہے!!)۔

مگر عورت، مردانہ سماج میں تو بہر حال کماڈٹی ہی ہے، چیز ہے، انسان نہیں۔اُسے ہتھیا لینا مردانگی ہے، خواہ حسن کے نام پر ہتھیا لو، خواہ عقل و فراست کے نام پر۔

چنانچہ چاکر اِسی تدبیر میں لگ گیا۔وہ دن رات مرید کی منگیتر چھین لینے کے بارے میں غور کرنے لگا۔شیطان انسان پہ حاوی ہو چکا تھا۔اُس نے اپنے شیطان صفت صلاح کاروں سے مشورے مانگے۔دھوکہ سب سے بڑا ہتھیار بنا۔

سب جانتے تھے کہ مرید اپنے قول و قرار کا بہت پابند نوجوان تھا۔لہٰذا اسی پہلو سے اُس پر حملہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔تب ایک روز چاکر نے ایک محفل جمائی جہاں مرید بھی موجود تھا۔بھنگ کے دور چلے اور عین نشے کی حالت طاری کرا کے چاکر نے لوگوں کے سامنے بلند آواز میں اپنی تلوار مرید کو بخش دی۔نشے میں دُھت مرید نے بھی ایسا ہی جواب دیا، پھر چاکر نے اپنی گھوڑی اُسے بخشی۔مرید نے بھی جواباً یہی کیا۔تب چاکر نے اپنی منگیتر اُسے بخش دی۔..........اور مرید نے اپنی ہانی اُسے بخش دی اور اپنی دنیا اندھیر کر لی۔

ہم کہانی کی رَو میں نہیں بہتے، ایک لمحہ کو توقف کرتے ہیں۔یہ سوچنے کو کہ یہاں سماج اپنے ارتقا کے کس دور سے گزر رہا ہے۔اور عورت کی حیثیت سماج میں کیا ہے۔تو معلوم ہوا کہ یہاں سولھویں صدی کے بلوچ سماج میں عورت کو تحفے میں دینے اور لینے میں سماج نے کوئی ردِ عمل نہ کیا۔کیا یہ محض سردار کی طاقت اور زور آوری کی وجہ سے تھا، یا اس زمانے میں منگیتر پر شوہر کا اتنا حق ہوا کرتا تھا کہ وہ اگر چاہتا تو اسے کسی اور کو دے دیتا؟۔ہمیں ثانی الذکر بات کے کوئی اور شواہد نہ ملے۔

بہر حال، محبوبہ کی مرضی ہو نہ ہو پبلک کے سامنے تو تحائف کا تبادلہ ہو چکا تھا۔مارشل لا بھی تو مروجہ قانون کی شقوں سے کھیل کر لگایا جاتا ہے۔یہاں تو بطور گواہ ایک دو نہیں پوری محفل موجود ہے۔چاکر مروج فیوڈل قانون کے تقاضے پورا کر چکا تھا۔

ہانی کی مظلومی دیکھیے، ایک اُسے تحفے میں دیتا ہے اور دوسرا وصول کرتا ہے۔جبر دیکھیے،

کہ محبّ ومحبوب کی مرضی کے برعکس وقت کے حاکم نے ہانی سے شادی رچالی۔

اُدھر جب مرید کے ہوش ٹھکانے آتے ہیں تو وہ تاسف وپشیمانی کی علامت بن چکا ہوتا ہے۔ وہ تو اپنی دنیا اجاڑ بیٹھا تھا۔ سمت اور قبلہ گم کردہ مرید ایک بار پھر حانی کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ ایک بار پھر وصلِ یار کی راہیں ڈھونڈتا ہے۔ وہ حانی سے اپنے عشق کو نہ چھپا پاتا ہے اور نہ اُسے صبر وقرار نصیب ہوتا ہے۔............لیکن ہانی تو برسرِ عام اب کسی اور کی عزت بن چکی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ وہ مرید کے ساتھ مزید روابط نہیں رکھ سکتی۔ اور اگر یہ ممکن ہوتا بھی، تو، محبوب کی طرف سے اس قدر تذلیل کے بعد وہ اس سے روابط رکھتی بھی کیوں؟۔ ہانی پر مرید ہی کی مسلط کردہ سردمہری، معروض کے مارے مرید کو برباد کرتی ہے:

نوذاں دلی دروہے کشہ
گپتیش مناں مس بے دہاں
مینت ایش منی لوہیں کواں
دستئے رواؤ گوں چیڑ واں
جاں گوں ہزار ویسیں گنڈاں
نمی وساڑتیں سیلہا ں
گوارنت وپز گڑ دے کناں
جانوں مزار ی چنڈ شہ
شیری اوں تلہا روکشہ
چم ماں ہواں بُرجا جشہ
کہ حانی ہموذیں کیغذیں
حانی کہ منّتے کناں
منت وزاری اے کناں
اڑ مامہ پُلیے پُل چنا ں

کہ باغا ہموپل چنتغہ
امبا زغوں پُل پر کشہ
پلاں منی پاغ بیر میں
تئ ہارئے چُلمب دردانغیں
یہ عشقا تئ پر وانغا ں
ماراں گوں دستا نہ گراں
سیا ہ ماروں دستئے چابکا ں
ہانی جنکانی سروخ
ہانی منی رعدیں گروخ
ماں تانہی نوذاں جنوخ
لُہمیں غمانی دیر کنوخ
ہانی ترا شاہہ سریں
اڑما سری آ جُھنڈمہ خاں
مارا پہ نیم چمی مہ چار

ترجمہ:

بارش نے ایک دھوکہ دیا
مجھے بیاباں میں آن پکڑا
میرا مضبوط کمان بھگوڈالا
میرا رباب اپنے پوش کے ساتھ
بدن خوب صورت لباس کے ساتھ
نم اور ٹھنڈک، سیر و سیاحتوں میں
برس کر واپس لوٹتی ہیں

میں نے شیر کی طرح بدن جھٹک دیا
شیر کی طرح چُست ہوا
آنکھیں اُسی برج پر مرکوز کیں
جہاں حسین ہانی رہتی ہے
ہانی میں التماس کرتا ہوں
منت وزاری کرتا ہوں
مجھ سے گل چیں نہ چھین
میں نے باغ سے ہر نوع کا پھول چُن لیا
اپنا دامن پھولوں سے بھرا
میری بڑی دستار میں پھول
تمہارے ہار کے کناروں پہ پھول
تمہارے عشق میں پروانہ ہوں
ہاتھ سے سانپ پکڑتا ہوں
کالے سانپ مرے ہاتھ کے چابک ہیں
ہانی، اے لڑکیوں کی سربراہ
ہانی، اے چمکتی آسمانی بجلی
جو دور بادلوں میں چمکتی ہے
جلا ڈالنے والے غموں کو دور کرنے والی
ہانی تمہیں حضرت علیؓ کا واسطہ
مجھے دیکھ کر دوپٹے سے چہرہ نہ چھپا
ہم سے سرد مہری نہ کر

آیئے ذرا ہم تحفے میں بخشی جانے والی ہانی کے دل کی حالت کا اندازہ لگائیں۔ اس سے زیادہ تذلیل بھلا اور کیا ہوسکتی ہے کہ آپ ایک اشرف المخلوقات انسان کو، اپنی پیاری ہستی کو، خود اپنی محبوبہ کو، بھنگ کے نشے میں بدمست ہوکر، تحفے تحائف کی صورت کسی دوسرے کو دیتے پھریں۔ اُس محبوبہ پر کیا گزرتی ہوگی جس کا اپنا محبوب بغیر کسی وجہ اور سبب کے اُسے ایک بکری کی طرح دوسرے کو تحفہ کردے؟۔

ہانی تو کم تری کے احساس میں غرق ہوگئی۔ دل میں موجود طرب کے سارے تار ڈوب گئے۔ شوق، طلب اور خواہش کی ایک ایک رمق تذلیل کی حدت سے بخارات بن کر ہوا ہوگئی۔ بس ایک بے دل بُت، ایک بے روح جسم..........اور درندی دنیا!!

اب مختصر ترین بات میں ہانی کا طویل بیانیہ سنیے جس میں پورا سماج، سماجی رویے اور سماجی قدریں آجاتی ہیں:

گالی امُل دردانغیں
تئ کیٹّیں سروزِرہیں گُنا ل
دِ شتا ر غئے نامہ سرا
پہ درکغا باہ داثغا ل
گو ں شئے ثنا ئی سیر غاں
دانکو مناں ثی خاہش اث
شیہا منی غورہ نہ کث
تا ں مڑ وثی جوائیں شئے آں
لوغئے املیں مڑدماں
پہ داذو بشکیشاں دیاں
بوروں گوں تاسیں درواں
وثی جانئے امیری ولز ہاں

دستئے کواں گوں جابہا ں
پہ بشکغا مڑ دِاش دیا ں؟

ترجمہ:

انمول، دردانہ ہانی کہتی ہے
تم نے اپنے اُسترہ دیے سر اور زرہ
منگیتر کے نام پہ
اچھل کود میں ہار دیے ہیں
اپنی سیر شکمی لاپرواہی میں
جب تک مجھے اپنی خواہش تھی
شیہہ میرے بارے میں سوچتا تک نہ تھا
بھلا کوئی اپنی اچھی چیزوں کو
گھر کے محبوب ترین فرد کو
تحفے اور بخشش میں کسی کو دیتا ہے؟
بھلا کوئی اپنی گھوڑی اور زریں لگام وزین کو
اپنے جسم کے امیری اسلحہ کو
ہاتھ کے تیر کمان اور تیر کو
بخشش میں کسی کو دیتا ہے؟

اس جواب نے، صرف سولہویں صدی کے شیہہ مرید کو بھسم نہیں کیا، بلکہ پانچ صدیاں گزرنے کے بعد میں آپ بھی اِس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مرید، ارض وسما کی مشترکہ چالبازی کا شکار، بے بسی کے گنبدِ بے در میں بند۔ وہ اب کیا کہے:

گو ئشتہ مریذیں پُل گذا
ہانی مناں تیراں مہ جاں

شلیں نہاں مس ڈوبرا
اے ڈول منی ساھہ نہ رو
زیرے تہ وثی جودئے جغا
دز گیث دوگوشیں خنجرا
میر چاکرئے سوزیں لُڑا
شِل دئے منی پاکیں کشاں
ہون پہ ہُلکاّنہ رشاں
پاک کس گوں شارئے پلوا
دست گوں زواذیں تنگواں
ہنی رژیں موڑ دانغاں
دریپاں تئ دیما کفاں
چُٹاں ثرہ تئ دڑدو غماں
ہانی تئ کلہ دفا

ترجمہ:

کہا سفید لباس مرید نے
ہانی مجھ پر تیر نہ چلا
میرے سینے کو نشانہ بنا کر نوکیلے تیر نہ مار
اس طرح میری جان نہیں جائے گی
تم اپنے خاوند کا تیر کمان لے لو
دو گوش خنجر لے لو
یا میر چاکر کی سبزی مائل شمشیر
میرے پاک پہلو کے پار کر

(تا کہ) خون ابل کر بہے
دھڑام سے تمہارے سامنے گر جاؤں
تمہاری یادوں کے غم سے نجات پالوں
تم دوپٹے کے پلو سے خون صاف کرنا
سونا پہنے معطر ہاتھوں سے
حنا لگی انگلیوں سے
ہانی تمہارے گھر کے سامنے

پشیمانی اور خجالت کی وسعت کہاں بیان ہوسکتی ہے۔کون ناپ سکا ہے محبوبہ سے محبت کرنے والے محبوب کے دل کی نرمی کو۔ٹھنڈی آہ کی طوالت و گہرائی کو کون ماپ سکا ہے۔شکست کا رنج کون لکھ سکا ہے۔فراق کی حدت کونسا تھرمامیٹر سہہ سکا ہے!

شہ مرید کا بیانیہ جاری ہے، پڑھیے اِسے۔اِس پورے منظرنامے کی اگلی قسط بھی تو ہے۔ اُسے پڑھنا ضروری ہے۔بلاشبہ اُس کے لطیف خیالات ہماری روح کو بہت ہلکا پھلکا کردیتے ہیں..........مگر دل تو بہت بھاری ہوجاتا ہے ناں:

صحوی کہ بیایاں دز گھوار
شاری و دا بانی شلی
لڈوخ وڈُریں مہلوی
ماہیں مُذ ی وُمہر وی
اَشتو ہے پولا کناں
''شیہہ ننگریں کئیا کُشتغا
کسی بذائیا نہ یا''
اژ وث میارا دیر کنئے
''شیہہ پہ شفانی چرغا

ماگوں میاراں پلشہ
میر چاکرئے بورا جشہ''

ترجمہ:

اور جب صبح کو سہلیاں آجائیں
شاریؔ آئے، اداؤں بھری شلیؔ آئے
وہ خوب صورت چال چلنے والی مہلوؔ
ماہ رنگ مُذیؔ اور مہروؔ
اور تم سے یہ پوچھیں
''بڑی شان والے شیہہ کو کس نے مار ڈالا
وہ تو کسی کی برائی دشمنی میں نہ تھا''
تو تم اپنے آپ سے تہمت دور رکھنا
(کہنا)''شیہہ کو شب گردی سے
ہر وقت روکتی رہی ہوں
میر چاکر کی گھوڑی نے اسے مار دیا''۔

اللہ اکبر! یہ ڈرامائی شاعری یونانی اساطیر کے جملہ ادبی سرمائے پہ بھاری ہے۔اَسکائی لس کا پورا قومی ادبی خزانہ اور ہمارا ایک مرید وہانی، برابر نہیں ہیں۔کیا میں مبالغہ کر رہا ہوں؟۔چلیں دیکھتے ہیں حتمی بات۔آخری اعلان۔ہوش وہواس کی آخری سرحد پر عاشق کی آخری وصیت:

جاگن و جوگی بیثغاں
مس کہ گنوخ شل بیثغاں
پرمس میاریں عالماں
ملّا او ہنگیں کاغذاں
مر ضاں حکیم دراھہ کناں

ٹپاں طویو درماں کناں
مار واڑتغیں گوں ماندریاں
جتاں پخیر گار ہ کناں
پر عشقئے گنوخ دراھہ نہ واں
مں دراہ بیثغیا نیئثغاں

ترجمہ:

میں اگر مجنون اور جوگی بن گیا
میں اگر پاگل ہو گیا
(تو) میرے لیے عالم نہ لانا
ملاّ کو ھینگ لگے کاغذوں کے ساتھ نہ لانا
حکیم امراض کو ٹھیک کرتے ہیں
زخموں کا علاج طبیب کرتے ہیں
سانپ کاٹے کا علاج منتر والا کر سکتا ہے
جن اگر آ جائیں تو فقیر لوگ انہیں نکال سکتے ہیں
لیکن عشق کے دیوانے تندرست نہیں ہوتے
میں نے آج تک ایسے کسی مریض کو تندرست ہوتے نہیں دیکھا

تو پھر؟۔انہیں مرنے دیا جائے؟، پاگل ہونے دیا جائے؟۔ یا پھر کوئی چارہ ہے، کوئی چارہ گر ہے؟۔ ایسی بڑی پہیلی کا جواب بھی تو شیہہ مرید ہی دے سکتا ہے۔ آیئے اُسی فلاسفر سے رجوع کرتے ہیں:

دانکو کہ دوست دستامہ گیڑ ت
داں گورغیں گلا مہ باڑ ت
دستئے سر ے شیرا مہ ذا
وثی کا غذ یں رکا ں منہ ذا

ترجمہ:

جب تک کہ محبوبہ ہاتھ نہ تھامے
اپنے خوب صورت خیمے تک نہ لے جائے
بازو سر کے نیچے نہ رکھے
اپنے باریک ہونٹ نہ دے

بلوچ کلاسیک تو ایک رواں کہانی ہوتا ہے۔ یہاں کہانی کا کیا ہو گیا؟۔ارے کہانی آگے چلتی ہے۔مناظر تبدیل ہوتے جاتے ہیں، ڈرامہ آگے بڑھتا ہے۔ایک اور خوبصورت منظر، ایک اور دلفریب قسط:

وسمئے امل مچ بیثغاں
کہ ہانی بیا سیلا بروں
ہانی گشی در دانغیں
سیلاں ہواں کا ڈہ کنا

ترجمہ:

بستی کی دوشیزائیں جمع ہوئیں
ہانی چلو سیر کو چلیں
دردانہ ہانی کہتی ہے
سیر پہ تو وہ حسینائیں جائیں
جو............

آہ............آگے میں وغیرہ وغیرہ لکھ لیتا ہوں۔ بلوچی زبان کے کلاسیک حصے کے غنی ہونے کے تصور میں آپ کو دو گھڑی رکنے کا کہتا ہوں............اب آگے پڑھیے:

گہا ران و جیڈ ی امسراں
آتکو ماں دستا گپتغاں

سُہر جموِیں داثیش گرا
شاریں سر ی اے مس سرا
گنڈی اوہارے مس گرا
کشتیش لوغا ژہ درا
پہ سیل وسوادھ ولڈ غاں
ہانی گوں صحوی کند غاں
چو درینے ماں جیڈی امسراں
گوں تنگو و مروا ذراں
شا نگو ملنگا ں صرف کشہ
شیہہ پہ سرئیں دیوانغیں
درنزی دوئیں کوفغ سراں
شیہا مناں پچھا ڑتغا
مس دِہ گوانی بیثغاں
گہا راں مناں لوغا بریں
مرشی من جانا دراہ نیاں
لہمیں تفے آ گپتغاں
پول کہ کشہ میر چاکرا
چوں بیشہ او ہانی ترا
ہانی گشی دردانغیں
سئی آں کہ میریں چاکر ئے
شیہکہ سولیں پسغئے
رند ئے قویہیں واژ ھئے
دِہ شیہئے اصل مٹہ نہ وئے

ترجمہ:

سہیلیوں، ہم عمروں نے
آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا
کشیدہ کی ہوئی قمیص پہنائی
خوب صورت دوپٹہ اوڑھایا
گلے میں ہار اور زیور پہنائے
گھر سے باہر لے گئیں
سیر، نظاروں اور گھومنے کو
ہانی مناظرِ صبح میں
وہ تو ہم عمروں میں قوسِ قزح ہے
سونا چاندی مروارد ہے
دوسری طرف سے ملنگ و درویش قطار میں آئے
سب سے آگے دیوانہ مرید ہے
اپنے دونوں کندھے جھاڑتا ہوا
اُس نے مجھے پہچان لیا
میں نے اُسے پہچان لیا
بہنو مجھے گھر لے چلو
میری طبیعت ٹھیک نہیں
آتشیں بخار نے آن لیا
میر چاکر نے جو پوچھا
ارے ہانی تمہیں کیا ہو گیا
دردانہ ہانی نے کہا

جانتی ہوں کہ میر چاکر ہو تم
شیہک کا جواں مرد بیٹا
رندوں کا طاقتور حکمران
پھر بھی شیہہ کا بدل بالکل نہیں ہو سکتے

اگلا منظر نامہ کچھ یوں ہے کہ تباہ حال، شکست خوردہ' دھوکہ یافتہ اور حواس باختہ شہ مرید ایک رات اُس کے محل میں گھس جاتا ہے۔ اور گھوڑی کے آخور میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اُس نے چاکر کی بندھی گھوڑی کھول دی۔ سوئے ہوئے چاکر نے ہانی کو بھجوادیا کہ جا کر گھوڑی باندھ آئے۔ اُس نے جا کر دیکھا وہاں تو شہ مرید بیٹھا ہوا ہے۔ وہ گھوڑی کی میخ ٹھونک دوبارہ واپس آکر سوگئی۔ دوسری بار پھر گھوڑی کھول دی گئی۔ ہانی نے وہی کیا۔ مگر تیسری بار جب ایسا ہوا تو پھر ہانی سے نہیں رہا گیا۔ بے عزتی کی بھی ایک حد ہوتی ہے، دیوانگی کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے، یہ ایک انتہا سے دوسری انتہا تک فٹ بال بن جانا اُسے قطعاً گوارا نہ تھا۔

اس نے آلتی پالتی مارے مرید کی ران پہ، گھوڑی کا ایک فٹ لمبی ڈیڑھ فٹ لمبا میخ کا نوکیلا سرا رکھا اور پتھر سے میخ کو ٹھونکنے لگی۔ ایک طرف سے میخ مرید کی ران میں پیوست ہوتی گئی اور دوسری طرف پتھر سے اس کی پیشانی پر زخم بڑا ہوتا گیا............ یہ گویا حتمی جواب تھا چاکر کی وفادار بیوی ہانی کا اپنے سابقہ محبوب شہہ مرید کو۔

دلچسپ ہے...... ایک طرف ہانی ہے جو اپنی محبت کو اپنے ازدواجی حالت پہ نہ صرف قربان کر دیتی ہے بلکہ اُس کی ران پہ ایک فٹ لمبی کیل ٹھونک دیتی ہے۔ اور دوسری طرف ہر طرح سے ہارا ہوا فاتح شہہ مرید وابستگی کی بلندی کی جانب جاتی سیڑھیاں چڑھتا جاتا ہے۔ بلوچ تہذیب ہولناک انداز میں بَن بھی رہی ہے اور دھڑام سے گر بھی رہی ہے۔

رات گزر گئی۔ چاکر کو سب کچھ معلوم ہوگیا۔ اگلی صبح اس نے حسبِ معمول منعقدہ دیوان و دربار میں جمع شدہ لوگوں کے سامنے ایک پہیلی کہی:

رنداں کہ دیوانے کثہ
سیوی مزں برجہ بنا
میر چاکرہ محلہ بنا
بندے کہ بستہ چاکرا
رند ئے قویہیں واژھا
''دوشی گروخاں کہ جثہ
کئے وہاوثو کئے ہاغہا''

ترجمہ:

رندوں کا اجتماع تھا
سبی کے بڑے قلعے کے سائے میں
میر چاکر کے محل کے نیچے
چاکر نے ایک پہیلی کہی
وہ جو رند کا طاقتور سردار تھا
''رات کو جب بجلیاں چمکی تھیں
(تو) کون سو رہا تھا کون جاگ رہا تھا''

اب یہ تو کوڈورڈ تھے۔ ایسی پہیلی جو غیر معمولی تھی۔ کبھی کسی نے نہیں سنی تھی۔ پہلیاں تو بلوچوں کی وقت گزاری کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہیں۔ خواہ گھر کے چولہے کے گرد بیٹھے بچے ہوں یا تقریب خوشی کے مواقع ہوں بلوچ ہر عمر میں پہیلیاں پوچھتا بوجھتا ہے۔ وہ پہیلیوں کا سپیشلسٹ ہوتا ہے۔ مگر یہ والی پہیلی تو پہلے کسی نے بھی نہ سنی تھی۔ اور پھر یہ واقعاتی سی پہیلی تھی، سرگزشت جیسی۔

چنانچہ:

کسا نہ داشہ شاھذی
دروغیں دنیائے گواھذی

نَیں کہ جُڑے نہ جمبرے
تامیں گروخ تامیں گرند
اے زہریں زمستانی شفے

ترجمہ:

کسی نے کوئی گواہی نہ دی
اس جھوٹی دنیا کی گواہی
(کہ) نہ تو بادل تھے نہ برسات تھی
کہاں سے آئے گی گرج چمک
یہ تو تلخ زمستانی رات تھی
(سردیوں میں ویسے بھی بادل گرجتے چمکتے نہیں ہیں)

اب تو جب معروض نے خود History will absolve me والے کو بولنے کا موقع دے ہی دیا اور سازش وقوت نے خود معصومیت کو زبان دے ہی دی، اور جب بات اسمبلی و دیوان تک آ ہی گئی تو محفل میں موجود مرید بھلا کیوں خاموش رہے۔ اور بالخصوص جب چاکر کو معلوم ہے اور اُس نے بات پہیلی کے انداز میں محفل میں پھینک دی، تو کسی نے تو اس بات کا، اس پہیلی کا مالک بننا تھا۔ اور اس کا مالک تو مرید تھا۔ لہٰذا مرید بلوچ اخلاقی کوڈ کی ایک ایک شق میں ملبوس ہو کر بول پڑا:

گال کئے مرید شہزاذغیں
شہزاذ غومستانغیں
(چاکر) کوش کارین و گلّا نہ کار
مس راستیں نشانیاں دیاں
زہریں زمستانی شفا
باجے جڑاں تامیں گروخ

ترجمہ:

شہزادے جیسا مرید بول اٹھتا ہے
شہزادہ اور مستانہ
''چاکر قتل جائز ہے مگر گلہ نہ دینا
میں پکی نشانیاں بتادوں گا
تلخ زمستانی رات کو
بغیر بادلوں کے بجلیاں کہاں؟

اصل قصہ عمومی تھا ہی نہیں، یہ تو مقامی تھا۔ مخصوص گھر، مخصوص گھرانہ:

دوشی گروخاں کہ جتہ
میر چاکر ءِ محلّہ بُنا
بوریں بہانہ ہاڈرا
مس گورغیں کُلہ بُنا
ہانی ءِ سلطانیں سرا
دو باروا شینزکاں جتہ
سیمی براشا مالتئی

ترجمہ:

رات کو جو بجلیاں چمکیں
یہ میر چاکر کے محل میں چمکی تھیں
اُس کی گھوڑی کے قریب
یہ تو خوابگاہ کے قریب ہوا تھا
ہانی کے سلطانی سرہانے پر
دوبار تو ہلکی سی
تیسری بار آنکھوں کو خیرہ کرنے والی

بلوچ نے قہر برپا کرنا تھا، کر دیا۔ دربار میں موجود بلوچ سکتے میں آ جاتے ہیں۔ یہ آج کیا نائن الیون ہو گیا کہ بات سپر پاور کی اپنی چار دیواری کے اندر جا پہنچی۔ اب تو سیٹی بج چکی تھی۔ چاکر اور مریذ میں سے ایک کو تو ہستی سے معدوم ہونا ہی تھا............ اور ظاہر ہے کہ سردار اور فقیر کے رشتوں کو برابری میں ڈھالنے کی کوشش کرنے والے کو ہی خسارے میں ہونا تھا۔ اس لیے کہ فیوڈل 'سٹیٹس کو' کچی دیواروں پہ کبھی کھڑا نہیں ہوتا۔ قصور خواہ جس کا بھی ہو، سزاوار تو شیہہ ہی کو ہونا ہوتا ہے۔ لہٰذا محفل میں موجود لوگوں نے اپنے ویلیو سسٹم کی چوکھاٹ کو جب زلزلہ زدہ پایا تو خوف، غصہ اور جھنجلاہٹ میں آنکھیں باہر ابل آئیں، منہ جھاگ ہوئے، بال کھڑے ہوئے اور آسمان کو شگاف کر ڈالنے والا احتجاج بلند ہوا۔ چاکر کے خلاف نہیں، مریذ کے خلاف۔ احتجاج مریذ کے باپ مبارک سے:

ایذا کہ رند بذ بڑتغاں
اوشتا ثغو گال آتکغاں
گند او موارک پسغا
گوں ناروائیں قصوا

ترجمہ:

یہاں رندوں نے برا منایا
اٹھ کھڑے ہوئے، گویا ہوئے
دیکھو دیکھو، مبارک اپنے خلف کو
ناروا بیان کے ساتھ

آگ میں دو طرفہ جلتی ہے، مبارک تو فہمیدہ بڈھا ہے۔ اُسے تو پتہ ہے کہ تقدیر نے اس کے بیٹے کو گردن سے پکڑ کر دیوار سے دے مارا ہے۔ اُس کی چشمِ بینا اپنے بیٹے کی یہ بے باکی، جراتِ اظہار اور گستاخی کے نتیجے میں عبرت کا منظر نامہ دیکھ سکتی ہے۔ اُسے مریذ کا جائز مگر نا قابلِ عمل، ردِعمل قابل قبول ہوتا اگر اُسے وہ سارے ستون گرتے نظر آتے جن پر چاکر (سردار) کا

اقتدار کھڑا تھا۔ مگر یہ تو ناممکن تھا اس لیے کہ سماج اُس کے لیے تیار ہی نہ تھا، نعم البدل موجود ہی نہ تھا۔ تب تو ایک ہی راہ بچتی ہے، بیٹے کی جان بچائی جائے۔ اس نے اپنی جوتی نکال کر بیٹے کو دے ماری:

کشی موارک لترا
جنتی مریذ ا ماں سرا
بل دے مریذ بذ فعل ہاں
بد فعل ہو بذ کار ہاں
گوں چاکر ئے ماہیں جنا
چاکر بذیں مڑدے نہ ایں
چاکر تئی مٹ اے نہ ایں
گوانکہ ہزار مڑد ہ لڑی
مارا گریو گور کنئے
چکاں شذ وتُنہ کُشئے
ماشھ اثوں شاہی نہ ووں

ترجمہ:

مبارک جوتی اتار کر
مرید کے سر پہ دے مارتا ہے
چھوڑ دو مرید بدفعلیاں
بدفعلیاں، بدکاریاں
چاکر کی چاندسی بیوی کے ساتھ
چاکر برا شخص نہیں ہے
چاکر تیرے برابر نہیں ہے

اس کی بات پر ہزار جواں مرد چل پڑتے ہیں
ہمیں پردیس میں دفن کراؤ گے
بچوں کو بھوک پیاس سے مار دو گے
ہم شہہ (پیر فقیر) ہیں، شاہ نہیں بن سکتے

مرید اب کیا کرتا؟ ۔محبت جب انہونی طور پر خوش قسمت ہوتی ہے، تبھی وہ طبقاتی پس منظر میں پیدا ہو کر غیر طبقاتی صورت اختیار کرتی ہے۔ وگرنہ تو یہ طبقاتی ہی رہتی ہے۔ سماج طبقاتی ہو تو محبت کس طرح غیر طبقاتی ہوگی۔ مست و بے خیر شہ مرید کی محبت کو طبقاتی امتیاز نے ڈس لیا تھا۔ مرید کو آج محبت نے چاکر کی روحانی باڈی گارڈی سے خارج کر دیا تھا۔ مگر اس کے باپ سمیت باقی پورا سماج اس سرقبیلوی نظام کو رضا کارانہ تسلیم کرتا تھا۔ لہٰذا مرید کو محبت نے یہاں کے لیے مس فٹ کر دیا۔ متبادل موجود نہ تھا، لہٰذا اس نے والد کی جوتی کو چوما اور باپ کو واپس کر دیا:

بشکیں ترا بشکیں ترا
بشکیں مئیں عارفیں پثئے
لِتر ہواں مڑداں جثیں
رنداں دو دیمی نارثیں
سیویں داں سرینا جسکثیں
سوزیں سغاراں ٹیکثیں
ہوناں ڈغارے رتجثیں
بوراں ڈغارے کیڑثیں

ترجمہ:

معاف کرتا ہوں تمہیں معاف کرتا ہوں
معاف کرتا ہوں کہ تم میرے مہربان باپ ہو
جوتا مجھے کوئی تب مارتا

جب رند زخمی ہو کر کراہ رہے ہوتے
سبی کمر تک ڈھل جاتا
جب گھڑ سواروں کے گھوڑے ہنہنا رہے ہوتے
جب خون سے زمین سیراب ہو رہی ہوتی
گھوڑوں کی سموں سے زمین پر ہل چل رہی ہوتی
(اور میں نہ لڑتا)

مگر یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری تھی۔ وہ بات جس پر وہ خود آج ہی پہنچا تھا:

چاکر کہ قومی واژھے
مس دِہ بڈیں مڑدے نہ یاں
لوہیں کمانہ واژہاں
چاکر پوانکا شر تریں
کاٹا رہ مُشتے تنگویں
سڑداری ئے نامے گوئریں

ترجمہ:

چاکر اگر قبیلے کا سردار ہے
تو میں بھی برا شخص نہیں ہوں
میں مضبوط کمان کا مالک ہوں
چاکر اِس لیے برتر ہے
کہ اُس کے خنجر کا دستہ سونے کا ہے
اسے سرداری کا منصب حاصل ہے

تب وہ ایک فیصلہ کرتا ہے۔ جی ہاں، مرید دیوان میں بیٹھے ہوئے سرقبیلوی نظام کے مارے ہوئے زنگ آلود اذہان سے فیصلے کا حق چھین لیتا ہے۔ فیصلہ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ پہل

کاری کرتا ہے۔ وہ اِس فرسودگی کو برقرار رکھنے والے جرگے کو افلاطون بننے کا موقع ہی نہیں دیتا، خود ہی چیخ پڑتا ہے:

نِیں قولیں کہ کلاّں الکھا
قولیں کہ تراشاں چوٹو اں
ترکی بروتاں شہ بناں
میری سلح آں اِیر کناں
جانہ کڑاکوخیں گذاں
ایشاں پہ ششتاں مندوا
ہانی ئے سلطانیں پتا
مس گوں ہماں مڑداں رواں
لنگ و ملنگ دیوانغاں
گُرّنت و زمبانہ وراں
نشتیں جنی کرکاوغاں
بھئوف اش ڈغاری تا ثغاں
سڑجاہ کلیریں بنڈثاں
مس گوں پخیری ولہرے
حجہ درا زیارت کناں''

ترجمہ:

اب قول ہے کہ وطن چھوڑ جاؤں گا
قول ہے کہ زلفیں تراش لوں گا
ترکی مونچھیں بھی
میں اپنا بلوچی اسلحہ رکھ دوں گا

اپنے جسم پہ پہنے نئے لباس کو
مندو کے لیے بھیج دوں گا
ہانی کے بزرگوار باپ کی طرف
میں اُن لوگوں کے ساتھ چلا جاؤں گا
جو ملنگ و دیوانے ہیں
غرّ اغرّ اکرنوالے مانگتے ہیں
جن کی دَری کرکاوغ نامی جڑی بوٹیاں ہیں
زمین کا دامن جن کا گدیلا ہے
درختوں کے تنے جن کے سرہانے ہیں
میں ملنگوں کی ایک ڈار کے ساتھ
حج کی زیارت کروں گا

اور یوں مریذ گھر بدر ہوجاتا ہے، قبیلہ بدر، سبی بدر، وطن بدر، بلوچ بدر ہوجاتا ہے۔ وہ ملنگوں، جوگیوں کا ساتھی بن جاتا ہے۔ کیا گھر کیا ٹھکانہ، کیا اتہ کیا پتہ۔ کبھی اِس درویش کے آستانے پر، توکل اُس فلاسفر کے روزے پر۔ سفر و حضر، گرتے پڑتے، ننگی بھوک اور موسموں کی شدتیں سہتے بالآخر نجات کی خواہش و ارمان اُسے مکہ مدینہ پہنچا دیتے ہیں۔ مکمل طور پر ٹرانسفارم ہونے کے لیے۔ حتماً ایک نئی جون۔ بزرگ، ولی اللہ، کرامتوں والا۔ پاسپورٹ ویسے ہی نہیں ہوتا تھا، مگر ہوتا بھی تو مریذ کے پاس بین الاقوامی راہداری کا سرٹیفکیٹ موجود تھا۔ محبت کا پاسپورٹ۔ ہانی کی تصویر لگا پاسپورٹ۔ غم کا پاسپورٹ، وابستگی کا پاسپورٹ۔ ایسا پاسپورٹ جو ہانی کا عطا کردہ تھا۔ عطا کنندہ اور وصول کنندہ دونوں کے لیے درد کا پاسپورٹ۔ دل، دونوں کا اپنے اپنے سینے میں نہ تھا۔

محبوباؤں کے دل سے اُن کے شہ مریذ کہاں نکل سکتے ہیں۔ چاکر نے شہ مریذ کا گھر تو اجاڑ دیا تھا مگر وہ خود بھی اچھی ازدواجگی کا مالک نہ بن سکا۔ ہانی محض جسمانی طور پر اس کی بیوی تھی۔

سردار کی بیوی، رند کے سردار کی بیوی۔ اُس کی روح اس کی بیوی قطعاً نہیں بن سکتی تھی۔

اِدھر بوڑھے باپ کی دنیا اندھیر ہوجاتی ہے۔ اُس پر لمحے صدیاں بن جاتی ہیں۔ بے چارہ بوڑھا باپ اس کی تلاش میں کبھی یہاں بھٹکتا ہے، کبھی وہاں سفر کرتا ہے۔ کسی نے بتایا کہ مریذ تو فتح پور میں ایک سنار کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ وہ بے چارا وہاں چلا جاتا ہے:

پتح پورا سونار وے
نندیث و ساثانہ گھڑی
داثاں مریذ ہ دروشماں
سی سال وسالے گارکناں
آف مس گھڑو آں ڈھوشوں
مئیں سر سیاہ سریں کرماں جثہ
روشے لغورا کندثہ
دتاں سرے سہرا کشہ
تامیں مریذ تامیں مریذ
پتح پورو کوہیں قلات
برباث و بری آ کفا
گوں ہشت و دہ ایں دروازغاں
سُن باث و سُنی آ روا
ڈھینگے رڑاثاں بانہڑاں

ترجمہ:

فتح پور میں ایک سنار ہے
زیورات بناتا ہے
وہ مریذ کی شکل کا ہے

میں اکتیس سال وہاں ضائع کر بیٹھا
گھڑے بھر بھر کر پانی ڈھوتا رہا
میرے سر پہ سیاہ سروں والے کیڑے پڑ گئے
ایک روز جب وہ بزدل ہنس پڑا
(تو) اُس کے دانت نظر آئے
ارے کہاں مریذ
اے فتح پور کا پتھر کا قلعہ
تو تباہ و ویران ہو جائے!!
مع اپنے آٹھ دس دروازوں کے
آبادیوں سے خالی ہو جائے!!
تمہارے کھنڈروں میں خدا کرے الّو بولیں

شہ مبارک، ضعیف و ناتوں مبارک، چاکر سردار کے مظالم کا نتیجہ مبارک، اور دین و دنیا ہارا ہوا مبارک.........اپنا جی دار جواں بیٹا کھو کر دن رات روتا ہے، دُہائیاں دیتا ہے، دعائیں مانگتا ہے، فریادیں کرتا ہے۔ وہ رند لڑکیوں کو بددعائیں دیتا ہے:

منڈ کجڑ و آں درکفاں
بامی چوہاں بڑز بیثغاں
رندیں جناں شوئے وائی روا
کوڈی اوں گوں بوآں بُھرا
کاٹ و گھڑیں لوغے شُشا
رنداں حذا وَیراں کنا
رنداں مناں وَیراں کشہ

ترجمہ:

لڑکیاں منڈیروں پہ آتی ہیں
صبح کی روشنی کی طرح ابھرتی آتی ہیں
اسے رند عورتو! خدا کرے تمہاری صدائیں بند ہوں
پراندوں پہ تمہاری خوشبو لگی سیپی ٹوٹ جائے
خدا کرے تمہارے بنے بنائے گھر جل جائیں
رندوں کو خدا برباد کردے
کہ رندوں نے مجھے برباد کردیا

اللہ رحم کر۔ ایسی بدعائیں تو صدیوں تک چلتی ہیں! ۔پتہ نہیں ہمارے آبا کی کتنی بدعائیں ہمیں جھلساتا سایہ کی ہوئی ہیں۔قوم کو کتنے کفارے ادا کرنے ہوں گے، ایک آدھ چاکر کی ہزاروں مستیوں کی۔

آہ، مگر ہانی کیا کرے۔ اپنے محبوب سے محروم کسی اور کی بیوی بن کر اگر اُسے خاوند سے وفا کرنی پڑتی ہے اور مرید سے بالکل لاتعلقی کرنی پڑتی ہے تو ایسا تو صرف اور صرف بلوچ سرقبیلوی ثقافت کی لاج رکھنے کے باعث ہے۔ اور وہ چُپ چاپ یہ فریضہ ادا کرتی رہتی ہے۔ مگر وہ شہہ مرید کے والد سے تو دل کی بات کہہ سکتی ہے ناں !۔ وہ اس کی بددعاؤں کے باوجود اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہتی ہے:

بابا مناں دعاں یا مہ ذئے
اَشتو مرید دوستہ مناں
دوستہ ژہ دوئیں دیذغاں

ترجمہ:

بابا مجھے بدعائیں نہ دو
میں مرید سے تم سے زیادہ محبت کرتی ہوں
مجھے وہ اپنی دونوں آنکھوں سے بڑھ کر پیارا ہے

اب کہانی آگے بڑھتی ہے۔ لیکن، آیئے وقتی طور پر ہانی اور مبارک کو اپنے حال پر چھوڑتے ہیں اور شہ مرید کی حالت کا پیچھا کرتے ہیں۔ شہ مرید، تباہ حال شہ مرید، ہانی کی یادوں کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ وہ پیغام لے جانے والے کبوتر کو اپنی محبوبہ کا شناختی حلیہ یوں بتاتا ہے:

بیامس ترانشکاں دیاں
دوست ژہ گلاں تازہ ترایں
تازہ تروگراں مہذویں

ترجمہ:

آ، میں تمہیں اس کی نشانیاں بتاتا ہوں
میری محبوبہ پھول سے بھی تازہ تر ہے
تازہ تر اور بلند شان ہے

وہ، یعنی وطن بدر مریذ، حج کرتا ہے' وہاں بیٹھ کر عبادتیں کرتا ہے اور ایک عمر گزارنے کے بعد بالآخر وطن کو لوٹتا ہے۔ آیئے اُس کے ہاں پر قیام اور اُس کی سفری سرگزشت کا ایک ٹکڑا دیکھتے ہیں:

چیارنت ملنگ یکے مناں
آں پہ پخیری کلمتاں
مس گوں بلوچی حیلہاں
گونان و گڈُی ءَ نہ واں
حقیں کہ مس حجہ شتاں
حجہ درا زیارت کناں
چیڑ مکہ ئے چنڈ یشتغاں
گوں پُر گناہیں چمبواں
سے سال ہموذا نشتغان

پنجاہ و پنچ شئیر گوشتغاں
روڈو پریشاں بیثغاں
روشے پخیر واذگرڑدکناں
مادِہ چو و ہمی بیثغوں
ماگوں ملنگی گھوڑا
آں کل دیما گوئستغاں
مں سیوی د ہا تاہشتغاں

ترجمہ:

چار ہیں ملنگ اور ایک میں
وہ درویشی کرامتوں کے ساتھ
میں بلوچی ہمت کے ساتھ
اُن کے ساتھ ہوں پیچھے نہیں رہ جاتا
صحیح ہے، میں حج پر چلا گیا
حج کے دربار کی زیارت کی
میں نے مکہ کی جھالریں ہلا ڈالیں
اپنے گناہ بھرے پنجوں کے ساتھ
میں تین سال وہاں رہا
میں نے وہاں پچپن شیئر کہے
ٹنڈ سروں والے میرے ہمراہی پریشان ہوگئے
ایک دن فقیر لوگ واپس لوٹے
ہمیں بھی واپسی کی خواہش ہوئی
میں ملنگوں کے دستے کے ساتھ

وہ سب آگے گزر گئے
(اور) میں سی رک گیا

خدا کی قدرت جب فقیروں کی یہ ٹولی سبی پہنچی تو اُسی روز رند قبیلے کے لوگ چاکر کی محل کے قریب نشانہ بازی کر رہے تھے۔ مانے ہوئے شکاری اور مضبوط ُکمان ٗ کے مالک شہہ مرید نے نشانہ بازی دیکھی تو اُس کے تو منہ میں پانی آ گیا۔ ایک پورا سماجی تہذیبی پیراڈائم ایک پینوراما بن کر اُسے للچانے لگا۔ اُسے بھی نشانہ بازی میں حصہ لینے کا شوق ہوا۔ اس نے کسی سے کمان مانگ لی:

رنداں کہ دیوانے کشہ
نشتو کماں جنگ جھوئشہ
آتکو ملنگ ایر نشتغنت
مادِہ چووہمی بیثغوں
بابو کمانے دئے مناں
روحا وثی راضی کناں

ترجمہ:

رند جشن میں تھے
وہ بیٹھے تیر اندازی کر رہے تھے
اور وہاں ملنگ آن پہنچے
میرا بھی دل کیا
اے بھائی مجھے ایک کمان دے دو
میں بھی اپنی روح کو خوش کرلوں

انہوں نے مذاق اڑاتے ہوئے ایک کمان اُسے دی۔ مگر یہ معمولی کمان شہ زور اور ماہر مرید کے سامنے کیا ٹکتی۔ دوسری دی گئی تو وہ بھی بچوں کا کھلونا ثابت ہوئی۔ تیسری کمان بھی جب اُس کا زور نہ سہ سکی تو پھر مجمع نے اُسے سنجیدہ لینا شروع کردیا۔ شناخت میں شک کے کچھ ابر واٹھے۔ اب

اس ملنگ کی اکڑ خانی نکالنے کے لیے شہہ مریذ کی کمان اُس کے گھر سے منگوائی گئی۔ اور جب اُس کی کمان لائی گئی تو شہہ مریذ دَہائیوں سے استعمال نہ کی گئی اپنی کمان کی خستہ حالی کو دیکھ کر تڑپ گیا۔ پُر اشک آنکھوں سے اُسے چوما، اُس کی زیارت کی۔ پھر اُس کے کل پرزے ٹھیک کر کے مورچے میں بیٹھ گیا۔

حسبِ دستور تین تیر چلائے اور ہر تیر ٹھیک نشانے پر۔

شبہ یقین میں بدل گیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ تیر انداز شہ مریذ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے ایک شخص ہانی کی طرف بھیجا کہ تم بچپن میں اکٹھے کھیلتے رہے ہو۔ شہہ مریذ کی کوئی نشانی، کوئی شناخت بتادو:

داثیش کمانے پہ ملنڈ
پرشتو کماں بیثہ کلنڈ
دوہمی اے داثیش پہ حشر
پرشتہ کمانئے ہوشہ سر
سومی اے داثیش پہ گماں
سئے ٹکرا بیثہ کمان
رند ے گُمانی بیثغاں
شوا بیاریں مریذ ہانہ جغا
کہ ایر کنت پخیر ئے آکڑا
آڑتیش منی لوہیں کماں
دیثہ کماں مس کانہلا
چکا شنکاّں کُرڑتغا
پڑ چورواں ریسینتغاں
موڑیں دلا باڑ آتکہ

دیثہ من و گریثہ دلا
پچماں جُڑی جینہر کثہ
مس ہب بار واز زیارت کثہ
ایر جیغ اثو جیغوں کثہ
ایر سازاثو سازوں کثہ
گڑہ کونڈان بیثو بُغ کثہ
سئے تیر مس اچرا جثہ
تیرا مس تیرا ٹک بڑتہ
رنداں شموذاں شک بڑتہ
مڑدے دا حانو دوڑثہ
”شوا کہ کسنا لیو کثہ
نشک و نشانی چے کثہ؟
بیا کہ مریذ درستہ نوی
تُرکی بروت اے رُستغاں
جہل شہ تمیزاں گوئستغنت“

ترجمہ:

رند میلہ کر رہے تھے
وہ تیراندازی کا مقابلہ کر رہے تھے
ملنگ لوگ بھی آن پہنچے
ہمیں بھی خواہش ہوئی
اے بابا ایک کمان مجھے دے دو
تاکہ اپنی روح کو راضی کرسکوں

انہوں نے مذاق میں ایک کمان مجھے دے دی
وہ تو ٹوٹ کر بے کار ہوگئی
غصے میں ایک اور تھما گئے
اُس کا تو سرا ٹوٹ گیا
شک بھرے انداز میں انہوں نے تیسری کمان مجھے دے دی
وہ تو تین ٹکڑے ہوگئی
یہاں رندوں کو شک گزرا
ارے تم لوگ لاؤ شہہ مریذ والی کمان
تا کہ اس فقیر کا غرور نیچا کر دے
وہ لائے میری آہنی کمان
میں نے اپنی کمان کو خستہ حال میں دیکھا
اُس پر تو بکری کے لیلے کودتے رہے تھے
لڑکے بالوں نے اُس کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دی تھی
میرا دل اداس ہوگیا
دیکھا میں نے، رویا دل
آنکھیں بادل کی طرح برسنے لگیں
میں نے سات بار اسے آنکھوں، ہونٹوں سے لگایا
ناساز تھی، اسے میں نے ساز کر دیا
ادھڑی ہوئی تھی، میں نے اسے درست کر لیا
پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں نے شست سنبھالی
یکے بعد دیگرے تین تیر چلائے
تینوں نشانے پہ لگے

تب رندوں کو خوب شک گزرا
انہوں نے ہانی کی طرف آدمی بھیجا
''تم لوگ جو بچپن میں کھیلے تھے
کیا نشانی چھوڑی؟
مریذ ہم سے شناخت نہیں ہوتا
اس کی بڑی بڑی مونچھیں ہوگئی ہیں
داڑھی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے''

مسرت وشادمانی سے لبریز ہانی نے نوید سنانے والے کو اپنے ہاتھ کی کڑیاں اتار کر ''مستا گری'' کے بطور دے دیں۔ اب وہ مرید کی کیا نشانی بتاتی۔ اُس نے تو خود اُسے 'برانڈڈ' کر دیا تھا۔

ارے اُس کی نشانی یہ ہے کہ ران پہ ایک بڑے زخم کا نشاں ہوگا اور ابرو پہ ایک زخم ہوگا:

داشئی اوو مستاگرا
'' تامیں مریذ تامیں مریذ
(مئیں) وہاویں دلا ہا غہ مہ خن
ما کہ کسنا لیوکشہ
نشک و نشانی اے کشہ
مندری دَہ زانا شیر بڑتہ
برواں سر اٹپے کشہ''

ترجمہ:

ہانی نے کلائی کا زیور اتارا
اور خوش خبری سنانے والے کو بخش دیا
''کہاں ہے مرید؟ کہاں ہے مرید
میرے سوئے دل کو نہ جگاؤ

ہم جو بچپن میں کھیلے تھے

نقش ونشانی یہ چھوڑی

(کہ) کیل اس کی ران میں ٹھونک دی

ابرو کے قریب زخم بنا دیا''

اب مزید کیا شاہد، کیا گواہی ؟۔ شناختی پریڈ ہوگئی' شناخت ہوگئی : یہ تو مرید ہے، شہہ مرید ہے، پُل گندیں مرید ہے۔ شیہہ مبارک کا جایا مرید ہے، چاکر کا ستایا مرید ہے، قوم کا بھگایا مرید ہے.......... پشیمانی، گروپ پشیمانی، اجتماعی پشیمانی، قومی پشیمانی۔

کیا کفارہ ہو؟ ایک خاندان اجاڑ دیا۔ شیہہ مبارک، بیٹے کے لیے تڑپتے، سسکتے مر گیا۔ بیٹا عشق کا بنجارہ پا پیادہ حجاز تک کا اذیت ناک سفر کرتا رہا۔ اور ہانی آتشِ عشق اور ازدواجی وفا کی عقوبت گاہوں کی مسافر بنی۔ اور مجرم کون؟ صرف چاکر نہیں، صرف رِند قبیلہ نہیں بلکہ پورا قبائلی فیوڈل نظام ہے۔ اور اب کفارہ ادا کرنا ہے۔ لہٰذا اقدار جائیں بھاڑ میں، رندوں نے دلچسپ کرنے کی ٹھان لی:

رنداں گڑہ شورے کثہ

چاکر ہے کارا کنئے

ہانی سئیں سنگاں بہ دئے

ہڈے گوں شیہہ ہڈا ں کفاں

گورے گوں گورایک باں

ترجمہ:

رندوں نے باہم باتیں اور بحث مباحثہ کیا

''چاکر تم یوں کرو

(کہ) ہانی کو طلاق دے دو

تا کہ اس کی ہڈیاں شیہہ کی ہڈیوں کے ساتھ پڑیں

قبر قبر کے ساتھ مل جائے''

جی، بلوچ تو کفارہ کرتا ہے، اپنی تباہ کن غلطیاں درست کرتا ہے۔ اور اب ایسی پیچیدہ صورتحال میں بھلا عوام الناس اپنی اجتماعی پشیمانی کا اور کوئی حل بھی کیا سوچ سکتے تھے۔ بس یہی نا کہ:

حانی و برّانی مریذ

ماں کوٹوے آ ماں کشاں

ترجمہ:

ہانی اور صحراؤں کے مرید کو

ایک کمرے میں بند کیا گیا

اوہ، شریف لوگو! معصوم لوگو! تمہارا کیا خیال ہے، تم تبدیل ہو چکے ہو تو مرید بدل نہ چکا تھا کیا؟ ایک مکمل طور پر Transformed شخص کو سمجھنے میں تم ہمیشہ غلطی کرتے ہو، ہمیشہ دیر کر دیتے ہو۔ یسوع سے لے کر جینی ویسٹ فالن کے خاوند تک، اور شاہ عنایت سے لے کر شیہہ مرید تک تم نے ہمیشہ غلطی کر دی، ہمیشہ دیر کر دی۔ عشق تو پورا ذہنی چوکھاٹ بدل دیتا ہے۔ مرید کی اس قدر ریاضت ومحنت اور کٹھنائیوں سے حاصل کردہ آفاقی شعور کی کیا ارزاں قیمت دے رہے ہو! اب اُس کے لیے ہانی کوئی طبعی وجود کہاں رہ گیا۔ وہ تو اب ایک آئیڈیا بن گئی، ایک تصور، ایک خیال جو وہ اپنی روح کے مقدس سینے پہ بندھے تعویز کی طرح ساتھ لیے پھرتا ہے۔ اب مرید کو جسمانی ہانی کا حصول حقیر دِکھتا ہے، اب تو وہ اپنے آئیڈیا کے حصول کے تلاش کی دنیا میں ہے۔ اب تو اسے سرخ ستارہ چاہیے!!۔ سرخ ستارہ، جو شاید ہمارے سارے چاکروں کے گناہوں کا کفارہ ہو!!

شہ مرید کمرے میں بند اپنی محبوبہ ہانی کا پاک سٹڈی سرکل یوں لیتا ہے، یوں اُس کی تطہیر کرتا ہے:

ہانو گلیں ہانو گلیں

عشقا تئی آ سوتکغاں

ثی کوفغ سرا ں سہرامہ خن

ژہ دیذغاں کوروں مہ خاں

حانی تئ گیغا نہ یاں
مئیں ہر دوازدھیں بند تتلغاں
درماں جنوخیں رتلغاں
ئیں داغ داثو مس ماذغاں
زالے توَے زالے مناں
دانکو مناں درکار شئے
براثاں مناں براثہ نہ کث
دوستاں مناں دوستہ نہ خث
براثاں منی نامہ گنوخ
(ئیں) کڑدوں مخن ژہ سنگتاں
کورو مہ خن ژہ دیذغاں''

ترجمہ:

''پھول جیسی ہانی، پھول جیسی ہانی
تمہارے عشق نے مجھے جلا ڈالا ہے
اپنے ننگے کندھے مجھے نہ دکھا
مجھے دید سے اندھا نہ بنا
ہانی تیرے قابل نہیں رہا
میرے بارہ کے بارہ جوڑ بے کار ہو چکے ہیں
مجھ میں جوانی کی وہ طاقت نہ رہی
میں جل بھن کر، نامرد ہو چکا ہوں
اب ایک عورت تُو، ایک عورت میں
جس وقت تک تم مجھے درکار تھیں

بھائی مجھے بھائی نہ بناتے تھے
دوست مجھے دوست نہیں بناتے تھے
برادری میں میرا نام 'دیوانہ' تھا
اب مجھے ساتھیوں سے جدا نہ کر
مجھے اندھا نہ بنا''

مولانا روم کی منزل ہے یہ۔ حاصل کردہ بصیرت کی بصارت کی حفاظت اب شیہہ کی عصمت بن چکی ہے۔ اور وہ عصمت کی حفاظت کیسے نہیں کرے گا۔ بلوچ ریاضتوں، کشٹوں سے حاصل کردہ اپنے شعور کی حفاظت کیسے نہیں کرے گا۔ اس نے ماقبل فیوڈل نظام سے جو ٹکر لی تھی، اُس میں اُس کی روح تک کرچی کرچی ہوگئی۔ مگر اُس نے نجات کا وہ پرچم تو اوروں کو تھمانا تھا۔ راہ بھٹکے لوگوں کو راہ تو دکھانی تھی۔ چنانچہ وہ جون بدلتا ہے، شکل وصورت بدلتا ہے، ہیئت بدلتا ہے:

جاہے کہ گندئی لیٹروے
جا ہے کہ گندئی ڈھگوے
جُمبھیث ونیشان ءَ درشی
اژما مریذ دراہا شتہ
بگّا ژہ یہ ہرّے برٹئ

ترجمہ:

کبھی دیکھو تو اونٹ ہے
کبھی دیکھو تو بیل ہے
ابھر کر اٹھتا ہے دانت پیستا ہوا
ہم سے مرید صحیح سلامت چلا گیا
اونٹوں کے رَم میں سے ایک شتر بچہ لے گیا

چنانچہ گناہ کے کمرے سے اڑ کر باہر نکلنے والا مرید حضرتِ خضر کا مرید بن گیا۔ شیہہ مرید بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے لگا......

ایران، پاکستان اور افغانستان پر مشتمل سارے بلوچستان کا پکا عقیدہ ہے کہ آبِ حیات پیا ہوا عشاق کا یہ مرشد اپنی لمبی سفید داڑھی اجلے لباس اور عصا کے ساتھ اپنی اونٹی پہ سوار آج تک اپنے مریدوں کو سیدھی راہ دکھانے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

سُرخ ستارے کی طرف!!۔

گوہر جتنڑیں

Gohar Jatni

لاشاری بلوچ، کچھی اور گنداواہ میں سکونت پذیر تھے۔ اُس جگہ کی زمین ڈھاڈر اور سبی کی بہ نسبت زیادہ زرخیز تھی۔ لاشاری بلوچوں کی قیادت گوائہرام کے پاس تھی، جبکہ رند اتحادیہ کا سربراہ چاکر تھا۔ کچھی اور گنداواہ کی زمینوں کی زرخیزی چاکر خان کے لیے بہت کشش والی بات تھی ....لالچ کی حد تک۔ اُسے دوسرے بلوچ (گوئہرام) کی یہ خوشحالی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ (ہمارا یہ دادا کچھ کچھ بدنیت تھا)۔

اِس بدنیتی اور قبضہ گیری کی خواہش نے اُس تیس سالہ لڑائی کو بھڑکا دیا جس سے بلوچ قوم کا اتحاد بکھر گیا اور سیکڑوں سالوں تک انتشار ہمارا مقدر بنا رہا۔ انتشار کی یہ بہت بڑی علامتیں تقلید کے لیے قطب کے وہ ستارے بن گئے جن پر ہم، اُن کی اولادیں آج بھی چل رہے ہیں، خون میں غلطاں جسموں کے ساتھ، ضدٗ اکڑٗ حسد اور تاسف سے زخمی زخمی روحوں کے ساتھ ....مگر اسی زرخیزی کی کشش کی تباہ کن لڑائی نے ہمیں تاریخ، ادب اور سماج کے میدانوں میں نئی نئی جہتوں سے واقف کرادیا۔ ہم ان شعبوں میں مالا مال ہوئے۔

اسی فیوڈل چاکری عہد میں ایک بڑی خاتون ''گوہر'' کے نام سے ہوگزری ہے۔اب تو یہ پاک نام ہزاروں لاکھوں بلوچوں عورتوں نے اپنا لیا ہے۔اتنی عظیم خاتون کہ بلوچ اگر انگریز ہوتے تو اُس کے ذکر پر احتراماً اپنی ٹوپیاں اتار لیتے۔ یہ خاتون دوطریقے سے استحصال کا شکار تھی؛ ایک تو مردانہ سماج میں بحیثیت عورت کہ مردانہ سماج میں عورت دوسرے درجے کی مخلوق ہوتی ہے۔ استحصال کی دوسری صورت یہ تھی کہ ہمارا سماج ذات پات والا بھی ہے۔اس ذات پات کی موجودگی میں کم ذات یعنی جتـــنـڑیـں (جت قوم سے متعلق) ہونا ایک اور پیدائشی کمی کمزوری تھی۔مولد (لونڈیاں) اس عہد کی شناخت تھیں، ڈومبیاں بھی۔اور ہماری شاعری کی پُر اعتبار گواہی کی وجہ سے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جتنڑیں کی پستی بھی اس زمانے میں موجود تھی۔

گوہر بہت مال دار خاتون تھی۔اونٹوں کا بہت بڑا بگ تھا اس کی ملکیت میں۔(اب یہ غیر بلوچ دانش وروں کے لیے تو دلچسپ بات ہے کہ بلوچوں میں عورت نجی ملکیت یعنی جائیداد اور لائیوسٹاک کی مالک تھی۔لیکن شاید یہ بات کلی طور پر درست نہیں ہے۔ہمیں اُس زمانے میں (اور شاید آج تک) صرف گوہر کی مثال ملتی ہے جو آزادانہ طور پر بگ کی مالکن تھی۔دواور جتنڑیاں بھی تھیں جو آزاد وخودمختار معاشی زندگی گزار رہی تھیں: شاری اور شلی۔مگر کیا درجہ دوم کی شہری یعنی جتنڑیں کے علاوہ کسی نوبل بلوچ خاتون کے پاس بھی کبھی نجی ملکیت رہی ہے؟۔شاید نہیں۔اور یہ قبیح ونا قابلِ تصور صورت حال صرف بلوچوں میں نہیں ہے، بلکہ سارا وسطی ایشیا اور سارا مشرقِ وسطیٰ اسی حقارت پہ فخر کرتا پھرتا ہے!!)۔

گوہر غیر شادی شدہ تھی۔کیا کسی شادی شدہ جتنڑیں ڈومبنڑیں کے پاس بھی کوئی ریوڑ، رم، یا بگ تھا؟۔شاید نہیں ....اور ایک قبائلی معاشرے میں ایک بن بیاہی مال دار کم ذات عورت اور اُس کی ملکیت کی حفاظت کے لیے کسی 'بڑے' کی پشت پناہی تو چاہیے تھی۔اور مالدار، بن بیاہی اور دوسرے درجے کی شہری خاتون کی پشت پناہی کے ساتھ بہت ساری وجوہات وتوقعات نتھی ہوتی ہیں، نظر آنے والی بھی اور نظر نہ آنے والی بھی۔

گوہر، مہیر کے علاقے سے اپنے اونٹ اور دیگر مویشی لے کر گوئہرام سردار کی پناہ میں

وہاں کی چراگاہوں میں لائی:

گوہر ژہ مہیر ہ کورا
زڑتہ لیٹرواں زونگیناں
تازیاں قلم گوشیناں
ڈاچیاں پٹن لِنگیناں
باہوٹی گورے گوئہراما
گوئشتہ ننگریں گوئہرا ما
گوہر پہ تفاخا آتکہ
سئے گیست ڈھگو و سی گوالغ
ایشنت گوہر ہ مہمانی

ترجمہ:

گوہر کو مہیر کی ندی سے
حسین و توانا اونٹ لے آئے
قلم گوش گھوڑیاں لے آئیں
موٹی رانوں والی اونٹنیاں لے آئیں
پناہ لینے سخی اور جری گوئہرام کے ہاں
گوہر قسمت سے وہاں آئی
ساٹھ بیل اور تیس بوری گندم
یہ ہیں گوہر کی مہمانی

قدرت خدا کی، اس خوب صورت عورت پہ سردار فدا ہوگیا۔وہ اسے بھا گئی:

گوئنڈیں پتگے ماں گوئستہ
چٹّا شستغہ گوئہراما
اوذ گوئرگوہرا ہیرینا
''گوما گجھویں یاری کن''

ترجمہ:

ایک ہفتہ ہی گزرا تھا
(کہ) گوئہرام نے چٹّا کو بھیجا
ہیر جیسی گوہر کے پاس
(کہ) ''مجھ سے خفیہ دوستی کرلو''

آپ جذباتی مت ہوں ۔ یہ آپ کی اکیسویں صدی والا زمانہ نہیں تھا ۔ وہاں ریاست، عدلیہ، شہری حقوق، اور زرخیز وزربخش این جی اوز نہ تھے، جنیوا کنونشن نہ تھے ۔ اُس زمانے کو اپنے زمانے کے گز سے ناپیں گے تو میری طرح کڑھتے ہی رہیں گے ۔ چھ صدیاں پیچھے والے بلوچ سماج میں جائیے ۔ آپ کو سب سمجھ آئے گا کہ:

جنتڑیں رومالاں بلوچانی
ڈومبڑیں زغریں کدئے شیر اں

ترجمہ:

جتنیاں بلوچوں کی رومالیں ہیں
ڈومبنیاں تازہ دودھ بھرے کٹورے ہیں

اب ذرا لطافت دیکھیے، جذبات کی نفاست دیکھیے، مہذب و بھاری پن دیکھیے، گوئہرام کو گوہر کا خوبصورت جواب دیکھیے:

گوئشتہ گوہرا ہیرینا
بچی اوں ترا دست داثوں
براثی اوں ترا دوست داشتوں
مس یاری اے کئے ورنائے
ورنا مس مہیرا بازا

ترجمہ:

ہیر جیسی گوہر نے جواب دیا،
''میں نے تو تمہیں بیٹے کی طرح ہاتھ دیا
بھائیوں جیسی تم سے محبت کی
میں اگر یاری کرتی کسی نوجوان سے
تو نوجوان تو مہیر میں بہت تھے

سوپر پاور کو انکار کا مطلب تو ہم جانتے ہیں ۔ توبہ توبہ، شیولری کے عہد کے سردار کو انکار کر دینا، گوئہرام لاشاری کو انکار کرنا، اُس کی پیشکش کو ٹھکرا دینا تو گویا ڈرون کے حملوں کو دعوت دینا تھا ۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ خاتون، گوہر وہاں یعنی گوئہرام سردار کے علاقے میں نہیں رہ سکتی تھی ۔ سرداری غیض وغضب سہنے کے لیے تو کوہِ طور اور چلتن جیسے پہاڑ چاہئیں ۔ چنانچہ:

گوہر لاڈکیں زہر گپتہ
گوہر ثہ ہمو ذدرکپتہ
سر پہ بولہ وا ایر کپتہ
میریں چاکرہ ماڑیا

ترجمہ:

لاڈ بھری گوہر مایوس ہوگئی
گوہر وہاں سے نکل کھڑی ہوئی
وہ درہ بولان پار چلی گئی
میر چاکر کی پناہ میں

وہ سردار چاکر کے دربار میں پہنچ گئی اور اپنا مدعا یوں بیان کیا:

گوہر پہ زواں گال آتکہ
ہنچو چاکرا را گوئشتئی
گوئہراما مناں رنجیتہ

سردار مس تئ باہوٹاں
مئیں بگارا چَراغے شوں دار

ترجمہ:

گوہر گویا ہوئی
اور چاکر سے کہنے لگی
گوہرام نے مجھے دُکھ دیا
سردار میں اب تمہاری پناہ میں آئی ہوں
میرے اونٹوں کے گلوں کے چراگاہ بتادے

انکار ناممکن !۔ پناہ مانگنے والے کو انکار ناممکن ۔اُس کی جان، مال کی حفاظت اب پناہ دینے والے پر............رند کے سردار پہ۔

میراں مالمیں گالہ کیث
تو نند مس کچڑوخی جوآں
کہ جیذیں گڑودوئیں بگانی
ہاریں گورم و میشانی
گنجیں کچڑو نامانی
آفیں لیلویں چاثانی
ایمانیں ہمو ملکانی
نند و ہیمنیا چاریں

ترجمہ:

شان والا میران بولا
کچڑو کے نہری علاقے میں جاؤ
وہ علاقہ اونٹوں کے خوبصورت گلوں

اور گائیوں کے رم اور دنبوں کے ریوڑوں
کی چراگاہ ہے
پُرگنج اور نامور کچڑو
خوب صورت چشموں کا علاقہ
سمجھو وہ تمام علاقوں کا ایمان ہے
وہاں رہ کر امن وامان کے ساتھ اپنے اونٹ چراؤ

یہاں میں اِس کہانی کا تسلسل ذرا سا توڑ دوں گا، اور آپ کو میرآن سے منسوب شاعری کا ایک ٹکڑا ضرور پڑھا کر چھوڑوں گا۔ یہ قصہ تو ہم پھر یہیں سے شروع کریں گے، جہاں سے یہ ٹوٹ رہا ہے:

دوشی ماں خیالے نوخیں
دیثوں دلبر ے لڈ وخیں
کند یث ورشاں مرواذر
جز یث وزمیں روخہ بی
مامس شاذ ہا وہا ویغا
شیری تنگثاں دوستئے رک
وہا واژہ کثوں سد ھ وسار
اے شیطا نامناں پر امتہ
شیطاں اغر مڑ دمی چکے بی
تہ مس چاپو لے جتّٔے شوشو خیں
گرے یاناں ششیں ثی لوغا
مس ثی ولز ہاں پر ینا ں
زیر ا ں کنگر وکشتی آں

بینگی گلڑ ے گوں گیشڑ اں
ماپئے درداں جکانا ں
ساڑتیں ٹکراں پنڈ اناں
کہ شانگوژہ جڑ ی آں آڑ تہ
ملخاں کہ کشہ شیطا نی
دوستئے پڑگری کنز ینتیش
کو فغ سر جثت نمبیاں
’’شا ری ‘‘ئے سری گوں ہارا
کاتکا ں دہ سیر مر اذیں گُلا
گُرھا ٹے جثوں درویشی
’’شاری‘‘ درکفی کند اناں
دستے گوں گُرڑ وگند یماں
راستیں دستے گوں ڈھولاں داث
پاذمئیں بانکئے پاذیناں
ڈال شاہیں بروت ماں رکاّ ں
شا نگو سارکشہ رانڈ ھی ئے
چکا ں ٹوک ایناں جوگی ئے
اے گوں اندوہاں لا فیغا ں
بیگہی چُک گلے لتا ڑتئے
’’شا ریّا ‘‘ جو او تر ینتہ
جو گی اے نہ ایں گند ہ زال
رند ئے سوھویں سڑ دارے

بچیں ننگریں شھذ اذئے
واند کاریں تلیں بورانی
ہاریں گورم ویشا نی
ٹھگے نَیں وثار ٹھگا ڑتئے
اے جوگی ایں ھواں لوغا نی
کہ’’ شاری‘‘ او’’شلی ‘‘ اش ماناں

ترجمہ:

رات کوایک نئے خیال میں
میں نے ایک مدھر چال والی دلبر کودیکھا
ہنستی ہے تو گریں مروارد
چلتی ہے زمین روشن ہو
میں نے نیند کی مسرتوں میں
محبوب کے ہونٹ دودھ کی طرح پیے
نیند سے جاگا
شیطان نے مجھے ورغلایا تھا
شیطان اگر آدم زاد ہوتا
تو میں اسے زناٹے دار تھپڑ مارتا
روتا ہوا جاتا اپنے گھر
میں اپنا قیمتی لباس اتار پھینکتا ہوں
کچکول اور سنکھ اٹھالیتا ہوں
کتے کا ایک پلا ساتھ لیتا ہوں
ہم دردر ٹھہرتے رہے

روٹی کے ٹھنڈے ٹکڑے مانگتے ہوئے
کہ اس طرف سے بادل آ گئے
فرشتوں نے شرارت کی
دوست کے خیمے کا پچھلا حصہ ہلایا
کندھے بھیگ گئے
شاری کا دوپٹہ اور ہار بھی
آتا ہوں مراد بھرے خیمے تک
ملنگوں جیسی صدا لگائی میں نے
شاری نکلتی ہے ہنستی ہوئی
اس کا ہاتھ گڑ اور گندم سے اٹے ہیں
دایاں ہاتھ بغلگیر ہونے کو
مالکن کے پیروں میں پازینک نامی زیور ہیں
میری بڑی مونچھیں اُس کے لبوں پہ
اُدھر سے جاگ گئی بڑھیا
بچو! کسی جوگی کی آواز ہے
یہ پیٹ کے اندھوں کے ساتھ
بچوں کو لتاڑ نہ لے
شاری نے جواب دیا
جوگی نہیں اے گندی عورت
رند کا شاندار سردار ہے یہ
بہادر شہداد کا بیٹا ہے
گھوڑوں کا مالک

گائیوں اور بھیڑوں کے بڑے ریوڑوں کا
ٹھگ نہیں ہے تمہیں ٹھگا دیا اُس نے
یہ جوگی ہے اُن گھروں کا
جہاں شاریؔ اور شلیؔ رہتی ہوں

آیئے دوبارہ گوہر کا قصہ جاری رکھتے ہیں۔ بس صرف اتنا بتاتے چلیں کہ چاکر نے بھی اُسے اللہ کے واسطے پناہ نہ دی۔ بغضِ گوئہرام نے اُس سے یہ فیاضی سرزد کروائی۔

ہمیں اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب گوئہرام کو یہ خبر پہنچی ہوگی کہ گوہر، اُس کی پناہ سے نکل کر مقابل سردار کے ہاں پناہ گزیں ہوگئی تو وہ غصہ سے کس قدر بپھرا ہوگا۔ یہ تو گویا اُس کی ملکیت تھی جو دوسرے سردار کی ملکیت میں چلی گئی۔ اور صرف گوئہرام ہی کیوں؟۔ یہ بات تو سارے لاشاری قبیلے کے سرکردہ لوگوں کے لیے ندامت کا نشاں بن گئی۔ (فیوڈل ازم کو قرآن مارے!)۔

لاوا پکتا گیا۔ موقع کا انتظار ہونے لگا۔ پھر ایک روز گوئہرام کا بیٹا رامین لاشاری اپنے دوستوں، اور طبعی وفکری باڈی گارڈوں سمیت گھڑ دوڑ کے مقابلے میں حصہ لینے رند کے جشن میں گیا:

بوژو بیار ریحاں گوبریں سیاہا
گوبراں تاشوں گوں تو کلاشاہا
بور بڑ تو پٹۓ آس سرا داشتاں
بورشلاناں پہ پدھریں ڈانا
نیں کہ داں درائی جاگہاں کاتکاں
پُڑسۂ میریں چاکرہ رنداں
بیائیں رنداں کہ سوب کئی بیئہ
جونگوا دروغیں شاھذی داشہ
گوئستغا ریحانئے سیاہ مزں گوانزیں
منتاں رامینہ نہ وی راضی

ترجمہ:

جاؤ ریحان کی جیتنے والی گھوڑی ''سیاہ'' کو لاؤ
شاہ (حضرت علیؓ) پر توکل کر کے گھڑ دوڑ میں حصہ لیتے ہیں
گھوڑے میدان کے آخر تک لے جائے گئے
تیز رفتار گھوڑے میدان میں پانی کی طرح بہتے آتے ہیں
اور جب ججوں کی نشست گاہ تک آتے ہیں
میر چاکر نے رندوں سے پوچھا
بتاؤ جیت کس کی ہوئی ہے
جونگو نے جھوٹی گواہی دی
(کہ) ریحان کی بڑی پھلانگوں والی سیاہ جیت گئی
(اور) رامین منت سماجت سے راضی نہ ہوا

اِس جھوٹی گواہی پر ظاہر ہے رامین طیش میں تھا۔ رند اور لاشار کے تعلقات گوہر جنتڑ یں کے واقعے پر پہلے ہی کشیدہ تھے۔ جیتا ہوا رامین جب ناجائز فیصلے کے سبب ریحان رند کی گھوڑی سے شکست کھا کر واپس آ رہا تھا تو اس نے اپنا غصہ گوہر پر نکالا (اُسے پتہ تھا کہ گوہر کا نقصان چاکر کے لیے زیادہ تکلیف دِہ ہوگا)۔ اس نے اُس کے سارے شتر بچوں کو تلواروں سے کاٹ ڈالا:

رامیں گوں پنجاہ پُل گذا
توڈا اروئیں کشتغاں
رشیف پنیراں پکغاں
ونگ چوملوکاں واڑتغاں

ترجمہ:

رامین پچاس خوش لباسوں کے ساتھ
ننھے شتر بچے مار ڈالے

اور اُن کی سجی بنائی
اور بادشاہوں کی طرح کھائی

میں اور میرا قاری اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ شتر بچوں کی سجی نہیں کھا رہا تھا وہ تو ایسا بیج بو رہا تھا جس نے آگے چل کر انسانی سر کھانے تھے۔ دشمن رندوں کے سر، سجن لاشاریوں کے سر، عظیم شان بلوچوں کے سر، اشرف انسانوں کے سر۔

اور کچھ ہی دنوں بعد:

چاکر پہ تفاخا آتکہ
کئے مس کچڑوخی ، جوآ ں
زڑدیں دیغر وبیگاہے
بگانی تڑا شیف بیثہ
ڈاچی آتکغاں درنزاناں
شیر پہ مائغاں شنزاناں

ترجمہ:

اتفاق سے چاکر آیا
کچروک کے نہری علاقہ میں
دن ڈھلے
اونٹوں کے جھوک میں گھوڑی سے اترا
گوہر کی ڈاچیاں ہانپتی دوڑتی آئیں
تھنوں سے دودھ بہاتی ہوئی

گوئشتہ چاکرا میرینا
جاڑو او جڑیں ریحانا

هوتیں باگڑو مسکانا
پڑسی ژہ گوہرا ہیرینا
تئی ڈاچی پہ چہ کارے درنزاں
شیر پہ مائغاں شنزاں

ترجمہ:

میر چاکر نے کہا
جاڑو اور جوانمرد ریحان نے
بہادر باگڑو نے مسکان نے
خوبصورت گوہر سے پوچھا
تمہاری اونٹنیاں طوفان کیوں مچا رہی ہیں
ان کے تھنوں سے دودھ کیوں بہہ رہا ہے؟

اب یہاں گوہر نہ اپنی اُس تذلیل کو یاد کرتی ہے جو اُسے گوہرام کے ہاتھوں اٹھانا پڑی تھی۔ نہ اُس مالی ومعاشی نقصان کو خاطر میں لاتی ہے جو اُس کے شتر بچوں کے قتلِ عام سے ہوئی، نہ ہی وہ اپنی ڈاچیوں کی ممتا بھری فریادوں پہ کان دھرتی ہے جو اپنے بچوں کی یاد میں ڈکراتی، سر مارتی پھرتی ہیں، اور نہ اُس روحانی زخم و توہین کو خاطر میں لاتی ہے جو کہ رامین کے ہاتھوں اُسے پہنچی۔ اُسے اندازہ ہے کہ اگر اس نے لاشاری امیر زادے کی حرکت کے بارے میں چاکر کو بتایا تو پہلے سے موجود قبائلی کشیدگی اندوہناک جنگ کی صورت اختیار کرے گی اور انسان کا خوں بے پیمان بہے گا۔ امن کی اس دیوی نے اپنے موضوعی مسائل کو پس پشت ڈال کر جنگ و موت کے فرشتے کو یوں بھگانا چاہا:

گو کشتہ گوہرا دُرّینا
وث پہ چاکرا میرینا
مئیں ہراں واڑتغاں زہر یں سول

ہرّاں وث مرے گوں گپتہ
ڈاچی آں وثی جیذ چڑتہ
ہراں را جغینوئے بیثہ

ترجمہ:

لعل جیسی گوہر نے کہا
میر چاکر سردار
میرے شتر بچوں نے زہریلی جڑی بوٹیاں کھالیں
اُن میں وبا پھیل گئی
ڈاچی اپنی چراگاہیں چرتی رہیں
شتر بچوں میں 'جغیں' کی بیماری پھیل گئی

مگر گوہر کے ایک بہرے اور بیوقوف گلہ بان نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ چھوٹے معدے والا وہ شخص درمیان میں بے وقت اچک کر بولا:

پیری گوئستغاں لاشاری
ساڑتیں سینغ وبورتاشی
شنگو گوئستغاں مستیا
شانگو گڑتغاں کستیا
ہرّ مئے کُشتغاں جنکیا
بجی پلغاں بیدانی
ڈاچی پہ ھواڑاں درنزاں
شیر پہ مائغاں شنزاں

ترجمہ:

پرسوں آگئے لاشاری

سیر سپاٹے اور گھڑ دوڑ پہ
یہاں سے وہ گئے مستی میں
واپس آ گئے غصے میں
ہمارے شتر بچے کاٹ ڈالے
اور سجی کر کے کھا گئے
اپنے بچوں کے فراق میں ڈاچیاں چیختی مٹی اچھالتی ہیں
اور دودھ رانوں پہ بہہ رہا ہے

آہ! گویا ازرائیل کا سینہ پھٹ پڑا ہو، اُس نے لاکھ پن چکیاں چلانے والے زور کے پھونک سے سور پھونک دیا ہو۔ بلوچ کے جینز میں ہمیشہ سے سوئچ آن بٹن یعنی کشت وخون ایک بار پھر قہر برسانے الرٹ ہو گیا۔ ایمیزون کے جنگلات میں آگ کی چنگاری پڑ گئی۔ بلوچستان کے سبز افق پہ ساعت غارت ہو گئی:

بذ بڑتہ چاکرا میرینا
ٹھگیں موندرو ہارونا
جاڑو او جڑیں ریحانا
ہوتیں باگڑو مِسکانا
ایذا گال کشہ میرانا
ہرّ اس نیلوں گوں لاشارا
میر چوز ہرنی پاذاتکہ
گوہر لاڈکیں لڈ یتیش
جاڑیں گزدراں گوازیتیش
شیہہ ئے منہا دیمائی
سنّی پہ نظر پیدا شتیش

واغے پہ پذا گرد یتئی
تنگے چکّشہ بورانی

ترجمہ:

برا منایا میر چاکر نے
موندر نے اور ہارون نے
جاڑو نے ریحان نے
باگڑ نے مسکان نے
یہاں بول پڑا میران
شتر بچوں کی بات ایسے ہی جانے نہ دیں گے
وہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا
انہوں نے لاڈ بھری گوہر کی وہاں سے نقل مکانی کرائی
اسے جڑواں درختوں سے پرے
شیہہ کی جھونپڑی سے بھی آگے
سنّی کا علاقہ دکھایا
تب وہ خود واپس ہوئے
گھوڑوں کے زین جنگ کے لیے کس لیے

صُلح جو اور بہادر بیورغ کا عظیم رول ہم الگ سے بیان کر چکے ہیں۔ اُس سب کا یہاں دہرانا بے سود ہے۔ اُس نے جنگ روکنے کے لیے بہت زور مارا۔ مگر بزدلی کے طعنوں سے اُس کی اپنی بہادری بزدل ہو گئی اور ایک بڑا قتل عام رک نہ سکا۔ یہ درست ہے کہ گوہر جنتڑیں اِس منطقے میں انسانیت پہ جو عظیم احسان کرنا چاہتی تھی وہ جنگ بازی کی چتا میں بھسم ہو گئی۔ مگر، اُس کی اشرف و پاک کوشش کو پانچ سو برس بعد کی بلوچ محفلیں بھی یاد رکھتی ہیں۔

کویل جت

Kaweel Jatt

پندرہویں صدی کا بلوچ سماج نہ صرف یہ کہ طبقاتی تھا بلکہ اِسی طبقاتی بنیاد پر یہ ذات پات کا نظام بھی بن چکا تھا۔ یہاں ایسے کئی پیشے تھے جن سے وابستہ لوگوں کو دوسرے درجے کا بلوچ سمجھا جاتا تھا۔ ہم ڈومب اور جت کا ذکر پچھلے عنوان میں بھی کر چکے ہیں۔

اسی ذات پات کے مکروہ مرض میں مبتلا سماج کا مارا ہوا، ایک کردار کویل جت کا ہے۔ یہ بہادر اور وجیہہ نوجوان گو کہ پیشے کے اعتبار سے شتربان نہ تھا مگر صرف 'جت' گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے دوسرے درجے کا بلوچ بنا دیا گیا۔ وہ اپنی بہادری، جوانمردی اور چاک چوبندی کے باوجود ذات پات کا نظام پار نہ کر سکا۔ اپنی کم ذاتی کے نچلے زینے سے اوپر چڑھ نہ سکا۔ وہ دوسرے درجے کا شہری، دوسرے درجے کا ہی رہا۔ آیئے اس کی فریاد سنتے ہیں اور بلوچی ادب کے غنی ہونے کی گواہی دیتے ہیں؛

بوآں کویل جتہ نہ جنت
جتے نہ یاں جت بیثغاں

ماثا پہ جتی آڑتغاں
آواز گوں جتیا شتہ
لٹ اوں نہ زڑتہ تراشتغیں
چٹ اوں نہ زڑتہ کمبریں
گوخ اوں نہ دُشتہ زاثغیں
بگوں نہ چارینت گڑدوئیں
میش و بزی مڑدے نیاں
ڈک اوں کہیر اچی نہ جث
ریش و منی شیری بروت
مس پہ زواذ روز بیثغاں
گوں عطراں شہم داثغاں
واپاروں گوں بوراں کشہ
بوران و جوائیں مڑدماں
گلی کسائیں کرگزاں
رِندی مزں چیڑیں جناں
سائے امیریں چاکرا

ترجمہ:

کویل جت اب عطر نہیں لگاتا
میں جت تو نہ تھا جت ہو گیا ہوں
(اس لیے کہ) مجھے ماں نے جت جنا ہے
جت کے بطور پکارا گیا ہوں
حالانکہ میں نے تراشا ہوا ڈانگ کبھی نہیں اٹھایا

میں نے رسی کبھی نہ اٹھائی
میں نے کبھی گائے نہ دوھی
میں نے اونٹوں کا رم کبھی نہیں چرایا
میں بھیڑ بکریوں والا شخص نہیں
میں نے کہیر کے درخت پہ کبھی کلہاڑی نہ چلائی
داڑھی اور شیر جیسی مونچھوں کی
میں نے زباد سے پرورش کی
میں نے عطر سے انہیں سنوارا
میں نے تیز رفتار گھوڑوں سے تعلق رکھا
تیز رفتار گھوڑوں سے اور اچھی عورتوں سے
گلی کی کمسن کرگسوں سے
رندوں کی لمبی زلفوں والی عورتوں سے
میر چاکر کے سائے میں

دلچسپ بات یہ ہے کہ طبقاتی نظام پر مبنی ’’بلوچ ذات پات‘‘ والا سماج گزشتہ چھ سو برس سے موجود ہے لیکن اس کے خلاف ایسی پر اثر اور بلند آہنگ احتجاجی صدا شاید ہی کسی نے لگائی ہو جتنی کہ نیم ملینیم سال قبل قویل جت نے بلند کی تھی۔ انٹرنیٹ، فیس بک، ٹوئیٹر آنے کے باوجود، پوری دنیا میں ذات پات نظام کی شکست کے باوجود آج کوئی دانش ور، شاعر اور ادیب اِس موضوع کا تذکرہ تک نہیں کرتا۔ پتہ نہیں کون زیادہ مہذب ہے، آج اکیسویں صدی کا بڑے سے بڑا ادیب ، یا پھر پانچ سو برس قبل کا ایک عام اَن پڑھ شخص قویل؟ ۔قویل، طبقاتی معاشرے اور اس کی زوال پذیرا اخلاقیات پہ دُہائیاں دیتا ہے۔ سبق آموز تجربے بیان کرتا ہے:

قول اکبری ئیں پرشتغت
پَت ژہ گہیں مڑداں شتہ

عہد ژہ مڑں مُلیں جناں
مال پہ ہڑاں باز ہ نہ واں
ساہ پہ سر ئے پاریزغاں
دوستی پہ زورانہ نہ واں
مہر پہ بہا گپتہ نہ بیئے
دل کوتلی چیزے نہ ایں
مہر پہ چیار چی گپتہ کئے
یکے حیا دوہمی ادب
سیمی پرے وشیں لساں
چیارمی پرے دستا دیاں
چو کہ چہر مس ہُشتراں
کہ استی غلاماں شرہ کاں
نیستی ملوکاں گار ہ کاں

ترجمہ:

بڑے بڑے قول وقرار ٹوٹے
اچھے آدمیوں سے اعتبار چلا گیا
بے بہا عورتوں کے وعدے گئے
حرص سے دولت نہیں بڑھتی
موت سر کے بچانے سے نہیں ٹلتی
دوستی زبردستی سے نہیں ہوتی
محبت قیمت پہ نہیں خریدی جا سکتی
دل امانت میں دینے کی چیز نہیں ہوتی

محبت چار چیزوں سے حاصل کی جاسکتی ہے
ایک حیا، دوسری ادب آداب
تیسری میٹھی زبان
چوتھی سخاوت
دولت غلاموں کو اچھا بناتی ہے
(اور) غربت اچھوں کو گم نام کردیتی ہے

ہَیوتاں

Haiwtaan

ساری دنیا میں عموماً، مگر بلوچ کلاسیک میں بالخصوص ایک مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اگر آپ خود سے اُس شاعری پر سٹوری لکھنے بیٹھ جائیں گے تو اُن خوب صورت الفاظ، نگینہ ضرب الامثال، بیش بہا استعاروں اور لاثانی اسلوب سے محروم رہیں گے جو اُس شاعری میں موجود ہیں۔ اس لیے اگر لکھاری کی یہ خواہش ہو بھی کہ وہ محقق بھی رہے اور ادیب بھی کہلائے، تو ہماری کلاسیکل شاعری اس کی اجازت نہیں دیتی۔ مجھے نہیں پتہ کہ ڈی ایچ لارنس کی بات بلوچی کلاسیک پر پورا اترتی ہے یا نہیں کہ: ''آرٹسٹ پہ کبھی بھروسہ نہ کرو، کہانی پہ اعتبار کرو''۔ بس آپ ڈرامہ بھری، کہانی سے لبریز اور جمالیات سے گندھی شاعری پڑھیے۔ میں زیادہ سے زیادہ ترجمہ کی حد تک 'شامل باجا' رہوں گا یا ایک آدھ وضاحتی بریکٹ میں بریکٹ بن سکوں گا۔

ہیوتان میرالی رند تھا۔ ہیوتان، اُن لوگوں میں شامل تھا جن کا نام اُن کے کردار کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ وہ واقعی ہیبت تھا، دشمنوں کے لیے ہیبت ناک جواں مرد۔ اس کے بھائی کا نام بیورغ تھا۔

پتہ نہیں وجہ کیا تھی کہ اُس فیوڈل عہد میں بلوچ کا ہر قابلِ ذکر شخص مار دھاڑ بھرا کوئی قول دیتا تھا، اور پھر زندگی بھر اُسے پالتا تھا۔ سر (یا سروں) کی قیمت پر۔ یہ خصوصیت میں نے دوسری زبانوں کے کلاسیک ادب میں بہت کم دیکھی ہے۔ ہیوتان نے یہ قول دیا تھا کہ اگر ایک بار کسی کا اونٹ غلطی سے بھی اُس کے اونٹوں کے بگ (گلے) میں آجائے تو پھر وہ اُسے واپس نہیں کرے گا۔

ہیوتاں میرا رندہ دیوانا قول کشہ
سے براچپیں دست وثی نوواثاں جثہ
ہر کسے ڈاچی بیئے مئیں بگاّ گوں کفی
حمّلی بڑزیں کنڈ غا شا ں دیما چری
وھش و خوشیا واژہا واپسہ نوی
گڑہ بیئے ہواں مڑد، مئیں ہونیں گوں ڈاچیا شرئخ
بی ہواں ڈاچی زہم و ڈھالانی موھری
تی جنے جتیں، ہیل مہ وی ثی پہ ڈوہڑاں

ترجمہ:

ہیوتان نے رند محفل میں قول دیا
تین بار بایاں ہاتھ داڑھی پہ پھیرا
جس کسی کی بھی ڈاچی میرے بگ (گلے) میں آجائے
(تو پھر) حملی بلند پہاڑ کے اُس طرف ہی رہے گی
خوشی سے واپس مالک کو نہ ملے گی
وہی آدمی آگے آئے جو میرا خون ڈاچی کے ساتھ لے جائے
وہ ڈاچی تلواروں ڈھالوں سے بندھی ہوگی
کوئی اور جتنڑیں اُسے دوہنے کی آس نہ لگائے

کلاسیک تو پھر کلاسیک ہے۔ اور بلوچی کلاسیک تو ہمیں پیاسا کبھی نہیں چھوڑتا۔ ہمیں اِس قول سے آگے لے جایا جاتا ہے۔ قول دینے والے کو قول پورا کرنے کا موقع فراہم کرنا بھی کلاسیک کا فریضہ ہے۔ پوری ایک کہانی موجود ہوتی ہے۔ قول کرنے کے بعد ہیوتان کے قول کو بھی ایسی ہی آزمائش سے گزرنا ہوتا ہے۔ ہیوتان کو، خود کو اس قول کے پورا کرنے کا اہل ثابت کرنا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک روز ایک مست اونٹ ہیوتان کے بگ میں گھس جاتا ہے۔ اور یہ مست اونٹ پورے رند قبیلے کے سربراہ سردار چاکر کا ہوتا ہے۔ سُپر پاور چاکر کا اونٹ:

روشے نیم روشا چاکرہ لوکا لاہ جثہ
سر مہار سستو ہیوتاں بگا گوئرشتہ
روش دہ نیمے آ جتا گوں کوہاں ٹلشہ
لیڑہ زورکپتو ہیوتہ بگّا گوں شتہ
ہیوتاں رندا تکّشہ مہاں تائیں جواو
ڈومبے دیم داثئی مس ہواں زڑدیں دیغرا
بند برو شہر ا مئیں سلاماں دے چاکرا
رندہ سڑدارا زُوم وزورانی واژھا
(گوئش) آتکو مہری کپتہ مئیں بگہّ اندرا
گڑدغ گراں بیثئی شڑطیں گوں ہیسی ایں سرا
گڑدی آں روشی کہ درکفی ساہ مئیں ڈوبرا
تی برے سَوکائی نیئے سیوی جھنگلا
مناں مکّھیں ماثا داثغاں لولی گوانزغا
داثئی لولی پہ سُخنّانی پالغا

ترجمہ:

دن کے دوپہر چاکر کا اونٹ جھپٹ پڑا

اپنی مہار تڑوا کر ہیوتان کے بگ میں جا گھسا
بہت دیر تک چرواہے (جت) نے پتھر مار مار کر اُسے روکا
مگر اونٹ زور ہو گیا، ہیوتان کے بگ کے اندر چلا گیا
ہیوتاں رند نے فوری ردِعمل کا سوچا
اُسی سہ پہر ایک ڈومب روانہ کیا
کہ شہر چلے جاؤ اور چاکر کو میرا اسلام پہنچا دو
رند کے سردار کو، طاقت وقوت کے مالک کو
اسے کہہ دینا کہ تمہارا اونٹ میرے بگ میں آ گیا ہے
اب اس کی واپسی مشکل ہے، میرے سر کے ساتھ بندھا ہے
یہ اُسی روز واپس آ سکتا ہے جب میرے سینے سے جان نکل جائے
دوبارہ اب یہ آسانی سے سبی کے جنگلوں میں نہ آئے گا
مجھے مکہ نما ماں نے پنگھوڑے میں لوری دی تھی
کہ اپنے سخن اور قول کی پابندی کرنا

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب ہیوتان نے اونٹ واپس کرنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوا ہو گا؟۔ کسی کے بدمست قول سے لوگ اپنے مال مویشی، اپنی نجی ملکیت سے دست بردار تو نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ رند لڑنے کو تیار ہوئے:

گوں ہمے ٹوکا چاکر و شہذا ذتپتغاں
لانچھو رنداں پہ مڑائی سمبرتغاں
ماوثی لوکا نیلوں گوں میرال پوتڑواں
رند ژہ کٹّان و پلنگاں ایر کپتغاں
چنڈثو جنگانی سِلح، ہوتاں زڑتغاں
نہمتیں ہنچو کہ مرثی گوں میرالی مڑاں

ترجمہ:

اس بات پہ چاکر اور شہداد آگ بگولہ ہو گئے
رند جنگ کے لیے تیار ہو گئے
ہم اپنا اونٹ میرالیوں کے پاس نہیں چھوڑیں گے
رند پلنگوں چارپائیوں سے اتر آئے
جنگی اسلحہ جھاڑ پھونک کر اٹھا لیا
انہوں نے ارادہ کر لیا کہ میرالیوں سے لڑیں گے

مگر اقتدار کی غیرت عام انسانوں کی غیرت سے مختلف ہوتی ہے۔ زمان ومکان کی حقیقتیں پورے اخلاقی نظام میں تبدیلیاں لاتی ہیں۔ عام بلوچ کے ہاں غیرت، زمان ومکان کے مختلف ہونے کی بنا پر، مختلف ہوتی ہے بہ نسبت اُس کے حکمران کی غیرت کے۔ چنانچہ اسی مرحلے پر کلاسیک ایک اور کردار کو شامل کرتا ہے۔ عورت کو، ہانی کو:

در کفی ہانی ژہ محل و ماڑی و کبھّاں
جلکثہ بازارہ دفا میڑئے مائخاں
گوانک جثو رندا ہبّرا دروہی داثغاں
تہ پہ لیڑوے ضدّا زہمہ گوں میرالا مجن
چاکرو شہذا ذمں کہ شوئے لیواں گندغاں
شوئے عمل روشے مارہ پڑّیناں آورواں
مئے بستغیں ماڑی و قلاتاں برّکناں
اے رنگیں لیڑو ماچندھی لوٹو خاں داثغاں
صحوہ سوالی و چنگ جنیں ڈومبانہ بُڑتاں
رند مناں مڑ دئے لیڑو گوں پیغامادیاں
سردارسی وصذ ہشترمں کاراں تئی بگاّ گوں دیاں

نَیں ثی بانسکہ بھوریناں نَیں لذہ آسہ ماں دیاں

گوں وثی براثاں شروشیطانی جواں نہ یاں

تہ بذمہ خس قوما، نیّت چاری ایں واژہاں

بادشاہانی ساڑت و سوکائیں عقلاں

گوں مومن و عاجیزیں گریواں جوانہ کناں

ترجمہ:

اسی اثنا میں ہانی اپنے محل سے نکلتی ہے

چاندنی جیسی ہانی بازار کے چوک پر آن کھڑی ہوگئی

اس نے پکار پکار کر رندوں کو سات بار واسطہ دیا

تم ایک اونٹ کی خاطر میرال پہ تلواریں مت سونتو

چاکر اور شہداد میں جو تمہارے کرتوت دیکھ رہی ہوں

تمہارے اقدامات ہمیں سیلاب کے سامنے پھینک دیں گے

ہماری آباد بستیوں عمارتوں کو ویران کر دیں گے

اس طرح کے کئی اونٹ تو ہم نے بھکاریوں کو دے دیے ہیں

صبح سویرے کے سوالیوں کو اور چنگ بجانے والے ڈومبوں کو

رند کا ہر فرد ایک اونٹ مجھے ایک ہی پیغام سے دے دے گا

میں ایک سو تیس اونٹ لا کر تمہارے ریوڑ میں شامل کر دوں گی

نہ اپنا بازو توڑوں گی اور نہ گیاہستان میں آگ لگا دوں گی

اپنے بھائیوں کے ساتھ شروشیطانی اچھی نہیں ہوتی

تم اپنی رعایا کے ساتھ برا نہ کرو، نیت ہی مالک کا چوکیدار ہوتی ہے

بادشاہوں کی عقل تو ٹھنڈی اور نرم رفتار ہوتی ہے

وہ مومنوں عاجزوں غریبوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں

یہ وہی ستم زدہ ہانی ہے جسے چاکر نے بے رسم و بے رواج انداز میں اپنے محبوب سے چھین لیا تھا۔ہم نے گوہر جنتڑیں کے معاملے میں بھی دیکھ لیا تھا کہ بلوچ عورت انسانی اقدار کی پاسداری میں کس قدر آگے ہے۔

خیر و جنگ کا یہ مناقشہ، یہ دلیل بازی جاری ہے کہ عین اُسی دوران ایک مخبر آ جاتا ہے۔ یہ اطلاع آتی ہے کہ ہیوتان والا ایک اونٹ تو چھوڑیئے، چاکر کا پورا بگ دشمن لے اڑے۔اب کے یہ دشمن اپنے قبیلہ رند سے نہ تھے بلکہ روایتی حریف لاشاری قبیلہ نے یہ حرکت کی تھی۔اس پہ شاعری میں آپ ردِعمل دیکھیں گے، جنگی تیاریاں، جنگی نعرے، جنگی ترانے، طعنے دیکھیں گے۔Shivelary اپنے عروج پہ ہوتی ہے۔

گڑ ہ نیم شفی پاساں ڈاہی تاشاناں آتکغاں

وپتغیں وہاوا چاکر ا معلوم دارکناں

بگ بڑتہ دوشی ایں شفا جوریں دژمناں

کستریں تو ڈوآں رڑاٹ بستہ ناغماں

ڈاچی دیمہ چریناں گڑداں گوں شاغیں مائغاں

نِیں گاراں تئ سنگھی ایں کوانٹ اولی بوزناں

ژہ کوردفی سیمان و کھیرانی سمّلاں

ترجمہ:

پھر نیم شب کو خبر پہنچانے والے سرپٹ دوڑاتے آئے

سوتے ہوئے چاکر کو بتاتے ہیں

رات کو تمہارے اونٹوں کا رم تلخ دشمن لے گئے

چھوٹے شتر بچوں نے اچانک فریاد کرنا شروع کر دی

ڈاچی دودھ بھرے تھنوں کے ساتھ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتے تھے

اب پچھلی جگہوں سے تمہارے توانا اونٹ غائب ہیں

ندیوں کے دہانوں سے، درختوں کی چوٹیوں پہ لگی پھلیوں سے

یہ بھوک نہ تھی، ڈاکہ بھی نہ تھا۔ یہ تو مستی تھی۔ دوسرے قبیلے کولڑائی کا چیلنج تھا۔ اب تو نہ لڑنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ خود اوپر کی شاعری میں لہجہ تو دیکھیں، اکسانا، اشتعال دلانا............

چنانچہ:

نیں چاکرو شہذاذ گندغہ جاہا گوئستغاں
دیزی گرڈاناں ہوش مں رکّاں مستغاں
یاثی بگہ گڑدیناں یاوثار یہ دھکہّ کناں
دعا کشہ سیذاں شیہہ کٹیا گوں عالماں
کپچھیں سیوی کپتہ مں گرانیں لڑگماں
گورغیں کاڈاں دست وثی سرزاناں جثاں
گوانکہ جث پیر و مرشذاں پیراہی کثاں
سوکڑیں میش گوں پنڈروسیاہیں چتواں
کل وثی قولی ءَ کثاں زنزیر مہ پراں
کسے پہ براثاں کسّے پہ دینہ برادران
چاکراگوئشتہ مں پرے چے آ زیند غاں
مں چشوں ہنداں شربت و شیراں نوش کناں
مئیں ڈاچی رُونگاناں بروآں گوں گوئہراماچَراں
دُژمں پہ تِیرانی سَر اَیش بہر و بہر کناں
مں یاسرہ شرطاں یا سُھاگاں بیرہ دیاں
رِندہ دو لکھ مَرڑ سُجّاں گوں سُہریں ماذناں
گوں نیزغ و ہِندی و سغر سندیں گنّواں
مں بندریں سیویا شفی شِرّے گوں جناں

رند و لاشاری بلّاں کو کرو گرندی ڈاوراں
لیو کناں تیغاں ہون اش پہ چیار دگّا بہاں

ترجمہ:

اب چاکروشہداد کی حالت بہت خراب ہے
دیگ کی طرح ابلتے ہیں اور جھاگ ہونٹوں پہ جم گئی ہے
یا اپنے اونٹ واپس لاؤں گا یا خود کو ایک ہی بار تباہ کروں گا
دعا کی سیدوں نے، شیہہ کٹی نے، عالموں نے
وسیع سبی طوفانوں کی زد میں ہے
گوری لڑکیاں اپنی رانوں پہ دوہتھڑ مارتی ہیں
وہ اپنے پیروں، مرشدوں کو پکارتی ہیں اور منتیں مانتی ہیں
تندرست بھیڑیں، بیل گائے اور کالے دنبے
یہ سب کچھ نذر کرتی ہیں یہ زنجیر زلفوں والیاں
کوئی اپنے بھائی کے لیے اور کوئی محبوب کے لیے
بہادر چاکر نے کہا کہ میں کیوں زندہ ہوں
میں کیسے آرام سے بیٹھ کر شیر و شربت نوش کرتا رہوں
اور فریادیں کرتے ہوئے میرے اونٹ گوئہرام کے پاس ہوں
دشمن قرعہ اندازی کر کے باہم بانٹ لیں
یا میں سر کی بازی لگادوں گا یا اونٹ واپس لاؤں گا
مجھے دولاکھ رندگھڑسواروں کی اپنی طاقت کا اندازہ ہے
نیزوں، تلواروں اور سرکاٹنے والے خنجروں کے ساتھ
میں بڑے سبی کو شبینہ بلا سے دوچار کردوں گا
تاکہ رند و لاشاری بادل اور گرج کی طرح لڑنے کو تیار رہیں

تلواروں سے کھیلیں اور اُن کا خون چار راہوں میں بہے

ظاہر ہے یہ چاکر کی خود کلامی نہیں ہے۔ یہ تو ایک پیغام ہے جو بلند آہنگ میں دوسروں کو دیا جا رہا ہے۔ ہر شخص خود سے بھی یہی کہہ رہا ہوتا ہے اور قبیلے کے دوسرے جواں مردوں سے بھی۔ جذبہ بلند رکھنا، اپنی پوری قبائلی طاقت مجتمع کرنا، پیروں فقیروں کی آشیر بادیں لینا، نذرانے منتیں ماننا، اور پر عزم ہو کر اپنے مال و جان و آبرو اور قبائلی وقار کی خاطر جنگ لڑنا۔

رزمیہ شاعری کا اپنا ذائقہ ہوتا ہے۔ مگر بلوچی رزمیہ شاعری تو بالخصوص پڑھنے سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ جنگی رپورٹنگ بھی شاندار، مگر جنگ سے قبل کی تیاریاں، افواج جمع کرنا، قول و عزم کرنا، حسیناؤں کے طعنوں کے خوف کو زندگی ہار جانے کے خوف سے زیادہ محسوس کرنا۔ ایک مکمل حیرت کدہ، ایک مبہوت کر ڈالے والا باب:

چاکرہ ڈاہی ہشت و دَہ دگّارپتغاں
رندے گوں واہُو و ہَلَمب ئے نز آرتغاں
ژہ دشتِ شورانا زہرینیں کوڑی سمبراں
بوروثی جاڑو آ سحاقا سینگھار تغاں
چِکّشو تنگ و زیں خداونداں بستغاں
گون اَثِش نوذیں، سَر مَلوکان و ہمّلاں
پُٹّریں رند و بارغیں کرّزی ڈھَل ِگراں
بانگھوئے لاکی ایں کُمیث قطّارہ کناں
پہ نلی آ او تنک دفیں گاجا درِرشاں
گھور کشہ مِیلھا یہ دفہ تُرندیں ناہَراں
او مر و ریحان و حَسَن گوناں لشکراں
بیورغ و میراں بگہ کوڑی اَیں ہیوتاں
ڈاڈر و بولاں ہِیر شہ سنّی دہ مُژاں

بَہر نڑیں تازی کاتکاں گرّوخیں نریاں
سروپ کشہ رندا گوں لکوری ایں ماذِناں
باہر و دوستیں ژہ کوہِ مارانا رپتغاں
سنج اش گوں شیرواریں بہاناں نازیثغاں
َکپچھ و سِیماں بانزی ہِینثراناں گزاں
زہرہ گیڑ دوستیں جس بِہانا رّہ چابُکاں
تہ شف و روشی دِل نہ رجّینتہ تِیرغاں
ژِہ سیوی گانالاں ڈاڈرئے کاچوشیرغاں
مَنَّھی سایاں تہ آف گوں ہِیراناں واڑتغاں
آف گوں ہِیراناں روغن گوں زرّیں کَدَّ حاں
مس سیاھہ گَنڈیا تنگویں تعویز بستغاں
اے ہواں روشیں نِیں مس وثی پورانہ ِگراں
تہ سری باشئے ژہ رندہ گامازیں گھوڑواں
تہ پَذمہ ِکنزّ اشئے ترا عَیوہ کُث لُڈّوخیں جناں
ہواں بارغیں کاڈاں سیوی ئے زنز یر مہ پراں
روشے ِگلّا دِیر نیاذئے کایاں گوں رائی مڑدماں
نِیں ’’سیاہ‘‘ شَلاناں پیئے ڈاگ وپَٹّی ایں سرشماں
چِمّے گوں لاشاری دِہا دنزّاں داشتغاں
یَہ رَّہیں ورنا سیوی بازارا دَرِرّشاں
چاکری پَوژگوں شُول و سیٹی و نیزغاں
ہُل و پوشی آ ، ڈھال و لُنگی و مَلملاں
جاں سِلِحانی پاذے گوں لالیں موژغاں

ہیذاں شُنچاناں کاتکنت ہِل گوشیں بِہاں
چڑتغیں گانال شوار حلالاں گوں تیرغاں
شوا تیزکن ایں پاذاں ماپچُّوں گوں جوریں دژمناں
مرشی دُلدلی پرّاں بیائیں گوں مُرگی بانزراں
نیں رند و لاشاری دِیرِ نیاں، گوانکے مڑّ لاں
جھاگِشہ بوراں سروپ کشہ سیوی چوراں
ٹوکیں بجارئے گالہ کئے رندہ گِہ تراں
مئیں دستے گوں زَہم ایں، دستے دِیرِ نیاذہ چلّواں
مں شوئے جیواں مور پریّانی کنگڑاں
بِرگڑی زرّیں گوناں گوں ساوی ایں ڈَراں
داشغاں رندہ سُہرڑی چمّیں ہَنجراں
پالغ اِش گَرانیں درکفغّی ایں گنڈغاں
اے ہوا ں وُختیں کہ زاثغ و ہُشکیں گیوَراں
مَڑ رواں دیماآں لغور پہناذہ دیاں
ثی یاراں گیر آریں تُڈّیں تازی ایں ماذناں
کہ ٹوک پذہ پُچّاں گوں دیرِوہ سیاہ مارواڑ تغاں
دِیرِ نہ یث سیوی پہ نغاہ سَہرائیں مُڑاں
شوا وتی جانا ریزمہ ذَیں تیغانی دفاں
مار پذہ سُجّاں طعنہ و سیالانی شغاں
گُشتغیں مڑدانی نشاں کوہیں چیذغاں
گرَ تغیں مڑدانی پذا بازیں سیاہغاں

ترجمہ:

چاکر کے قاصد آٹھ دس راستوں کو نکل پڑے
پکار اور نعروں میں رند اکٹھے ہو گئے
دشتِ شوران سے غصہ بھرے لشکر نکلے
جاڑو اور سحاق نے اپنے گھوڑے تیار کر لیے
کس کر زین مالکوں نے باندھ لی
نوذیں اُن کے ساتھ تھا ملوک اور ہمل سربراہ ہیں
رند اور پتلی گھوڑیاں سرپٹ روانہ ہوں
صبح سویرے گھوڑیوں کی قطار ہوتی ہے
نلی اور تنگ دھن گاجا میں نکل جاتے ہیں
مِیلھا کے چست بہادر رقصاں ہوئے
اومر، ریحان اور حسن لشکر کے ساتھ ہیں
بیورخ اور میران اور ہیوتان بھی اونٹوں کی واپسی کے لیے ساتھ ہیں
ڈاڈرو بولاں اور دھند میں گم سنّی تک حرکت میں آ گئے
تیز رفتار تازی اور غراتے گھوڑے آتے ہیں
رند گھڑ سوار، لپکتے ہیں
باہر اور دوستین کوہِ ماران سے روانہ ہوئے
شیر خوار اسپ بچوں پر زین کس کے
علاقوں سرحدوں کو پرندوں کے پروں کی سنسناہٹ کی طرح پار کر گئے
طیش میں آتا ہے دوستیں اور اپنی گھوڑی کو چابکیں مارتا ہے
تم نے دن رات غلہ کھانے میں تامل نہ کیا
سبی کے سبز گندم اور ڈاڈرو کچھی کے خوشوں سے
منہّہ کے سایوں میں تم برتنوں میں پانی پیتے رہے

پانی برتنوں میں اور گھی چاندی کے قدح میں
میں نے تمہارے گلے میں چاندی کے ہار باندھے
آج وہ دن ہے جب میں اپنا قرض مانگتا ہوں
تم سارے رند گھڑسواروں سے آگے آگے رہو
خدا کرے تم پسپا نہ ہو کہ مدھر چال والیاں تم پہ آوازیں کسیں گی
وہ پتلی لڑکیاں، سبی کی زنجیر زلفوں والیاں
ایسا نہ ہو کسی روز راہ گیروں کے ہاتھ دورنشیں محبوبہ کا گلہ آئے
چنانچہ سیاہ گھوڑی میدانوں پہ بہتی آگے بڑھتی ہے
نگاہیں لاشاری کے علاقے کے گرد پہ جمائی ہوئی
ایک ہی سِن والے نوجوان سبی کے شہر سے نکلے
چاکر کی فوج سیٹیوں نقاروں اور نیزوں کے ساتھ نکلتی ہے
زرہ بکتر ڈھال لنگی اور ململ میں ملبوس
بدن اسلحہ سے لیس اور پیروں میں سرخ جوتے
پسینہ سے شرابور، خوب صورت کانوں والی گھوڑیاں بڑھتی ہیں
چری ہوئی گندم اور غلہ تمہیں حلال ہے
اپنے قدموں کی رفتار بڑھادو تاکہ ہم تلخ دشمن تک پہنچ پائیں
آج دلدل جیسی رفتار کے ساتھ پرندوں کی سی جھپٹ میں آگے بڑھو
اب رند و لاشار دور نہیں ہیں، بس ایک پکار کی دوری پر ہیں
آگے بڑھتی ہیں گھوڑیاں اور لپکتے ہیں نوجواں
بجار کی آواز آ رہی ہے جو معتبرین سے گفتگو کر رہا ہے
میرا ایک ہاتھ تلوار پر ہے اور دوسرا دورنشین کی نشانی والی انگوٹھیوں میں
مور پری عورتوں کے کنگن میرے پاس ہیں

(محبوباؤں کے) گلے کے زیور تم لوگوں کے ساتھ ہیں
(یہ) ہمیں نشانی کے بطور رندوں کی سرخ چشم لڑکیوں نے دی ہیں
اِن (نشانیوں) پر پورا اترنا مشکل ہے کٹھن چٹانوں پر چڑھنا ہوتا ہے
یہی تو وہ وقت ہے جب زائیدہ اور گابھن جدا ہوتے ہیں
بہادر آگے بڑھتے ہیں، بزدل پہلو بچاتے ہیں
اپنی محبوباؤں کو یاد کرو اور اپنی گھوڑیوں کو ایڑ لگاؤ
اس لیے کہ بعد میں خبریں پہنچیں گی بستی کی عورتوں تک
سبی دور نہیں وہ دھند میں نظر آتا ہے
تم لوگ تیغوں کے سامنے سے پہلو نہ بچانا
ہمیں بعد میں طعنے اور دشمنوں کی باتیں سننی نہ پڑیں
قتل شدہ مردوں کی نشانی کے لیے پتھر کی یادگاریں بنائی جاتی ہیں
واپس جانے والوں کے لیے تو بعد میں محض طعنہ والزامات ہوتے ہیں

قبیلے کا اجتماعی دفاع ہمارے ویلیو سسٹم کا ایک اہم جزو رہا ہے۔ دلچسپ ہے کہ حوصلہ بڑھانے والی اس ساری شاعری میں آپ کو خوف کا اظہار نظر نہ آئے گا۔ صرف ہمت بڑھانے کی باتیں ہیں۔ اور اس میں کسی فلسفہ یا نظریے کی ضرورت نہیں ہے۔ سادہ سی بات کہ قبائلی وقار کو برقرار رکھنا ہے۔ عزتِ نفس کے دفاع کی جنگ ہے یہ۔ کہیں بھی آپ کو کوئی اجتماعی بزدلی نظر نہ آئے گی۔

یہ خوبصورت بات بھی مدنظر رہے کہ اس سارے قصے میں پیر و مرشد موجود ہے مگر ملاّ مولوی کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ پوری بلوچ رزمیہ شاعری میں سے ملاّ غائب ہے۔ اُس کی کوئی حیثیت، کوئی یوٹیلیٹی، کوئی افادیت موجود نہیں۔ عورت، گھوڑی، تلوار، نیزہ، مرشد، مراثی، شاعر............ سب اپنے اپنے رول میں نظر آتے ہیں مگر ملاّ کا کوئی رول کوئی ذکر اذکار تک نہیں۔ مکمل نظر انداز کردہ............

اور دوسری حیران کردینے والی بات محبوبہ کے بہترین استعمال کی ہے۔ محبوبہ اب محض

محبوبہ نہیں رہتی، وہ اب جنگی ترانہ بن جاتی ہے۔اُس کے سامنے شرمندہ نہ ہونا باقی ہر بات سے افضل ہے۔محبت اب مکینکل فورس بن جاتی ہے۔محبوبہ نظر نہ آنے والی وہ قوت بن جاتی ہے جو لڑائی کے پورے وقت آپ کو دیکھ رہی ہوتی ہے۔لہٰذا ہاتھ نہ کانپے، دل نہ دھڑکے، ہونٹ نہ سوکھے، شمشیر نہ تھمے، ڈھال نیچے نہ ہو، دشمن کو پشت نہ ہو............سارا جنگی دورانیہ محبوبہ کو راضی رکھنے اور اُس تک اچھی خبر پہنچانے کی جدوجہد ہوتی ہے۔سماجی معاشی اور سیاسی مقاصد و عوامل کچھ بھی ہوں، جنگ محبوبہ بنا نہیں لڑی جاسکتی ہے۔بلوچ سماج میں یہ پہلو بہت ہی دلچسپ ہے:

ٹُوکیں بیورغئے، گہرام لاشاری گُرّمہ خاں
مرشی رِند ترا نَیلی ، تہ بمبوہ عہداں وہارمہ خَس
پاذاں گِناّرَے یبّرِیں دارئے ہُشتراں
ماہواں مڑدوں، مئے سرگوں ہے ڈاچیاں گہاں
ما یبّریں پُچّینوں وثی ریش و سُنّتاں
یاثی بگّہ گڑدیناں یا شہیذی موثے مراں
ژہ رندہ بارغیں زالاں لال صذ وءَ سیغی کناں
چَندِ ہا ہوتاں لیڑوی زُنڈاں گوئردیاں
وثی تنگویں نا ما گوں ہتّکاں سُہنڑایہ کناں
سئی آں موث مناں نَیلی نَیں کہ مں ہکّو زیندغاں
ہَیسی سر نہ پاریزتہ مں ژہ سیالانی گُھسّواں
باجے ژہ زہمائیں ترا ڈاچیاں دیاں
یا جھینئے میرالا یا گڑ دے گوں ہونوئیں دَفا‘‘

ترجمہ:

بیورغ کی آواز آئی کہ گوہرام لاشاری بھاگنا مت
آج رند تجھے نہ چھوڑیں گے، تم اپنی محبوبہ سے کیے ہوئے عہد کو خراب مت کرنا

ذرا سا آہستہ ہو جاؤ، اونٹوں کو روک دو
ہم وہ لوگ ہیں جن کا سر اِن اونٹوں کے ساتھ رہن رکھا ہے
ہم ایک بار ضرور اپنی داڑھی اُن تک پہنچا دیں گے
یا اپنے اونٹ واپس لے جاؤں گا یا شہید کی موت مروں گا
رند کی خوب صورت عورتوں میں سے لال صذ و کو ماتمی بنا دوں گا
کچھ بہادر دشمنوں کو اپنے گھٹنوں کے نیچے مار دوں گا
میں اپنے سنہرے نام کو مزید خوبصورت بناؤں گا
جانتا ہوں کہ موت مجھے نہیں چھوڑے گی نہ ہی میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہوں گا
میں نے اپنا سر نہ بچایا دشمنوں کی لڑائیوں میں
تلوار کے بغیر تمہیں اونٹ نہیں مل سکتے
یا میرے قبیلے کو ختم کر دو گے یا خون آلود منہ سے واپس لوٹو گے‘‘

یہ مونولاگ یا پھر اعلانِ عام جاری تھا............اور پھر ایک انہونی ہوگئی (بلوچ تاریخ انہونیوں سے بھری پڑی ہے!)۔:

ناغماں دنزے رُستہ مں ناڑی گوردفاں
ھیوتاں آتکہ بیورغ گوں ٹونڈ پاغیں یلاں
چاکر داروثی پوڑاں یپڑیں میر الی مڑاں
ٹِیکشہ نَپتاں کپتغاں بور گوں واژہاں
گوئڑ تغہ زہماں گوں وثی زنزیریں رَھاں
شُنچشہ ہوناں شُنچشہ سوزیں اِسَپراں
چے کشہ تیغاں پہ سَغرّانی بُرّغاں
چَند ِ ہاہوت گوں بنگویں براثاں کپتغاں
گَرّ ِ شہ بَچاّں گرّشہ آریفیں پثاں

نیزغ و کُنڈھی ایں کواناں آ گھا لتغاں
جَو نھریں تیغاں داس و ٹانڈائی رُنتغاں
کَپّریں زَہماں دان و جاندراہی دُرُشتغاں
بے جُڑیں گرندا ترونگل و میشی گپتغاں
ساہتے گوئنڈیں تیغ ژلانگاناں گوئستغاں
کُل ہواں میرالی مزاراں دراہیتغاں
ہیوتاں رندا پذ نہ کنزّوخیں گھوڑواں
ہَو گِیز میرالی داثَیں پہ بگّہ روہواں
نُہ صذ و پنجاہ کُشتیں ژہ ہونی ایں بذاں
نِیں جَھلیں پیشین اے پِینز کشہ لاشار پوتڑواں
چاکرہ زڑدو گوں جھیڑو و جنگاں گڑتغاں

ترجمہ:

پھر اچانک ناڑی دریا کے آس پاس ایک گرد وغبار اٹھا
ہیوتان آیا، بیورغ آیا، ٹیڑھی پگڑیوں والے بہادروں کے ساتھ
چاکر! تم اپنی فوجیں روک دو ایک بار ہم میرالی قبیلہ کے لوگ لڑیں گے
تب آسمانی بجلیاں چمکیں اور گھوڑے اپنے سواروں کے ساتھ گرنے لگے
تلواریں برسنے لگیں اپنی آہنی دھاروں کے ساتھ
خون بہتا رہا، تلواریں چلتی رہیں
تیغوں نے سروں کے کاٹنے میں کیا کچھ نہ کیا
بہت سے بہادر اپنے پیارے بھائیوں کے ساتھ گر گئے
بیٹوں کی کٹی گردنوں سے آوازیں آتی ہیں، باپوں کے نرخرے بولنے لگے
نیزوں اور تاؤ دی ہوئی کمانوں نے انہیں لڑھکا کر رکھ دیا

جو ہر دار تیغوں نے ''درانتی اور جوار'' والا کام کیا
بھاری تلواروں نے غلہ اور چکی کی طرح انہیں پیس کر رکھ دیا
جیسے بن بادل کے گرج اور، ژالہ باری بھیڑوں کے ساتھ کرتی ہے
ایک مختصر ساعت کے لیے تلواریں بجتی ہوئی گزریں
سب کو اُن میرالی شیروں نے گرا ڈالا
ہیوتاں رند کے پسپا نہ ہونے والے گھڑ سواروں نے
ایک سو چالیس میرالی ان اونٹوں کی خاطر قربان کر دیے
نو سو پچاس، خونی دشمنوں سے ہم نے مار دیے
ظہر ڈھلے لاشار جوان بھاگنا شروع ہوئے
چاکر کے اونٹ جنگ وجدل کے ذریعے واپس آئے

دیکھا ناں کہ کہانی کیسا موڑ مڑتی ہے!! ۔ اچانک ہیوتان کے میرالی قبیلے والے جواں مرد میدان میں پہنچ جاتے ہیں ۔ وہی ہیوتان جو کہ چاکر کا اپنا سانڈ اونٹ زبردستی لے گیا اور جس کے ساتھ لڑائی چھڑنے والی تھی کہ ہانی درمیان میں آ گئی تھی ۔ مگر جب مشترکہ دشمن کی بات آئی تو ہیوتان چاکر کی فوجوں کو رکنے کا کہہ کر خود لاشاری سے لڑتا ہے اور اپنے ڈیڑھ سو شہسوار قربان کر کے مشترکہ دشمن لاشاری سے چاکر کے اونٹ واپس لاتا ہے ۔ کس قدر دلچسپ ہے بلوچ نظامِ اخلاقیات!! ۔ مگر اب تک قصہ ختم نہیں ہوا۔ سانس روک دینے والا ایک اور موڑ تو اب آ گیا ہے۔ اور یہ موڑ پچھلی تمام خمداریوں سے مختلف ہے۔ بہت جذباتی، روح کو چھونے والا:

بگ بڑ تہ میرالی مَزَن دِنگیں ناہراں
ہرچی مَڑ کشائیثیں گلّرہ گوبڑتہ کوکراں
سردار مں ژہ تئ راجہ اندرا پِیراہی پَساں
گوں وَیل وسختیاں ما ڈُکھ ہموذّاتیں دیثغاں
مں چاکرہ دیزانی دَفا ہِکّو گرَستغاں

نیم کُشائیتوں نیم زدّغیا گڑتغاں
ذاتے روش میرالی دف و دَتّاں بیثغاں
نَیں گنوخے ثاں نَیں شراواں بھُلّیتغاں
اُگّی غیر تا، لجّا او حیایا بجّیتغاں
دانی تہ دورے تہ بیا تراڈاچیاں دیاں
یاتئ بوہرہ گیلاں یا وثی بَڑّائی کناں
نِیں مں ہے بارہ زِیرِ غا ہیلاک بیثغاں
تئ بگ گوں گوئہرامئے ، تہ وثی چمّاں دیثغاں
گڑہ تئ ہے بہاذر و مزار تانگو بیثغاں
نِیں ترا ہَیر با، مں ژہ تئ براثیا دراں
یا وثار جھیثوں یا ژہ ثی جانا منثغاں
زیادَہیں چوری آتکو گُٹّا کپتغاں
بگّہ سردارئے ڈاچی گوں ہِرّاں چیار صذاں

ترجمہ:

یہ اونٹ میرالی کڑیل بہادر ساتھ لے گئے
جتنے لوگ ہم نے مروائے ہیں ایسے بے فائدہ جسے کلر والی زمین پر برسات
سردار! میں تو تمہاری رعایا میں صدقے والا دنبہ ہوں
ہم نے ہر طرح کے دکھ اور سختیاں جھیلیں
میں چاکر کی دیگوں میں ہمیشہ اُبلا ہوں
آدھے مروا دیے، آدھے زخمی لے جا رہا ہوں
ہر روز میرالی ہی قربان ہوتے آئے
نہ میں پاگل ہوں، نہ شراب کے نشے میں دُھت

محض غیرت نے، لج نے اور حیا نے مجھے پھنسایا ہے
ابھی بھی اگر تمہیں تکلیف ہے تو سردار آؤ تمہیں اونٹ دے دوں
یا تمہارا صفایا کر دوں گا یا خود کو برباد کر دوں گا
اب میں اس بوجھ کے اٹھانے کا عادی ہو گیا ہوں
تمہارے اونٹ تو گوئہرام کے پاس تھے، تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا
تب تمہارے بہادر اور شیر کہاں تھے
اب تمہیں خدا حافظ! میں تمہاری برادری سے خارج
یا تو خود کو تباہ کر بیٹھا ہوں یا ویسے ہی تھک چکا ہوں
یا زیادہ یتیم آن کے میرے ذمے ہو گئے ہیں
شتر بچوں سمیت سردار کی چار سو ڈاچیاں ہیں

چلو، یک نہ شد دو شد۔ میرالی نے مشترکہ دشمن لاشاری سے تو اونٹ واپس چھین لیے مگر چاکر کو واپس کرنے کے بجائے خود رکھ لیے۔ ہیوتان نے چاکر کے اونٹ مشترکہ دشمن سے تو چھین لیے، مگر اپنے پاس پیار محبت اور بھائی بندی میں نہ رکھے بلکہ بزورِ بازو ایسا کیا۔ اب سوچیے، بھلا چاکر کیا کرے گا؟

چاکرہ جاں پہ نندغا آرامہ نہ خاں
لانچشہ رندا پہ مڑائی و جھیڑواں
چاکرہ بگّاں نَیلوں گوں میرال پوترواں

ترجمہ:

چاکر کو چین نہیں آتا
رند لڑائی کے لیے تیار ہو گئے
ہم چاکر کے اونٹوں کو میرالیوں کے پاس نہیں چھوڑیں گے

ایک بار پھر بلوچ خاتون اپنا رول ادا کرنے میں میدان میں آ جاتی ہے۔ یہ ہانی ہے۔ وہ

ایک بار پھر برادر کشی روکنے میں گوہر کے نقشِ قدم پر چلتی ہے۔

(کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آج بلوچ عورت تحریک اپنے منشور میں گوہر جنتڑیں کے تفویض کردہ فریضہ کو بھی شامل کردے؟۔ بلوچ قبائل میں آپسی جنگوں کو روکنے کا کام کرے؟۔ گوکہ بظاہر یہ کام اِس قدر سیاسی نہیں لگتا ہے اور کم اہمیت کا بھی، مگر ذرا سا غور کیا جائے تو بے شمار انسانی جانیں بچائی جاسکتی ہیں)۔

عقّلاں ہانی سَکّہ ژہ بازیں دانہاں
گشتئ چُپ کنیں شیطان و سیاخامیں لوفراں
سردارمڑ ہوانہاں کہ جونہریں تیغاں گپتغاں
اے ہنچو مچہ باں بازارہ دفا ہُونگانہ دیاں
اے ہواں بگّیں کہ گڑتہ گوئہرامہ لشکراں
ژہ دِہی دِنگاں گوں تئ براثاں جواں تِراں
اَول وگُڈ روشے پہ تئ کاہوآں رواں
زہر و وَہش بَں دہِ ہَر باتئ دَہڑکوآں سَھاں
ئیں چاکرو شہذاذ جکّثو حیراں بیثغاں
پہ ہُنر ہانیاّ بُڑ تَو انجام داثغاں

ترجمہ:

دانائی میں ہانی کئی عقل مندوں سے زیادہ تھی
کہنے لگی چپ ہو جاؤ، فسادی نولوفرو
سردار، تمہارے اصل آدمی تو وہی تھے جنہیں تیغوں نے آن لیا تھا
یہ لوگ تو بس بازار میں جمع ہو کر بڑھکیں مارتے ہیں
یہ تو وہی اونٹ ہیں جو گوئہرام کے لشکر سے واپس لیے گئے
دشمنوں سے تمہارے اپنے بھائیوں کے پاس اچھے ہیں

جو ہمیشہ سے تمہاری مصیبتوں میں آن پہنچتے ہیں
ناراض بھی ہوتے ہیں پھر بھی تمہاری جھڑکیاں برداشت کرتے ہیں
اب چاکر و شہداد ہکا بکا رہ گئے
ہانی نے دلیل کے ساتھ انہیں بالآخر ٹھنڈا کر دیا

کیا بہترین حکمتِ عملی تھی۔ ''اچھا، میرے چچیرے بھائی! ہم تم سے نہیں لڑتے۔ تم ہمارے بہادر ہو، دشمن سے ہمارا مال چھڑا کر لائے ہو'' .... چاکر خاموش ہو کر اپنے سبی میں بیٹھا رہا۔ ہیوتان نے ایک دن انتظار کیا، دو تین دن چوکنا رہا کہ چاکر کی فوجیں اب حملہ کریں کہ کریں۔ مگر اُس طرف سے مکمل خاموشی۔ جب ہیوتان نے دیکھا کہ چاکر تو مجھے اپنا سمجھ کر مجھ سے نہیں لڑ رہا تو پشیمانی کے سمندری گہرے بادلوں نے اسے گھیر لیا۔ اُس کا دل پسیج پسیج گیا۔

ہپتمی روشا گوانکہ جَں میریں ہیوتاں
گوئشتئ بیورغا ، بیشکُنیں میرالی رِگھاں
مں چاکرہ بگّہ دوشغا باڑا چی نَیاں
کئے صلاح رنجا کں وثی ماثا ن و پِثاں
مں چاکرہ بگّا شے بھری گڑ دیناں دیاں
بگّے گڑ دیثو داثئ گوں ٹِھ و نوکراں

ترجمہ:

ساتویں دن میر ہیوتان پکارتا ہے
اس نے بیورغ سے کہا
میرالی معتبرین سے کہا
میں چاکر کی اونٹنیوں کا دودھ دوہنا ہرگز نہیں چاہتا
کون اپنی مرضی سے اپنے والدین کو ناراض کرتا ہے
میں اس بار چاکر کے اونٹ واپس کرنا چاہتا ہوں

اس نے اونٹ واپس کردیے نوکر چاکروں کے ساتھ

بلوچ کا دل بپھر جاتا ہے تو کُشتوں کے پُشتے لگاتا ہے، نرم ہوتا ہے تو معمولی ادا اُسے پگھلا دیتی ہے۔ ہم سب نے اب تک اُس دل کا قہر و جبر دیکھا، آیئے اب اس کا مہر و محبت، اس کی حلیمی اور کریمی دیکھیے۔ یا انتہائیں ہیں:

ڈاچی روزگاناں تلّی دامانا گوئستغاں
بگ مس سیویا پجّشہ زہریں نیم شفاں
ٹلّشو بھتّانی بُنا جَتّاں داشتغاں
نِیں چاکر و شہزاذ درکفاں سیوی بندراں
آ تکئو سرؔدار جلّشہ بگّانی جھَراں
زیارتہ کنتش مس کفوتیں کوہانٹغاں
چاکرا آں روش گوئرؔتہ چو گُنگ ہَوریں جُڑاں
مال دِلہ پاڑاں کایاں ثہ راذیں واثہاں
ٹوکے سرؔدارا گشتہ گوں ٹِہھ و نوکراں
بیاریں مئیں کاڑ چا مس وثی جانے ساڑ کناں
پہ نامے اللہ یا میگرؔے حیرا تہ کناں
سو کرؔ و سَنڈاں چِرؔ کشہ سُرگوشیں جَڑاں
گرّ ِشہ بازارہ دَفا سیاہیں پَنڈراں
چاکرا میرالی ِگھیں مرؔ نزّ آرتغاں
گوں رَتلغیں کٹّان و پلنگاں نیاذیثغاں
بھانکر و دراہی گوں ملا خات و گندغاں
قِولَہی میوہ گوں پُلایاں چِرہ کناں
چاکرا ڈومبا گواں جشہ سیوی دپتراں

بیش کُنیں رِنداں بیش کنیں دوست و دژمناں
بیورغ و میران و سُخں پالیں ہیوتاں
شار رندہ سردارا زیادہیں جاگیر داثغاں
کوٹغے سیوی ئے سَری داثئی پہ انعام
گوٗشتئی ڈاڈر و بولاں اے شوئے بورانی تیرغاں
چاکرئے میلاھہ دفہ گنڈہو چاڑدہاں
گشتغیں جوآں تیغی گوں سیاہ آفہ بَہاں
اے شوئے رَنّ و چوریاں رِندہ سرؔدارا داثغاں
گرؔہ گرؔتہ میرالی گوں سوب وساری و دَہم دَہماں
شَیر کشہ ڈومباں گوں پُرُنگیں دمبیر واں
رند و مِیرالی گوں ہَیر و انجاما نشتغاں

ترجمہ:

ڈاچیاں دھاڑتی ہوئی تلی کے دامان سے گزریں
اونٹ سبی پہنچے نیم شب کے وقت
چرواہوں (جت) نے انہیں دیواروں کے پاس روکے رکھا
اب چاکر و شہداد باہر نکلتے ہیں
سردار آکر اونٹوں کے درمیان کھڑا ہوگیا
وہ اُن کی زیارت کرتا ہے، کبوتر جیسے کوہانوں کی
چاکر اُس روز خاموش برسنے والے بادلوں کی طرح برسا
مال مویشی تو مالکوں کے دل کی جڑیں ہیں
سردار نے غلاموں نوکروں سے کہا
میری چھری لے آؤ تاکہ میں اپنا دل ٹھنڈا کروں

میں خدا کے نام پر ایک پورا ریوڑ خیرات کرتا ہوں
سرخ گوش دنبوں، اور بھیڑوں کی قطار لگ گئی
شہر کے وسط میں بیلوں گایوں کے نرخروں کی آوازیں آئیں
چاکر نے میرالی کے معتبرین کو جمع کیا
انہیں خوب صورت آرام دہ پلنگوں پر بٹھایا
گلے ملے ملاقاتیں ہوئیں
دور دراز کے پھل اور پلاؤ بھرے تھال آنے لگے
چاکر کے ڈومب نے پکارا
''رندلو گو سنو دوستو دشمنو سنو
بیورغ، میران اور سخن پال ہیوتان سنو
تمہیں رند سردار نے بڑی جاگیریں بخش دیں
سبی کا نصف انعام میں دیا
اس نے کہا ڈاڈر اور بولان تمہارے گھوڑوں کے توبرے ہیں
میلاھ میں چاکر کے چودہ بندات ہیں
یہ سب نہری پانی سے سیراب ہوتے ہیں
یہ تمہاری بیواؤں یتیموں کو سردار نے بخش دیے ہیں''
تب میرالی فتح خوشی تکریم اور ڈھول باجوں سے واپس لوٹے
ان واقعات کو ڈومبوں نے خوش آواز طنبوروں کے ساتھ شعر میں ڈھالا
رند اور میرالی امن وامان کے ساتھ رہنے لگے

بیورغ

Beevragh

پس منظر

سولھویں صدی بلوچستان میں ایک مردم خیز صدی رہی۔ ہانی، چاکر، گوئہرام، مریذ، ماہناز، جاڑو، نوذبندغ .... بہادروں، دانشوروں، ماہرین زراعت و مویشی بانی، اور جنگی حکمتِ عملی کے استادوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مگر یہاں ایک شخص ایسا بھی تھا جو ایک سے زائد شعبوں میں استاد اور دیدہ ور تھا.......... بیورغ۔ خداداد صلاحیتوں سے بھرا بیورغ چاکر کا بھانجا تھا، مائی مُذی کا بیٹا۔ اس کے والد کا نام باہڑ تھا۔ اسے خدا نے بہادری اور قوت سے مالا مال کیا تھا۔ قوتِ فیصلہ، دور اندیشی، اندھی بہادری اور شاعرانہ تخلیقی وصف سے مالا مال بیورغ۔

اس عہد کے تین ہی تو آدمی ہیں جو اب تک لوگوں کے دلوں میں محبوب و مقبول ہیں؛ چاکر، مریذ اور بیورغ ۔ چاکر تو سردار تھا کرامتوں والا ، مریذ اور بیورغ اپنی خوب صورت داستانوں اور عوامی دلکش نغموں کے سبب۔

اُس کے نام کا تلفظ بلوچستان میں بہت مختلف ہے۔ جھنگ سے لے کر جوہان تک کے مشرقی اور وسطی بلوچستان میں اسے بیورغ ہی کہتے ہیں۔ کہیں کہیں بریوغ بھی۔ مگر چاغی اور مکران میں ''و''، ب میں، اور غ، گ میں بدل جانے سے یہ بیبرگ بن جاتا ہے۔ وہاں بیگر کا تلفظ بھی موجود ہے۔

بلوچوں میں یہ نرینہ نام بہت عام ہے۔ بالخصوص مشرقی بلوچستان میں۔ اس کے علاوہ قبیلوں کی ذیلی شاخیں ''بیورغ زئی'' کہلاتی ہیں۔ بگٹیوں کا تو فیوڈل سردار گھرانہ ''بیورغ زئی'' کہلاتا ہے۔ انہی علاقوں کی بھیڑوں کی نسل اسی نسبت سے ''بیورغ نسل'' کہلاتی ہے۔

اس نام کے لغوی مطالب میں نے بہت تلاش کیے۔ مگر لے دے کر لوگ مذہبی شخصیات کی طرف جاتے ہیں۔ یوں اس خوبصورت اور شیریں لفظ کا مطلب ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ بعد میں بلوچ وائس فارمسنگ پرسنز کے تاریخی کوئٹہ، کراچی، اسلام آباد مارچ میں شامل بیورغ نامی ایک ننھے بچے کے نام کی تشریح میں برادرم میر محمد علی تالپور نے یہ دلچسپ دریافت کی کہ اس نام کا مطلب ہے: انتقام لینے والا۔ میرے دل کو بھی یہ بات درست لگی: بیورغ، بیر گیر کی بگڑی شکل بالکل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی اور تشریح سامنے نہیں آتی، بیورغ کا مطلب میں بیرگر ہی لوں گا؛ انتقام لینے والا۔

یہ شخص اب تک کے بلوچی کے شعرا میں صفِ اول کے شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ خوب صورت ترین شاعری ہے بیورغ کی۔ اس لیے کہ زندگی نے اسے جنگ، محبت، مفاہمت، سفارت کے شعبوں میں بے شمار مشاہدات وتجربات سے گزارا تھا۔ وہ سب اُس کے شعروں میں ڈھلے ملتے ہیں۔ کچھ تجربات تھے، زندگی خوشیوں اور غموں کے کچھ تلخ وشیریں یادیں تھیں، ان سب کا بیان بیورغ کی شاعری میں ملتا ہے اور وہ بھی سیدھے سادھے بیانیہ انداز میں نہیں، تفکر کا رنگ لیے ہوئے۔ ایسی قادرالکلامی، اور قول کے پاس کا ایسا پکا کہ بلوچوں میں وہ ''بیورغ کلامانی'' کے نام سے مشہور ہے۔

دُر و گوہر پروئے اشعار کا مالک بیورغ، خوشحال خان کی طرح کثیر الجحوبہ شاعر تھا۔

بصارت وبصیرت سے بھرپور، پہل کار اور جرأت مند۔ بیورغ دشمن کی سپاہ اور عورتوں کے دلوں پر قیامت بن کے ٹوٹتا تھا۔ بیورغ اپنے پورے عہدے کا ترجمان رہا تھا۔

اُس زمانے کے رندوں کی روایت کی پیروی میں بیورغ نے بھی ایک قول دیا تھا۔ اس نے قول دیا تھا کہ ''میں نے جب بھی کسی رند عورت کو سر پہ پانی ڈھوتے ہوئے دیکھا تو میں اُسے باربرداری کا ایک جانور پانی ڈھونے کے لیے خرید دوں گا''۔ اور وہ اپنا یہ قول زندگی بھر نبھاتا رہا۔ جی، ہم سولھویں صدی کے بلوچستان کا ذکر کر رہے ہیں، جہاں ابھی تک این جی اوز ''فیمنزم'' کی اصطلاح وضع کر کے اسے کاروبار کا ذریعہ نہیں بنا چکے تھے۔

اس کا یہ قول اُس پورے عہد میں، اور شاید بعد میں آج تک سب سے زیادہ ملائم و نازک اور انسان دوست قول تھا۔ کتنا ظلم ہے کہ بیورغ کی شمشیر زنی کا تذکرہ تو ہم لہک لہک کر کرتے ہیں مگر اُس کا وہ آفاقی قول ہمیں یاد ہی نہیں جو اقوامِ متحدہ کے دفتر کے مین گیٹ پر کندہ کیے جانے کے لائق ہے۔ بلاشبہ بیورغ، مست توکلی تھا اپنے زمانے کا۔

اور پھر، عاشق ایسا کہ بس ذرا سا پیغام کیا آیا کہ بیورغ نے سوٹ کیس اٹھا لیا اور جہاز کے پائدان سے لٹک بیٹھا:

ششماہی بہاں زیں داثیں
سیوی دیرن و روش گرماں

ترجمہ:

ہم نے کم سن اسپ بچے پہ زین کس لیا
سبی بہت دور ہے اور دن بہت گرم ہیں

بہت سے معاملات میں بیورغ، خوشحال خٹک سے بڑھ کر جاندار و متنوع کردار تھا۔ شاید منفی معاملات میں خوشحال زیادہ بدنام ہوا۔ لیکن خوشحال افضل اس معاملے میں ہے کہ اس کی شاعری گم نہ ہوئی۔ وہ سب کی سب لکھی گئی۔ وہ ایک سے زیادہ زبانوں میں طبع آزمائی کرتا تھا۔

لیکن بیورغ کے آثار دیکھیں تو لگتا ہے کہ اگر چیزوں کو ریکارڈ رکھنے کا رواج موجود ہوتا تو بیورغ شاید بہت بلند شخص تھا۔ایک مکمل بلوچ۔کوئی جھول،کوئی کمزوری نہیں۔شجاعت میں،انگریزی کا لفظ Shivalerous شاید ہی تسکین دے سکے۔ایک بہادر لڑا کا اُس کے لیے تو بلوچی کا لفظ ''کور بہادر'' ہی موزوں رہے گا۔قربانی میں اپنا سر حاضر کیے ہمیشہ اپنے ساتھیوں سے آگے آگے ہوتا۔سخاوت میں وہ زرزوال نوذبندغ کا ہم سر تھا۔جنگی مہارت میں اپنے زمانے کا گیاپ جیسا، اور سفارت کاری میں اُس دور کا ماہر ترین شخص، بزنجو!!............ایک سٹیٹس مین، ایک مدبر، ایک سیاستدان و سیاست کار۔ وقار و عظمت بھرا معتبر۔وجیہہ اور خوبصورت ......سفر کا شوقین، سیر و سیاحت کا دلدادہ۔ جوانی ایسی شاندار کہ اُس نے اپنے اشعار میں اُسے بار بار سراہا ہے۔ایسے اوصاف سے مزین شخص اپنی شکل و لباس اور وضع قطع کا کتنا خیال رکھتا ہوگا!!......اِن سب اوصاف کو ملا دو تو بلوچی کا لفظ''ننگر'' بنتا ہے۔اُسے''ننگریں بیورغ'' کہا جاتا ہے۔ایک لفظ استعمال ہوتا ہے Par excellance، وہ کسی اور پہ موزوں ہو نہ ہو، بیورغ پہ فٹ بیٹھتا ہے۔

بیورغ بہت بہادر تھا، وہ چیلنجوں کو بہت ہی جرأت سے قبول کرتا تھا۔ایک دن دیوان یعنی سرداری دربار لگا ہوا تھا۔میر چاکر نے اپنی لکڑی کی نوک دار کنگھی محفل کے درمیان میں پھینک دی کہ کوئی جواں مرد اُسے اپنی داڑھی کے ساتھ پھنسا کر رکھے۔یہ گویا اس بات کی نشانی تھی کہ سردار محفل میں موجود بہادر ترین شخص کو کوئی اہم کام یا مہم سونپے گا۔ظاہر ہے کہ یہ سرداری کام بہت ہی مشکل ہوگا۔اس لیے کسی نے جنبش نہ کی۔نوجوان بیورغ جس کی ابھی داڑھی نہیں آئی تھی، آگے بڑھا کہ''ماما، مس؟''۔(ماما میں؟)۔مگر چاکر نے کہا تم ابھی کم سن ہو، تمہاری داڑھی ہی نہیں تو کنگھی پھنساؤ گے کیسے؟۔دوسری بار چاکر نے کہا کہ''ہے کوئی جو اِس چیلنج کو قبول کرے؟''۔پھر کوئی آگے نہیں آیا۔بیورغ نے وہی الفاظ کہے اور چاکر نے وہی جواب دیا۔تیسری بار چاکر نے رندوں سے کہا کہ''کوئی بہادر کنگھی اٹھالے اور اپنی داڑھی میں پھنسالے؟''۔مگر کسی نے ہمت نہ کی۔اب بیورغ آگے بڑھا کنگھی اٹھالی، اور اپنی بن داڑھی جبڑے کے گوشت میں پیوست

کر کے کہا:''اب تو میں کم سن نہیں ہوں نا؟''۔چاکر نے کم سن کو بڑا اور بالغ تسلیم کیا اور اپنا کٹھن مشن اُس کے ذمے لگایا۔

بیورغ بڑے کمال کا شاعر تھا۔اُس کی ساری شروعات والی شاعری عشقیہ ہے۔اس کے معرکے، معاشقے اور مقولے بلوچی ادبی اور فوک لور تاریخ کا اہم ترین حصہ تشکیل دیتے ہیں۔پُر خطر اور مہم جُو معاشقے اُسے سیستان و ہرات و مشکاف تک کھینچ لے جاتے۔انہی معاشقوں نے ایسی خوب صورت شاعری تخلیق کرادی کہ آج بھی بغیر آہ بھرے اُس کی شاعری دہرائی نہیں جاسکتی۔اظہار سے بھرپور، الفاظ کا خوبصورت اجماع، عشقیہ مناظر کی جرأت و بہادری کے کارناموں میں ملفوف باوقار باوضاحت، عمدہ بیانیہ۔سردار خان اُسے بلوچی کا وکٹر ہیوگو کہتا ہے۔میں تقابل کو چونکہ اچھا نہیں سمجھتا اس لیے خاموش ہوں۔لیکن اگر سردار خان حیات ہوتے تو میں انہیں ضرور''کیوپڈ'' کی طرف متوجہ کرتا۔عاشقانہ بانکپن۔گل خان نصیر کے بقول بیورغ کی شاعری،''ایک بانکے، سجیلے، امیر زادے کی شاعری ہے جو اپنے گھوڑے پر سوار، تلوار اور ڈھال لٹکائے ایران و افغانستان تک کے علاقوں میں گھومتا اور عشق لڑاتا ہے۔''(بلوچی عشقیہ شاعری، صفحہ 272)۔

فیوڈل اخلاقیات کے پردوں کے پیچھے خواہ کتنا ہی چھپا جائے یہ حقیقت ہے کہ بلوچ ازدواجی تعلقات کے باہر بھی جنسی تعلقات رکھتا رہا ہے۔اُس زمانے میں اُس جرم کی سزا، موت نہیں ہوتی تھی بلکہ صرف طلاق دی جاتی تھی۔ سیاہ کاری والی موت کی سزا بہت بعد میں آگئی۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دل کش و شیر دل بیورغ کی بہت ساری محبوبائیں تھیں۔

بیورغ بلوچ زبان کا بلبلِ ہزار داستان ہے۔اس کی ہر داستانِ عشق ایک نئی دنیا، ایک نیا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔آیئے ملک عشقستان کی سیر کا ارادہ باندھتے ہیں۔

****

بیورغ و صدو　Beevragh O Sazzo

بیورغ کی ایک محبوبہ صدو تھی۔ بقول ہماری روایتی قصہ گوؤں کے وہ ایک جتنڑ یں تھی۔ دوسرے تیسرے درجے کی شہری، جس کے ساتھ جنسی تعلق رکھنا شاید مرگ والی سزا جتنی خطا تصور نہ ہوتی تھی۔ حیران یا سیخ پا ہونے کی بات اس لیے نہیں کہ بلوچ سماج معلوم تاریخ میں کبھی غیر طبقاتی سماج نہ رہا۔ عام انسان اب تک ہمارے سماج کا ایک 'سنہرا زمانہ' دیکھنے سے محروم ہی رہا۔ مولد و غلام وٹیہہ سے لے کر 'اگ جاہ' تک کے الفاظ اپنے پیچھے معافی کی اتھاہ تہیں رکھے ابھی حال تک موجود و مستعمل رہے۔

جت عورتیں چونکہ نچلی ذات کی ہوتی ہیں، اس لیے اُن پر فیوڈل دکھاوے والی اقدار کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ انتہائی حسین ہوتی ہیں۔ بہت بولڈ و بے تکلف، آزاد و حاضر جواب۔

بہر حال ہم صدو اور بیورغ کی بات جاری رکھتے ہیں۔ اور ابتدا اُس کربناک ٹائم پیریڈ کے تذکرے سے کرتے ہیں جب محبوبہ ابھی تک قاصدوں، نامہ بروں، تحفوں، درشنوں، درخواستوں اور التجاؤں کا کوئی ردِ عمل نہیں دکھاتی۔ قرنوں کی سیاہ خاموشی ساری گرم جوشی کا منہ چڑاتی ہے۔ خاموشی۔ نہ آس نہ یاس نہ امید نہ ناامیدی............اس کیفیت کو بیورغ سے زیادہ کون بیان کرسکتا ہے:

دوستہ　منیث　کہ　وش　کناں　زڑدا
نَیں　نہ　ءَ　کنت　کہ　مس　حاطرا　بلّاں
مارا　مس　نیام　گمبو　لغاں　داشتئَ
بڑز　ژہ　نوذان　و　لاغریں　شینکاں

ترجمہ:

محبوبہ نہ تو ہاں کہتی ہے کہ میرا دل باغ باغ ہو جائے
نہ وہ نہ کہتی ہے کہ میں امید ہی ترک کردوں

اس نے ہمیں درمیان میں لٹکائے رکھا ہے
اونچا بادلوں سے بھی، نیلگوں آسمان سے بھی

اچھا، بالآخر محبوبہ مان گئی۔ ذرا خوشی تو دیکھیں، انبساط تو ناپیں!!

ژہ　شکارانی　پلوہ　کا　تکاں
ہئے　او　ہئے　آں　کہ　منشہ　دوستا
منشہ　دوستئے　مکھیں　ماثا
بیگہی　موکلیں　تہ　و　وتیغا
گوں　صذو　آ　او　گورغیں　گُلا

ترجمہ:

میں شکار سے لوٹا
ہاں رے ہاں محبوبہ مان گئی
محبوبہ کی ماں مان گئی
صذو کے پاس اُس کے خوبصورت خیمے میں

لگتا ہے سورج اور روشنی سے عشاق کا جھگڑا صدیوں سے چل رہا ہے۔ ابھی ہم دیکھیں گے کہ بیورغ اِس سورج سے کس قدر غیر مطمئن ہے۔ اس لیے کہ اب سورج ڈھل کر ہی نہیں دکھاتا، عاشق تصورات میں، اُس منظر نامہ پہ غور کرتا ہوا:

صور　کنوروح　کہ　مس　ایر　براں　روشا
روش　کئے　زڑدیں　دیغرے　بوشتی
لعل　صذو　مسک　و　مندواں　مینی
پر　وثی　بریخ　و　پہ　منی　ریشاں

ترجمہ:

صبر کرا سے روح کہ میں سورج غروب کردوں

سورج عصر کی زردی میں گویا تھم گیا ہے
لعل جیسی صذو مسک وعطر گھوٹ کر بناتی ہے
اپنی زلفوں اور میری داڑھی کے لیے

خدا خدا کر کے کہیں سورج پردے کی اوٹ میں چلا گیا۔ اب اگلا مرحلہ ہے:

من کِرکناں سالوکی اوو کلا
گوئر صذو آ او گورغیں کلا

ترجمہ:

میں دولہا کی طرح سج سنور کر خیمے کی طرف جاتا ہوں
صذو کی طرف اور اس کے حسین خیمے کی طرف

لوگ کہتے ہیں کہ سال کی سب سے مختصر رات 21 جون کی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ وصل کی رات سے زیادہ مختصر رات ہوتی ہی نہیں ہے۔ چٹکی بجاتے ہی ختم ہو جاتی ہے نگوڑی۔ ہم بیورغ وصذو کے میل ملاپ میں ذرا سا وقفہ کیے دیتے ہیں۔ اور خیالات ونظریات کس طرح سفر کرتے ہیں، یہ دیکھتے ہیں۔ شیکسپیئر والے رومیو اور بیورغ کے عہد مختلف ہیں، علاقے، آبادی مختلف ہیں۔ باہم کوئی لسانی طبعی ربط نہیں ہے۔ پھر بھی دیکھیے دونوں کے بیچ ایک ہی جیسے الفاظ ایک ہی جیسے خیالات کس طرح کی حسین حیرت پیدا کرتے ہیں۔ محض کردار تبدیل ہیں، مگر مدعا اور نفسِ مضمون کی یکسانگی کس قدر دلکش ہے۔ پہلے رومیو جولیٹ کا یہ منظر دیکھیے اور پھر ہم آپ کو بیورغ سناتے ہیں:

جولیٹ:

ابھی سے جا رہا ہے تو، ابھی تو رات باقی ہے
نہ تھی آواز یہ مرغِ سحر کی، یہ تو بلبل تھی
یہی آواز بن کر خوف پہنچی تیرے کانوں تک
میرے پیارے میں سچ کہتی ہوں بلبل کی صدا تھی یہ

درختِ ناز پر وہ اس طرح ہر رات گاتی ہے

رومیو:

یہ تھا مرغِ سحر جس کو نقیبِ صبح کہتے ہیں
نہ تھی آواز بلبل کی ذرا دیکھو اِدھر پیاری
اِدھر مشرق میں کن حاسد شعاعوں نے لگائی ہے
چمکتی جھالر ان پھٹتے ہوئے بادل کے ٹکڑوں پر
بجھی قندیلِ شب، طرارِ دن پنجوں کے بل، وہ کیا
کھڑا ہے دھندلی دھندلی چوٹیوں پر،
اب اگر جاؤں
تو جاں بچ جائے گی ٹھہرا رہوں تو جان جائے گی

اور اب ذرا بلوچستان کے بیورغ کو دیکھیے اور اندازہ کیجیے سولھویں صدی کی بہت دور دراز دنیا کے دورترین گوشے میں کس بلند طرز کی شاعری نے سات سمندر پار عاشق کی مماثلت پائی۔ کس طرح رواں زندگی میں وقفہ وصل کی طوالت کی حسرتیں موجزن رہتی ہیں؛

اے شفئے سے پاس گوئستہ گوں ذونقاں
چیارمی پا سا آسثہ بامے
درکفی روشئے کافریں استار
کیث چو تیر دھوری جلشکاناں

ترجمہ:

رات کے تین پہر وصال کی لطف اندوزیوں میں گزرے
چوتھے پہر صبح کی روشنی نمودار ہوئی
صبح کا کافرستارہ طلوع ہوتا ہے

اور لشکارے مارتے برق رفتاری سے آتا ہے

صبح کے ستارے کو یاروں کے بچھڑنے کا استعارہ قرار دے کر اُسے ’کافر‘ کہہ دینا بالکل ہی نئی بات ہے۔ ناجائز، ناروا، ظالم، اور کریہہ ستارہِ صبح !!۔

حالانکہ دنیا بھر میں اسے آزادی، روشن فکری، اور انقلاب کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ مگر عشاق کی دنیا تو اپنی ہوتی ہے ناں۔ وصل کی پلک جھپکتی ساعت کے خاتمے کا اعلانچی کتنا قابلِ نفرت ہوتا ہے۔ روحوں کے قیدیوں کا جیلر اچانک اعلان کردے کہ ’ملاقات کا وقت ختم ہوگیا‘ تو ملاقاتیوں پر کیا بیتتی ہوگی !!۔

ہماری فہمیدہ ریاض نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

یہ فسوں کار و جواں رات، فقط دھوکا ہے
صبح اک ایسی حقیقت ہے، نہیں جس سے گریز
کون اس رات کے دامن کو جکڑ سکتا ہے
لاکھ چاہیں بھی، یہ یہ رات گزر جائے گی
اور پھر میری تمنا کی یہ نورستہ کلی
اس حقیقت کی کڑی دھوپ نہ سہہ پائے گی

بیورغ سماجی رسوم کی بندی گاہوں میں قیدی، محبت کرنے والی ارواح کا ترجمان ہے۔

پہلا ولن تو صبح کا ستارہ بنا۔ دوسرا صدمہ محبوبہ نے پہنچایا؛

آستغا چکی دستہ بانہیا
دھولہ گوں اوشیشیں کرائیا
دست چو گنگوہی بہ لوڈینتی
پاذبیا ورنا کہ آسشئی بامی
ما خو توہڑدوں مڑدموں نامی

ترجمہ:

(میرے سر کے نیچے سے) اپنا بازو آہستگی سے کھینچ لیتی ہے
اپنا ہاتھ اپنا شفاف بازو
میرا بازو پیار سے ہلا ہلا کر کہنے لگتی ہے
اٹھ جاؤ جوان کہ صبح ہوگئی ہے
اور ہم تم دونوں مشہور لوگ ہیں

ہم آزاد نظم والے زمانے کی بات نہیں کر رہے بلکہ پانچ صدیاں قبل کے نیم قبائلی اور نیم زرعی معاشرے میں ہیں۔ وصل کی ایسی تفصیل جس میں بازاری پن بالکل موجود نہیں.......... کلاسیک اسی لیے تو عمدہ ترین اور دیرپا ہوتا ہے۔

اب یہاں تک تو آپ ایک عام مگر بدمست جوانی کی عشقیہ کہانی پڑھتے رہے۔ مگر بلوچی کلاسیک نے موڑ تو کاٹنا ہی ہے۔ اور یہ اگلا موڑ ہلاکت خیز ہے۔ صرف دونوں محبوبوں کے لیے نہیں بلکہ ساری آبادی کے لیے۔ اور قتلِ عام والی جنگ کا نقارہ ہمارا بیورغ ہی بجاتا ہے۔ وہ اب اس عورت کو دوسرے کی ہونے نہ دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یا سر چلا جائے، یا رقیب کی گردن اڑا دی جائے، یا پھر طلاق ہوجائے۔ یورپ میں ڈوئیل جیسی چیز!۔

مں جواو داشۃ لڈ غانیا
داشۃ مں بانکا جنانیا
اے تئی عاریفیں پشہ ہیل ایں
دوستہ کلیث و گڈہ کنت لوغا
رند نہ کنزنت ژہ موڑغیں پینزاں
چوروی پذ کنزغ مناں حیفیں

ترجمہ:

میں نے جواب دیا مدھر چال والی کو
عورتوں کی ملکہ کو میں نے جواب دیا
یہ تو تمہارے پیارے باپ کی عادت ہے

محبوبہ کو چھوڑ کر گھر سے بھاگ جاتا ہے

رند تو ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹتے

نوعمروں کی طرح پسپائی میرے لیے حیف ہے

اب؟۔ مصیبت آ گئی ناں! صذو کو معاملے کی سنگینی ،سختی کا احساس ہو گیا۔ عصمت وغیرت تو ایک کچھار ہوتی ہے۔ عصمت وغیرت تو ماقبل جاگیرداری دور میں انسان ہونے کا سبب وثبوت ہوتے ہیں۔ اب جب محبوبہ صذو کو سو فیصد پتہ چل گیا کہ بیورغ نے جانا نہیں ہے اور اس کے اپنے خاندان والے خواہ جس قدر بھی پست مقام وذات کے کیوں نہ ہوں، ردِعمل تو ضرور کریں گے۔ محبوبہ نے بیورغ کو محبت سے ریش شدہ دل کے ساتھ ٹوکا؛

اغ ترا چوشیں نہمتے استا

چاکرے معلیم دار کنائینتے

ترجمہ:

اگر تمہارا اس طرح کا ارادہ تھا

تو کم از کم چاکر کو اطلاع تو کی ہوتی

مگر بیورغ یہ حفظِ ماتقدم پہلے ہی کر چکا تھا۔ وہ صذو کو اطلاع دیتا ہے؛

لنگوے ششتاثوں شفا دوشی

چاکروں معلیم دار کثوں دوشی

کایئے تئ قولیے موکغہ روشیں

اغ نیا یئے تہ شاہیں مئے والی

ترجمہ:

ایک مراثی کل رات بھیج چکا ہوں

چاکر کو اطلاع کر دی میں نے

کہ آتے ہو تو تمہاری قول پالی کا دن آج ہے

اگر نہیں آتے تو مولا میرا مالک ہے

اچھا، چاکر نے تو جب پہنچنا تھا سو پہنچنا تھا، اس درمیان بیورغ کیا کرتا۔ پوری آبادی نے جاگ تو جانا تھا۔ تو کیا وہ اُسے بے گزند چھوڑ دیتے؟۔ اِس طرح کی انتہائی حالتوں میں تو تیر کمان کی طرف ہاتھ بڑھتا ہی ہے۔ اور بیورغ اس بات سے بے خبر نہ تھا۔ اکیسویں صدی کے ٹیکنالوجیکل عہد میں بیٹھ ماقبل جاگیرداری والی پندرھویں صدی کا جج مت بنیے، بس شاعری، الفاظ، الفاظ کی گہرائی گیرائی کو دیکھیے؛

جادماں گاتری ئے ولا داشہ

زُنڈوں ماں پیشدارئے بُنا بھورینت

تیر منی موڑتیں جا بہا چیاراں

چیاراں تہ چتریں لیٹروے باراں

ہشتاں تہ گاڈوھے بگیڑ یناں

شانزدہاں تہ دلی ترک دلیخی باں

بیئے ہواں مڑ کہ وادہا بیاری

وٹڑی پُر بیثی حساوانی

گڑدی مئیں حدو آ تکنا بیثاں

ترجمہ:

میں نے تیر کمان میں چڑھا دی

خیمہ کے سامنے جم کر بیٹھ گیا

میرے شان والے کمر بند میں چار تیر ہیں

چار ہیں تو سمجھو ایک نوجوان اونٹ کا بار ہیں

آٹھ ہیں تو لاشیں بیل گاڑی اٹھائے

سولہ ہیں تو دلی کا مغل بادشاہ بھی مقابلہ نہیں کر سکے

وہی شخص مقابل آئے جس کا وقت پورا ہو چکا ہو

جس کے اعداد وشمار کا کٹورا بھرا چکا ہو

اب ذرا بستی والوں کا ردِعمل دیکھیے۔ وہاں کا منظر نامہ یوں ہے۔ محبوبہ کا خاوند پیرؔ ولی قدرتی طور پر غصے سے بپھر جاتا ہے۔ بیورغ کو قتل کیوں نہ کرے؟۔

پیر ولی کیث گوں ترا شتغیں ٹوڑھا
پنچ کسیری ایں پاڈیں ماں دستا
گالے مس بے آفیں دفا ایشیں
کہ مس کشاں بیورغا ملو کینا
باہرہ تنگہ دروشمیں بچا

ترجمہ:

پیرولی اپنے گنجے سر کے ساتھ آتا ہے
ہاتھ میں بیکار سی کند کلہاڑی لیے ہوئے
اس کے بےنمک منہ میں یہی بات ہوتی ہے
کہ میں قتل کر دوں گا جواں مرد بیورغ کو
باہؔر کے سنہرے بیٹے کو

ایک مناقشہ شروع ہو جاتا ہے، جھگڑا، بھاگ دوڑ، جھپٹ لپک اور پھر؛

نیامغا جوائیں مڑشفانتی آں
یعنی، اچھے انسان (مصالحت کو) درمیان میں پڑتے ہیں

مصالحت و مذاکرات کی مداخلت بھری جنگی فضا میں اور پھر وہی ہوتا ہے، جس کی توقع ہے۔ چاکر افواج کے ساتھ پہنچ جاتا ہے:

مڑگ ماں مولانی سرا وہاواں
درکفی روش ژہ تنگویں بُرجاں
دنزے ژہ میلھا کنو ردفا رُستہ
سرکشہ میریں چاکر ہ پو ژاں
گھورکشہ سیوی پڑیں رنداں
ژہ سرا میران و مریذ کاتکاں

ترجمہ:

پرندے کوہستانی چوٹیوں پہ سوئے ہوئے ہیں
سورج نکلتا ہے سونے کے برجوں پر
ایک گرد اٹھی دریائے میلھا کے دھانے سے
میر چاکر کی افواج پہنچ گئیں
سیوی کے رِند بیٹے امڈ پڑے
میران اور مریذ سب سے آگے ہیں

اور پھر نازک ترین مذاکرات شروع ہو جاتے ہیں۔ عزت و وقار مجروح کرنے کا جرم کتنا بڑا ہے، اس کا مداوا اور کفارہ کیا ہو؟۔ جرم، مستی بھرا جرم، اگر ہرجانہ میں جان لینا ممکن نہ ہو تو کوئی تو راستہ نکالنا ہوتا ہے زندہ معاشروں کو۔

مہلنج گوں مالاں تیر دیا ئیثیش
(محبوبہ پہ قرعہ اندازی کرائی گئی)

بیورغ، قرعہ والے مراثی سے:

تیر منی آڑ تئے تہ لیٹر وے بشکاں
اغ نیا ڑتئے تہ چھبوات بُراں

ترجمہ:

اگر قرعہ میرا لاؤ تو ایک اونٹ بخش دوں گا
اگر نہ لائے تو تمہارا پنجہ کاٹ ڈالوں گا

اور، قرعہ کب کمزور و غلام کا نکلتا ہے۔ قرعہ ہی تو زور آور کو اصلی، اور ایک نمبر بلوچ بناتا ہے۔ قرعہ تو ایک جواز ہے۔ جت اور ڈومب اور مریٹہ کو دوسرے درجے کا شہری قرار دیے رہنے کا۔ چنانچہ یہاں بھی:

ہئے او ہے آں کہ تیر منی آتکہ
لعل صذ وژہ جوریں دژمناں زیشہ

ترجمہ:

ہئے او ہے کہ قرعہ میرا نکلا
اُس نے لعل صذو کو زہریلے دشمنوں سے چھین لیا

اور یوں صذو اُس کی ہوگئی۔ پہلے چاکر ایک شہ مرید کو وطن بدر کر چکا تھا۔ حسین عورت اللہ کرے کمزور انسان کی بیوی، بیٹی نہ ہو۔ بُزکشی ہوتی ہے اُس پہ۔ بہرحال اب صذو، بیورغ کی بن چکی تھی۔ چاکر نے:

پہ جنئے شلوارا بلوچی آ
چاکر اچتریں لیٹروے داشہ

ترجمہ:

خاتون کے بلوچی دوپٹے کے بطور
چاکر نے ایک نوجوان اونٹ دے دیا

****

مشکاف والی محبوبہ

بہادر بیورغ کی ایک محبوبہ تھی مشکلاف کے علاقے میں۔ ہم نے اس خاتون کا نام تلاش کرنے کی بہت کوششیں کیں مگر شاعری میں اس کا نام نہ ملا۔ بس رومانی کہانی پوری کی پوری مل گئی۔

موسم ہے گرمیوں کا، ہم بات کر رہے ہیں سبی وڈھاڈر کے علاقے کی۔ جس کے بارے میں عام بات ہے کہ خدا نے جب سبی وڈھاڈر بنا لیے تو پھر دوزخ بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اس جہنمی گرمی میں مشکاف علاقے کی اُس کی محبوبہ نے بیورغ کو پیغام بھیجا کہ ملن کو آؤ، ضرور، اور آج ہی۔

لوڑی وھش گشیں چرّ اناں
پیغام آڑ تغنت دیر نیاذئے

بیایئے گوں شفئے شف کیڑا
بیا کہ سر منی شرڑطانیں

ترجمہ:

خوش آواز مراثی گھومتے گھامتے آیا
وہ دور نشیں کا پیغام لایا
آ جاؤ رات شب خون کی طرح امشب آ جاؤ
آ جاؤ کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں

اب بھلا بیورغ رکے گا؟۔ اُس کے پاس اُس وقت کوئی اور سواری موجود نہیں تھی تو وہ اپنے چھ ماہ کے بہان (گھوڑی کے بچے) پر زین ڈالتا ہے:

شش ماہی بہاں سینگھارتَیں
تنگے چلکشیں ملگور ئے
پُشتائے ملو کی نشتاں
چاکر سورِثیں سگھانی
مَلا آسنیں پاذاں دئے
مُرگی بانزراں زریناں
پہنا ذی کشیں حلقاں را
مِسکانی سحاقئے ترنڈا

ترجمہ:

ہم نے شش ماہ کے اسپ بچے کو سنگھار کیا
اس پر زین کس کے رکھا
اُس کے اوپر نزاکت سے سوار ہوا
میں نے کرامتوں بھرے چاکر کا نام لیا

(کہ اے چاکر!) اِسے آہنی پَیر عطا کر
اسے پرندوں جیسے زریں پر عطا کر
میں گھروں سے پرے ہو کر چلا
مُشک عطر والے سحاق کے ڈیرے سے دور

بیورغ ملاہ پہاڑ سے روانہ ہوا۔ وہ اُسی اسپ بچہ پر شوران وسنی کے علاقے آ گیا۔ راستے میں سحاق رند کا گھر آتا تھا۔

مسکانی سحاق پاذا تکہ
گوانکوئے کثو گڑ دیں تئ
''تئ بوراچے کارے کپتہ؟
تہ شش ماہی بہاں زین داشہ!!''

ترجمہ:

مُشک والا سحاق جاگ گیا
پکار کر مجھے بلا لیا
''تمہاری تیز رفتار گھوڑی کہاں ہے
کہ تم نے چھ ماہ کے اسپ بچے پر زین ڈالا''

واقعی یہ تھی بھی تشویش کی بات۔ مالدار و دولت مند بیورغ کسی ہنگامی حالت کے تحت ہی جو سواری سامنے آئی لے کر نکلا ہوگا۔ اس لیے مضطرب ہونا تو قدرتی بات تھی۔ سوال کے جواب میں بیورغ کیا بہانہ بناتا۔ عاشق، عاشق کا ہمراز ہوتا ہے۔ لہٰذا تکلف کیسا؟۔ چنانچہ:

داشہ ما سحاقا ولدی اے
''کہ پیغام آتکغاں دیر نیاذ ئے
بیا یئے گوں شفئے شف کیڑا

ترجمہ:

میں نے سحاق کو جواب دیا
میری دور نشیں کا پیغام آیا
شب خون کی طرح اِمشب ہی چلے آوٗ

اسحاق نے بیورغ کو اسپ بچہ کی سواری سے منع کیا، کہ شریف آدمی! سبی کی گرمی میں یہ نازک بچہ کہاں اتنی مسافت طے کر سکتا ہے؟۔ کہیں گر کر مر جائے گا اور تمہیں بھی پیاسا مار دے گا۔ لہٰذ میری مہری لے جاوٗ:

مِسکانی سحاق گال آتکہ
سیوی دیرین و روش گرمیں
پٹا تہ روئے تنّی بےئ
تئ بورا رہ لوار مانہ کیئے
داماں کپتغاں کورانی
کارئیں بارغیں بورانی
بوشت و برمنی کڑزیا
تئ بورماں منہے لبستی بی

ترجمہ:

مُشک بار سحاق بولا
سبی دُور، اور دن ہیں گرم
صحرا میں تمہیں پیاس لگ جائے گی
تمہاری سواری کو لُو لگ جائے گی
طویل ہے ندی نالوں والا صحرا
یہ، نازک گھوڑوں کے بس کی بات نہیں
رک جاوٗ اور کڑزی نامی میری مہری لے جاوٗ

تمہاری گھوڑی یہاں سائے میں بندھی رہے گی

ظاہر ہے جب جوان نے جوان کو اپنے دل کا راز بتلایا تو پھر اُس کا قابلِ قبول مشورہ بھی ماننا پڑے گا اور اُس کی امداد کی پیشکش بھی قبول کرنا ہوگی۔ عاشق، عاشقوں کے کام آتے ہیں بھئی!! خصوصاً عشق کے معاملات میں، وصال کے مواقع پر۔

چنانچہ:

مانِشتوں گوریغیں گُلے آ
جتاں موندرے ششتا شئ
ماں پُشتا پاکھڑو جوڑیں تئ
ہژ گرڈیں مہار چڑیں تئ
ہندے جوڑ شئ سڑداری

ترجمہ:

ہم ایک سجے ہوئے خیمے میں بیٹھ گئے
اس نے موندر نامی جت کو بھیجا
اُس نے اونٹ پہ پاکڑہ باندھ لیا
ہشت رنگی مہار لگا دیا
سرداری جیسی جگہ بنالی

پُشتا ملوکی نشتغاں
واغے گپتغاں کرّزی ئے
دیریں منزلاں بھیڑاناں
مہری مَل پڈاں ڈُنگ باناں
مشکافہ دفا گوازیناں

گنجیں بیلو و نُوروااہاں
جتانی مقیمی جاہاں

ترجمہ:

میں اُس پہ مہذب انداز میں بیٹھ گیا
میں نے کرّزی کی باگیں سنبھالیں
دور دراز کی منزلیں پھلانگتا ہوا
مہری بارش کے بعد والی زمین پہ خمدار ہوتے ہوئے
مشکاف کے علاقے سے گزرتا ہوں
سرسبز بیلو اور نورواہ ہوتے ہوئے
جتّوں کے مقیمی علاقے تک آیا

یہاں تو ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ شتربان (جت) بہت رنگین طبع لوگ ہوتے ہیں۔ اُن کی غربت اور سادہ زندگی میں ہمہ وقت طرب و انبساط کی خوشبو موجود ہوتی ہے۔ منظر نامہ دیکھیے:

عیسٰے ئے نڑ ئے پُو کائیں
کاڈاں گھمر و نازینکیں
شامانی سری پہر گوئستہ
من جتاں طاہر ے لوٹاشہ
کہ جوگی ئیں ہما لوغانی
دوست مئے لُڈغانی مانیں
جتاں طاہر ے دیم داثیں
دوست مئے لُڈغانی آڑتئ

ترجمہ:

وہاں عیسٰی کے نڑ کی لَے ہے

حسینائیں گا رہی تھیں، رقص کررہی تھیں

شام کا پہلا پہر گزرا

میں نے طاہر نامی جت کو بلوالیا

جواُن گھروں کا بھیدی ہے

جن میں حسیں چال والی میری محبوبہ رہتی ہے

میں نے اس طاہر کو بھیجا

اور وہ میری محبوبہ کو لے آیا

دو پیاسی ارواح رکھنے والے محبوبوں کے وصال کے مناظر کا تصور تو وہی کرسکتا ہے جو اِس شاہراہ کا راہی رہا ہو...........قرنوں کی چاہتوں کی بغلگیری، ہجرو وصال کی سرحد کے آنسو، ہچکیاں..........مگر یہاں تو ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔محبوبہ نہ بیورغ کوخوش آمدید کہتی ہے، نہ اُس سے فراق کے جہنمی زمانے کے دکھوں پہ آنسو بہاتی ہے اور نہ اِس ملن پہ عیدِ سعید کا کوئی اظہار یا حرکت کرتی ہے۔ وہ تو ایک اور حسین ،اور آرٹسٹک کام کرتی ہے۔ وہ بیورغ کے بجائے سحاق کے اونٹ کے پاس جاتی ہے،اوراُس سے گویا ہوتی ہے:

بیا یاشئے تہ سحاقہ مہری

کہ بیورغ و مناں پُجینتے

بیورغیں مئے جامیں یار

ترجمہ:

سحاق کی مہری خوش آمدید

کہ تم نے بیورغ کو مجھ تک پہنچایا

بیورغ تو میرا جام محبوب ہے

یہ لفظ ''جام'' بلوچی کلاسیکل ادب میں دوتین بار ہی استعمال ہوا ہے مگر جس بھرپور انداز میں یہ لفظ کہا گیا اس کا ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ایک جوانمرد بلوچ میں جو جوصفات ہونی چاہئیں اور محبوب کی

محبت میں جتنی گہرائی وگیرائی ممکن ہے،اُن سب کا اظہار، یہ ایک لفظ کرتا ہے۔ بہرحال اِس کے معانی کسی ہم سے زیادہ دل جلے سے پوچھ لینا۔ ہم بیورغ اور محبوبہ کے وصل کی بات جاری رکھتے ہیں:

سہ پاسا ہموذا بیثغاں

گڈّہ مس موکل لوٹثہ

موکلّہ نویث خوشی ئے

ترجمہ:

میں نے رات کے تین پہر وہاں گزارے

پھر میں نے رخصت چاہی

اجازت خوشی سے نہیں ملتی

اب ہم اِس میں اپنا تصوراتی گھوڑا کیا دوڑائیں؟ محبوب سے جدا ہوتے وقت دو دلوں کا منظر نامہ کیا ہوگا ؟۔بھئی خواہشات کے زخموں کا دوبارہ پھوٹ پڑنا،اگلی زندگی کا ہرلمحہ فراق کے دوزخی لمحوں میں بدل جانے کا احساس ، ایک لطیف جھونکے کا غیر معینہ وقت تک لیے خاتمہ...........ہوک اُٹھتی ہے دل میں۔

میں آپ کو دل ڈوب جانے کی اِس کیفیت سے نکالتا ہوں اور فوری موڑ کھاتے ہوئے اگلا منظر پیش کرتا ہوں:

باما رنگشو رُگھائیں

میل ئے جنتراں ہُگائیں

انڈی اے جثوں زونگارا

پاذا ، اوسحاقہ مہری

ترا سُہراں ساکثہ لعل ایغاں

میشان و بُزاں دوستئے غاں

واغے گپتغاں کڑزی ئے

دیریں مزلاں جھمباناں

مہری مل پڈاں ڈنگ باناں
گوئلی مناں پچینتئی
گوئر مسکانی سحاقہ ترنڈا

ترجمہ:

صبح صادق ہو چکی ہوتی ہے
چکی پیسنے کی صداؤں سے بستی گونج رہی ہوتی ہے
میں نے مہری کو ایڑھ لگائی
اٹھ جاے سحاق کی مہری
تمہیں لال جیسی محبوبہ کی سرخی نے سایہ کیے رکھا
محبوبہ کی بھیڑوں بکریوں نے
میں نے کڑزی کی مہار سنبھال لی
دور دراز مسافتیں طے کرنے لگا
مہری بارش کے بعد والے راستے پر خمدار ہوتی رہی
دن اچھا خاصا چڑھا تو اس نے مجھے پہنچا دیا
مُشک کے مالک سحاق کی بستی میں

اِدھر نطق و بیان کا مالک، اور سماج و سماجیات کا ترجمان بلوچی کلاسیک، اچانک ایک خوب صورت موڑ دے جاتا ہے پوری کہانی میں۔ آپ عش عش کر اٹھیں گے:

رانڈھی ڈائڑیں چڑّاناں
مسکانی سحاقہ ژہ پُڑسی
تئی مہری بانہڑاں لنگہ کنت
پیلی سنٹ گوں جھگانیں
ہڑگڑدیں مہار نمبینیں!
کوہے جھاگتی مارانی

پہ شارٓی و شلٓی ئے نیاذاں!

ترجمہ:

ڈائن جیسی بڑھیا گھومتی پھرتی آئی
مُشک بار سحاق سے پوچھتی ہے
تمہاری مہری لنگڑا رہی ہے
اس کے چارے کے بچے ہوئے حصے پر جھاگ پڑا ہوا ہے
اس کی ہشت رنگی مہار گیلی ہے
اس نے تو کوہِ مارانی کا سفر کیا ہے
شارٓی اور شلٓی کے وصل کے لیے!!

ہائے رقابت، ہائے شک۔ ہائے تبصرہ، ہائے بے دردی۔ اور یہ شک جائز بھی تھا کہ اُس زمانے میں ہر نوجوان کی ایک سے زیادہ محبوبائیں ہوا کرتی تھیں۔ البتہ یہاں معاملہ اور تھا۔ یہاں تو دو عاشق نوجوانوں کے بیچ امدادِ باہمی کا نازک عمل ہو گیا تھا۔ سحاق نے نہ صرف اپنی صفائی پیش کی بلکہ سچ بات بھی اُسے بتا دی، بس ذرا سا گھما پھرا کے۔ جاگیرداری معاشروں میں عشق کے قصے کبھی مکمل اور بغیر ترمیم کے نہیں ہوتے۔ حجاب کے موڑ مڑنے پڑتے ہیں، اقدار کی پاسداری میں بہت سے ٹکڑے حذف کرنے پڑتے ہیں، رواج کئی لعاب آور حرکات پہ خامشی کی تاریکی مسلط کرتا ہے۔ اس لیے سوچیے بھی مت کہ عشق و عاشقی کے رازوں کے بارے میں سچ ممکن ہے۔ ارے نا ممکن تھا، ناممکن ہے، اور ناممکن رہے گا۔

مِسکانی سحاق گالا تکہ
اژما ژہ بڑتہ بیورغا
اژمائے بڑتئ بے پولا
پہ رولیں ہُشتر ئے دیمیڈا
پیری او بُڑتوئیں آڑتئ

ترجمہ:

مُشک بارسحاق جواب دیتا ہے
مجھ سے یہ بیورغ لے گیا
وہ مجھ سے بغیر اجازت لے گیا
ایک گم شدہ اونٹ ڈھونڈنے
وہ اسے پرسوں لے گیا آج لے آیا

مگر، ذرا سوچیے کہ وہ جہاں دیدہ بڑھیا بے تجربہ تو نہ تھی۔ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچی مگر وہ ایک ایسی زبردست بات کہہ گئی جو ایک ضرب المثل بننے کے قابل ہے۔ پتہ نہیں کیوں اب تک دانشوروں کا خیال اس جانب نہ گیا۔ اقوالِ زریں کے باب میں شامل کیے جانے کے قابل، وہ فقرہ یوں ہے: ''حکمران اگر اپنے گم شدہ اونٹ کی تلاش میں ہی سرگرداں رہے تو عوام الناس کا، حکمرانی کا، گورننس کا کیا بنے گا؟''۔

بولی:

نی گڑہ پالئی سڑداری
کہ رولیں ہُشترانہ پولی

ترجمہ:

اب بھلا وہ شخص کیا سرداری چلا سکے گا
جو گم شدہ اُشتریں ڈھونڈتا پھرتا ہے

****

مھرئے موتک

کلاسیکل شاعری میں صدّو نام کی بیورغ کی ایک اور محبوبہ کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ وہ اِس کی اچانک بیماری اور موت کی خبر سنتا ہے، اُسی اسحاق سے جس نے اس کی ایک اور عشقیہ داستان میں اُس کی نحیف و کمسن سواری (اسپ بچہ) پر اعتراض کر کے اُسے اپنی مہری دی تھی:

زی منے کا تکاں پہ وثی راہے
پہ شکارانی ہو شیشغیں راہے
نیں کہ مں دیریں الکھے کا تکاں
تریٹئوں مسکانی سحاق سیادیں
مں پلتری گوں بوچنڑا بستہ
جام سحا قاگوں رپٹغے رندی
مادلیے درد گوں پوپلے پروشتہ
شینہڑا گورکائی سرے چڑتہ
ماحیر حوال داشہ حیر حوال گپتہ
حال مڑپیشی جام سحاق بیثہ
حال پہ مارواڑتیں دلاداثئ
دوہمی تئ میٹرو سر جما دراہیں
کپتغو خواریں تئ صذو ماہیں
بچی دورو خاں لعل صذو دراہ نیں
دڑد ماں لوغاڑیں سرا کپتئ

ترجمہ:

کل میں اپنی راہ چل رہا تھا
شکار کی راہ پر
جب میں کافی دور آیا
تو معطر سحاق سے مدبھیڑ ہوئی
میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا
اور سحاق بھی

ہم نے دل کا درد ایک خشک میوے کے مغز کو چبا کر توڑ دیا
اور میری گھوڑی گور کا نامی گھاس چرنے لگی
ہم نے بلوچی حال حوال کیا
حال پہلے سحاق نے دیا
اس نے ''سانپ کاٹے دل'' سے حال دیا
اور تو تمہارا سارا اڑوس پڑوس ٹھیک ہے
مگر تمہاری ماہ رنگ صذو سخت بیمار ہے
در دِزہ میں بیمار ہے
اس کے گھنے بالوں والے سر میں درد ابھرا

حیران کن متاثر کرنے کے بیانیے میں کلاسیک ہمیں بتاتا ہے کہ اِس خبر سے بیورغ پہ کیا گزری؟:

ما دعا کش گوں ستکغیں زڑدا
تہ میا تکین و مامہ تریٹا ثوں

ترجمہ:

میں نے جلی ہوئی روح سے دُہائی دی
کاش تم نہ آتے، کاش ہم نہ ملتے

جی، نزاکت و لطافت کی آخری سرحدوں کو چھوتی ہے بلوچی قدیم شاعری۔'' کاش تم نہ آتے، کاش ہم نہ ملتے!''۔ میرا دل کرتا ہے کہ انہی دو مصرعوں کو کلائمکس بنا کر قصہ ختم کردوں۔ مگر قصہ ختم کرنا ہمارے بس میں تھوڑا ہوتا ہے۔ آگے بڑھتے ہیں، اس ضمانت کے ساتھ کہ علم و ادب کی کئی لطیف ترین ٹکڑیاں ابھی ہماری منتظر ہوں گی۔ بیورغ اس خبر پر:

آس داں چوٹیا کڑو بیثہ
جاں ثہ نرماثیں گذاں تپتہ

ڈھڈروں آف بیثہ جغر سیاہیں
گورما سے گیست گوخ پیراہی
میگڑہ سُرگوشیں گرانڈ شاہی
میگڑگوں یک لٹاکشیں پیری
مل گوں موچی دوتکغیں سنجاں
زہم گوں دلی رتکغیں بنداں
کاڑچ و کاٹار (گوں) حراسانہ پچتاں
مولدے آزادہ کناں چھلی
دوستا دراہی سرجما گنداں
ہنگ اژگرانیں دوروخاں درست با

ترجمہ:

مجھے سر تا پیر جیسے آگ لگی ہو
میرا سینہ اور سیاہ جگر پگھل پگھل گئے
میں نے اپنے گائیوں کے رم سے ساٹھ گائیاں پیر کے نام ذبح کرنے کی منت مانی
بھیڑوں کے ریوڑ سے سرخ کانوں والے مینڈھے
ایک ہی لمحے میں سارا ریوڑ پیر کے نام کر دیا
اپنی سیاہ گھوڑی مع اُس کے موچی دوزیدہ سارے سجنوں کے
اپنی تلوار مع اس کے دلّی میں چمڑہ سازی شدہ بیلٹوں کے ساتھ
کارچ اور کٹار مع اُن کے خراسانی میانوں کے
میں اپنی ایک لونڈی آزاد کردوں گا
اگر میری محبوبہ تندرست ہوجائے
میری خوشبو اس سخت بیماری سے ٹھیک ہوجائے

دل پھر بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ بے چینی، اور بے انت غم چولیں مار مار کر اُس کے وابستگی بھرے

دل سے ٹکراتے رہے۔تب:

سیاہ گوں چابکاں تلور داثوں
اژ کُرڑی آنش سو تلغاں پہناذ
سیاہ وثی اولی جزغاں گیر آر
یہ شفی شف گیروں برئے اوذا
لعل صذوئی ئے گورغیں کُلا

ترجمہ:

میں نے اپنی سیاہ (گھوڑی کا نام) پہ چابک برسائے
اُس پہ ایڑ لگا کر میرے پیروں کے پہلو جل گئے
اے میری سیاہ اپنی سابقہ تیز رفتاریاں یاد کر
راتوں رات مجھے محبوبہ کے گھر پہنچا
وہاں لعل صذو کے خوبصورت آشیانے پہ

اور گھوڑی کب وفادار نہ رہی۔ وہ گھوڑی بھی کیا گھوڑی ہوگی جو اپنے مالک کے احساسات نہ سمجھ سکے۔ مالک کی درخواستیں، اُس کی ڈانٹ ڈپٹ، اس کے ایڑ اور چابکیں............ سیاہ کے بس میں اور کیا تھا سوائے اُسے بروقت منزل پہ پہنچانے کے۔اور وہ فریضہ اس کی گھوڑی بہت ہی احسن انداز میں بجالائی۔مگر یہاں تو منظر نامہ ہی اور ہے:

نیں کہ گوئر کُلانی گرہ کاتکاں
آتکئو لوغانی پذا نشتاں
دیر نویشہ کہ ہوہوئے رُستہ
ہنگ پہ لوغانی پذا کشتیش
لعل صذو پنچ شوذاں رواں بیشہ
مچ انتاں جتانی جنک لعلیں

سیاہ موربندیں چوٹو ژنگیں
ہس ژہ کونجی گرڑد نا کشتیش
تنگویں پلوہ ژہ شیفغیں پونزا
گوش بنی پا ریز تغیں گرددر
اژ دراژیں موڑداناں اوو مندری
گرے ای ثاں ماث وگرے ایثاں وسی
گرے ایثاں مڑدگوں ڈائنڑیں ریشاں

ترجمہ:

میں جب خیموں کے پاس پہنچا
میں آبادی کے پچھواڑے بیٹھ گیا
جلد ہی وہاں سے آہ وزاری ابھری
حسینہ کو گھر سے باہر لائے
لعل صذو آخری رسومات کے لیے روانہ ہوئی
جتوں کی لعل لڑکیاں جمع ہیں
اس کی سیاہ گُندھی زلفیں اَن گندھی نیچے لٹک رہی ہیں
اس کی کونج جیسی لمبی گردن سے حس نامی زیور اتار دیا گیا
سلائی جیسی ستواں ناک سے سونے کی پلوہ
خوب دیکھ بھال کیے گئے کان کے بندے
مخروطی انگلیوں سے مندریاں
روتی ہے ماں، روتی ہے ساس
روتا ہے خاوند اپنی چھدری بدصورت داڑھی کے ساتھ

میں اب آپ کی روانی کو اِس طرف مبذول کر کے کیوں توڑوں کہ غم کی اِس اوقیانوسی

گہرائی میں پھڑ پھڑاتا عاشق یہاں بھی اپنے رقیب (محبوبہ کے خاوند) کی چھدری بدصورت داڑھی کو بیان کرنا نہ بھولا۔آگے چلیں۔

شاعر محبوبہ کے اِن عزیزوں رشتہ داروں کے رونے کا تذکرہ کرتے کرتے کلائمیکس یوں کرتا ہے:

مادِہ چوگنگدامیں جڑاں گوئرتہ
دیم پہناذی ژہ دژمنیں مڑداں
تروُنگلی ایر رتکہ او وریشاں
ماں بروتان و سمبلیں ریشاں

ترجمہ:

ہم بھی گُنگ بادلوں کی طرح برسے
اپنے دشمنوں سے چہرہ چھپاتے ہوئے
آنسو میری مونچھوں اور داڑھی پر ژالوں کی طرح گرتے رہے
مونچھوں پر اور سُمبل بو داڑھی پہ

(آہ! مگر ایک بار پھر آپ کے ٹرانس کو اس موازنے سے توڑ رہا ہوں جہاں وہ رقیب کی داڑھی کو 'ڈائنڑ نما داڑھی' اور اپنی داڑھی کو 'سُمبل بوُ داڑھی' کہتا ہے۔ میں عاشق کے چھپ کر رونے کو گنگ بادلوں کے برسنے سے مشابہت سے بہت محظوظ ہوا ہوں)۔

سو، فیونرل، آخری رسومات:

دوست منی لاڈاں گوں رواں بیثہ
مادِہ چو لاڈانی بھرا تروں

ترجمہ:

میری محبوبہ آخری آرام گاہ رواں ہوگئی
میں دُور سے پیچھے پیچھے چلتا رہا

اور پھر؛

پلّٹثو دل مس گڑتغاں شوذاں

ترجمہ:

(میں) اپنے دل کو منتیں کر کے وہاں سے واپس پلٹا!

****

بیورغ و گراں ناز Beevragh O Granaz

بیورغ و گراناز کی داستانِ مہر بلوچی ادب و ثقافت کی حسین ترین داستانوں میں سے ایک ہے۔ یہ داستان آج تک نہ تو سیاسی مصلحتوں کے تحت دبائی جا سکی، نہ نام نہاد میدانی علاقوں کے فیوڈل کلچر کی 'پاکیزگی' کی ملیچھ چھینٹیں اسے گہنا سکیں اور نہ ہی نئی نسل کے اپنی تہذیب و ثقافت سے ناآشنائی اِسے دلوں سے دُھلا سکی۔

پندرہویں صدی کے اواخر اور سولہویں صدی کی پہلی دہائی میں ہرات کے ترک مرزا حسین کی بادشاہت تھی۔ قندھار میں اُس کا والی (گورنر) تھا شجاع الدین ذوالنون بیگ۔ گراناز، قندھار کے اس ارغون کی صاحبزادی تھی اور بیورغ اُس کے باپ کی قید میں پڑا قیدی۔ یہ غالباً 1495 کا سال تھا۔

آیئے، میں وہ کچھ آپ سے شیئر کرتا ہوں جو کچھ میں نے اپنے والد سے اُس وقت سیکھا تھا، جب چاندنی راتوں میں وہ مجھے اپنے پہلو میں لٹا کے ترنم کے ساتھ گا گا کر سکھاتا تھا، سُلاتا تھا۔ ہمارے بچپن کی خواب آور لوریوں میں بلوچی کلاسیک ایک لازمی جزو کے بطور شامل رہتا تھا۔ میں نے بعد میں بچپن کے اُن زبانی یادکردہ کلاسیک کی تصدیق و درستگی کے لیے بختیار سومرانڑیں، محمد خان پیڑداذانڑیں، ماما محمد اکبر قلندرانڑیں، کریمو لانگھانڑیں اور وزیر خان عیسفانڑیں سے رجوع کیا تھا۔ میں نے ان بزرگوں کے سینوں میں موجود خزائن کو ریکارڈ کر کے لکھا، چھانا پھٹکا اور ڈیمز، سردار خان بلوچ، مٹھا خان مری اور بلوچ ا لوجی کے دیگر اساتذہ کی تحریروں، تحقیقوں سے استفادہ کیا۔

اس مہر یہ داستان میں بلوچ ثقافت کی جان ہے۔اس کا ہر ہر موڑ ہماری نفسیاتی ساخت کی سفارت کاری کرتا ہے۔اور میر عبدالرحمٰن غور کی یہ بات سو فیصد درست ہے کہ ''بیورغ و گراناز کی محبت پر مشتمل یہ طویل شیر کے اندر ڈرامہ کے رنگ اس قدر ظاہر ہیں کہ اسے بہت اچھی طرح سٹیج پر پیش کیا جاسکتا ہے''۔

آیئے، قندہار کی جیل میں پڑے بیورغ کے تعارفی اشعار والے اوپننگ سین سے شروع کرتے ہیں:

قندہار شہرے نئیں کڑاگا ہے
بادشاہانی ہندو جاگا ہے
کپتغاں میریں چاکر ہ شرّاں
سر منی کپتہ حاکمی کیزاں
بادشاہانی ذیل و زنزیراں
مں مغلانی بستغیں کوٹاں
بادشاہانی تاڑ و تیلا نکاں

ترجمہ:

قندہار شہر نہیں شیر کی کچھار ہے
یہ بادشاہوں کا دارالخلافہ ہے
میں میر چاکر کے کرتوتوں کا شکار ہو گیا
میرا سر حاکمی جیلوں میں پڑ گیا
بادشاہوں کی جیلیں، زنجیریں
ترکوں کی تعمیر کردہ جیل خانے میں
حکمرانوں کے دھکے اور جھڑکیاں ہیں

منظر نامہ آپ کے سامنے آ گیا۔پرائے شہر کی پرائی جیل میں بلوچ اشرافیہ کے اس معزز

فرد کی موجودگی سے پریشان نہ ہوں۔اُس کے ماموں میر چاکر کی کوئی نہ کوئی شرارت بہر حال موجود تھی بیورغ کے قید کرنے میں۔کہتے ہیں کہ اُس نے اپنے بھانجے بیورغ کی اصلاح، گوشمالی، یا پھر کسی قبائلی جنگ میں اُس کے قتل کیے جانے کے خدشے کے تحت قندہار کے گورنر سے اپنے قاصد کے بطور بھیجے ہوئے بیورغ کو جیل میں رکھنے کی فرمائش کی تھی۔بس اِس بات کا اضافہ میری طرف سے کہ شاہی محل اسی قید خانے سے متصل ہے، جس میں وہ شہزادی رہتی ہے۔شاہزادیاں ویسے ہی خوب صورت ہوتی ہیں مگر عشق سے منسوب شاہزادیاں تو پریوں سے بڑھ کر حسین و نازک و پُر ادا ہوتی ہیں۔اُس کے حسن کی توصیف کے لیے میرا قلم نہیں بیورغ کی آنکھیں نمائندہ اور مناسب رہیں گی۔قیدی کی نظر شاہزادی پر پڑتی ہے تو اُس کی تو روح قبض ہو جاتی ہے۔ہوش وحواس کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔وہ اس تجلّی کو یوں بیان کرتا ہے:

مں جنے سیا ہمار چوٹویں دیثہ
ہندے مں میری پتمی محل ایں
چومنیں مڑد پہ گندغا شاثاں
چورو او پیر یں مڑد دلیخی آں

ترجمہ:

میں نے سیاہ سانپ جیسی زلفوں والی لڑکی دیکھی
اُس کی رہائش گاہ امیر کی اوپری منزل پہ ہے
ایسی، جسے مجھ سے لوگ دیکھنے کی تمنا میں ہوتے ہیں
لڑکوں سے لے کر پیر مرد اُسے دیکھنے میں ناکام

غیر وطن کی اس قید میں پڑا ایک بلوچ کیا کرے گا۔نہ اخبار، نہ لائبریری، نہ حق نہ حقوق، اور نہ جیل مینوئیل۔ایک بے انت سیاہ یکسانیت۔عمیق ترین تنہائی۔وطن کی یادیں نوکیلے پتھروں کی طرح روح کو زخمی کرتی جاتی ہیں۔یہ قیدی رات کو ہجر کے گیت گاتا ہے:

مں دِہ پہ سیتانے جناں شیراں

ماں مغلانی بستغیں کوٹاں
(کہ) شف پرے دروخاں مہ یا یاشئے
روش پرے باندہ بستغیں مڑداں

ترجمہ:

میں رات کو بلند آواز میں گاتا ہوں
مغلوں کے جیل میں
(کہ) خدا کرے رات مریضوں کے لیے نہ آئے
اور دن قید میں بند مردوں کے لیے

یہ شعر باقاعدہ ایک ضرب المثل کے بطور آج تک استعمال ہوتا ہے۔ رات کی طوالت اجڑی روحوں، مہربان دلوں اور تخلیقی اذہان کو مہمیز دیتی جاتی ہے۔ بیورغ آہ و فریاد بھرے ہجر وجدائی کے نغمے گاتا ہے۔ پُرسوز گیت!!۔ فراق کی ایسی دلخراش خوش گلوئی میں وہ پڑوسی دوشیزہ بھلا کیا سو پائے گی۔ بیورغ اُس کیفیت کو جس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے، اُس کا ثانی مجھے آج تک نظر نہ آیا:

تلوساں تُرکیں جن شفی پاساں
نیم شفہ ظلمیں زارہاں بلاں
دفسغہ آرامہ نیئے کاڈاں
ریس بہ ریس بنت چو کمبریں ماراں
چو تفوڑی ایں مڑدمہ ناراں
دریہہ کشہ ماڑی ئے سرہ کاڈاں
پٹّیں سر بند گوں بڑزیں برواناں
نیم آزمانا ژہ گندغاں جہلا
گندنت مئے بالاذا ملوکی آ
کہ بیورغ ترا بالا ذے نصیو باشے

ترجمہ:

تڑپتی ہیں ترک عورتیں راتوں کو
آدھی راتوں میں درد بھرے گانے جو گاتا ہوں
دوشیزاؤں کو نیند نہیں آتی
وہ سانپ کی طرح بل کھاتی رہتی ہیں
بخار میں پڑے مریض کی طرح آہیں بھرتی ہیں
محل کی دوشیزائیں ہڑبڑا کر جاگ جاتی ہیں
سر پر باندھنے والی اپنی ریشمی پیٹیوں اور بلند ابروؤں کے ساتھ
وہ میرا خوبصورت قد کاٹھ دیکھی ہیں
(تو کہتی ہیں) بیورغ تمھیں اپنا حسن نصیب ہو

شہزادی اِس پُرسوز اور مقناطیسی کشش رکھنے والی خوش الحانی پہ مرمٹتی ہے۔ بھرپور جوانی اور بیورغ جیسی وجاہت میں لپٹی خوش الحانی سے تو انسانی وصف جاگ جاتے ہیں، اس سے تو محبت وجود میں آتی ہے...... چنانچہ کچھ اشاراتی مذاکرات ہوتے ہیں۔ مُشتاق آنکھوں کے سگنلز کو مخاطب آنکھیں ڈی کوڈ کرتی ہیں۔ اور جوابی سگنل رضامندی واثبات کے ہوتے ہیں۔ آنکھیں وعدے لیتی ہیں، آنکھیں وعدے کرتی ہیں۔ وعدوں کے ضامن دل بن جاتے ہیں........... دل جو پیر و مرشد ہیں، ولی و اولیا ہیں، سنت سادھو ہیں۔ اور بالآخر اس خوش گلوئی کی جگائی ہوئی محبت قیدی کے لیے سفارش بن جاتی ہے؛:

عرض کشہ رانیا گیا بینا
گوں وثی آریفیں پٹ و براثاں
اے چہ کسّے کہ ماں شوئے کیذیں
بوژ ہے باندیا بلوچیغا
نیم شفاں چوشیں زارہاں کلّی
مارہ ژہ وہاوئے شاذہاں کشّی

ترجمہ:

خوب صورت رانی نے درخواست کی
اپنے شفیق والد اور بھائیوں سے
یہ کون شخص ہے تمہاری قید میں
اس بلوچ قیدی کو رہا کر دو
یہ نیم شب کو ایسی فریادیں گاتا ہے
کہ ہمیں نیند کی شادمانیوں سے نکال دیتا ہے

دس ہزار وجوہات اور ارمانوں میں ملفوف یہ سفارش منظور، حکم جاری اور ہمارا قیدی

بیورغ:

گوں ہواں ماڑی بانکہ عرضا
چُٹّہ سرمئے حاکمی زیلاں

ترجمہ:

اُس محل مالکن کی درخواست پر
میری جان چھٹی حاکمی جیل سے

مگر یہ قیدی تو بیورغ ہے، عام آدمی نہیں ہے۔ سبی کے رہائشی امیر زادے نے قندھار میں ریشمی لہراتی زلفیں دیکھی تھیں۔ ایسی بے نظیر حسینہ دیکھی تھی۔ دل وہیں کہیں زلفوں میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ دل کے بنا انسان کیا ہے، بس ایک کھوکھلا ڈھانچہ۔ ذات کی تکمیل کے لیے، خود کے ٹکڑے اکٹھا کر کے سالم بیورغ بننے کے لیے اس کے لیے لازم ہو گیا تھا کہ وہ اپنا دل واپس حاصل کر لے، اُس زلفوں والی سمیت سالم بیورغ، آدھا بیورغ بنے کیسے سبی واپس جاتا؟۔ وہ بھلا اُس کو حاصل، یا پھر اپنا سر دیے بغیر واپس بلوچستان کیسے جاتا؟۔ لمبی زلفیں عہد اور قول کے مُہر لگ جانے سے بیورغ کا شان بن چکی تھیں۔ قول کون توڑ سکتا ہے، عہد شکنی کون کر سکتا ہے؟۔ اُس ماہ رُخ کے باندی دل کی آہیں کون اٹھا سکتا ہے۔ اپنی زبان محلات کی راہداریوں میں کون رہن رہنے دیتا ہے؟۔ ایک آزاد

روح کو قیدی بنا کر بیورغ نے اُسے محبت اور وصل نامی حتمی آزادی بھی تو دینی تھی۔ وفا تو تابِ زمانہ ہوتی ہے، ہمیشہ تازہ دم، ہمہ وقت سرسبز۔ 'وفا باسی نہیں ہوتی'۔ لہٰذا گراں ناز کا حصول زندگانی کے ایجنڈے کا اولین نکتہ بنا۔ وہ سیدھا شہر کے لوہار کے پاس جاتا ہے اور تین چار لوہے کی لمبی میخیں بنواتا ہے، کیسی میخیں؟......

روں گوئر لوہارا گھڑیا لینا
زیث کنو لوہار تہ سازکں مئیں میھاں
تر ندکنو دیلش گوں تیل و تیز آفاں
گوں تِلی آنی ٹوکغا بروآں
دورمہ خناں میں ریشمیں دستاں
سئے چیار شلّیں میھ گھڑا ئیثتا

ترجمہ:

جاتا ہوں مشہور ترین لوہار کے پاس
جلدی کرو لوہار مجھے میخیں بنا دو
انھیں تیل و تیزاب کے ذریعے تیز کر کے دو
تاکہ ہتھیلی کے دباؤ ہی سے دیوار میں گُھس جائیں
اور میرے ریشمی ہاتھوں کو تکلیف تک نہ ہو
میں نے تین چار لمبی میخیں بنوائیں

جب یہ کام تسلی بخش طور پر ہو گیا۔ نسبتاً آسان کام تو اُس کے بعد آگے کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ ایسا مرحلہ جس میں سر ہتھیلی پر رکھنا ہوتا ہے۔ مگر بیورغ سے تو اِس بات کی بھرپور توقع کی جاسکتی ہے:

جوڑ ثئو لوہارا مناں داثاں
مل ما ماڑی ئے بنا بستہ
کاسغے تیغ سُنڈیں جوئے داشہ

ورکدیما او خاطرا جم کاں

ترجمہ:

میخیں لوہار نے بنا کر دیں

گھوڑی میں نے محل کے نیچے باندھ لی

کھر درے جو کا ایک کاسہ اسے کھانے کو دیا

اناج کھاؤ اور خاطر جمع رکھو

اب آپ مٹی گارے کے بنے قلعے (محل) کے نیچے چڑھنے کی تیاری سے لے کر محل پہ کامیابی سے چڑھنے تک کے پورے عمل کو شاعری میں دیکھیے۔ سب سے پہلا مرحلہ محل پر چڑھنے کا ہے۔ بیورغ اس منظر نامے اور اس کے پس منظر میں موجود وہاں کی سیاسی ثقافتی زندگی اور اقدار کی تفصیل کو کس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے؛

چو کہ داماڑی ئے بنہ کاتکاں

گپتغاں پہر و آں اَملیغاں

دست اوں مں لاکیں کیسغاں شِفتہ

سئے چیار سُہریں اشرفی کشتہ

داثاں ما جا گو خاں املیغاں

ایش گوں زراں وش کثو اِشتہ

زیرنت و زران و جھل کناں پچماں

ترجمہ:

جونہی میں محل کے نیچے پہنچ گیا

مجھے پہرے داروں نے پکڑ لیا

میرا ہاتھ بھری ہوئی جیبوں میں چلا گیا

تین چار سونے کی اشرفیاں نکالیں

محبوبہ کے پہریداروں کو دے دیے

اُن کو پیسوں سے راضی کر لیا

وہ پیسے لیتے ہیں اور آنکھیں جھکا دیتے ہیں

ایسا خوب صورت ہے ہمارا کلاسیک۔ اور یہ شاعری آج تک زندہ ہی اس لیے ہے کہ اس میں بلا کی حقیقت پسندی کے ساتھ ایسی آفاقیت ہے کہ عالمگیر حقائق کئی صدیوں تک اُسی طرح ثابت و سالم ہیں۔ کلاسیک ہر دور میں موجود حقیقتوں کا بیانیہ ہے۔ وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ہمارا سماج ابھی تک پیداواری رشتوں کے اعتبار سے وہیں فیوڈل ازم میں جی رہا ہے۔ اور اس بیانیہ میں بلا کی رنگینی اور تنوع ہے۔ یہ استعاروں کے جگمگاتے ستاروں بھری شاعری ہے۔ سادہ، زود ہضم اور دل کو لگنے والی شاعری۔ بس ذرا استعجاب کے ساتھ غور کریں کہ پندرہویں سولہویں صدی میں رشوت!!۔

بیورغ ایک ایک بڑی میخ دیوار پر ٹھونکتا ہوا اوپر چڑھتا جاتا ہے۔ آپ اِس شف کیٹر (شب خون مارنے) کی ہم آہنگ حرکات کو موسیقی بھری شاعری میں دیکھیے:

ما چمبھڑاناں پئے آسنیں میھاں

در کفاناں پئے محل و پوَڑیاں

ریز گراناں چوکمبریں ماراں

وَل گرا ناں چوپاشنی شاہاں

پیچ گراناں چوزامری تنداں

ترجمہ:

میں لوہے کی اِن میخوں سے چمٹ چمٹ کر

محل کے اوپر چڑھتا گیا

چتکبرے سانپ کی طرح لہراتا ہوا

بکرے کے سینگوں کی طرح بل کھاتا ہوا

زامر نامی بیل کی طرح پیچ کھاتا ہوا

یار اس میں سسپنس ہونا بھی تو ضروری ہے۔ یک رنگی تو یکسانیت پیدا کرتی ہے۔ ''اچانک''

سے واسطہ تو پڑنا ہے ہمارا۔ چنانچہ:

نِیں کہ مس ماڑی نیام گورہ کا تکاں
سرمنی تنکیں گواث گراں گپتہ
جاں منی شیہی لڑزغاں بتکہ
ہکّلے داشہ ما خیالاں را
گند نواں چنڈئے دل مڑایانی
گوں لڑزغہ بالا ذہ برائینئے

ترجمہ:

اور جس وقت میں محل کے درمیان تک پہنچا
میرے سر کو تیز ہوا کے بگولوں نے آن لیا
میرے جسم پر ناچتے عامل کی طرح لرزہ طاری ہو گیا
میں نے خیالات کو ڈانٹ پلائی
خبردار میرے بہادر سر، چکرانا نہیں
لرز جانے سے تم بازی ہار جاؤ گے

جی، جدوجہد میں غلطان وغرقان روحوں کے لیے پند اور راہنمائی۔ بھئی، دل ودماغ کو بولو کہ کانپیں نہ۔ کہ گوں لڑزغہ بالا ذہ برائینئے۔ دلجم ومحکم، مصمم وپیہم۔ منزل محبوبہ کانپتے لرزتے دلوں کی قسمت میں نہیں ہوتے۔ لحہ بہ لحہ ایمان سنبھالتے ہوئے، دل و دماغ کو بھرپور انداز میں شامل کرتے ہوئے، نگاہیں منزل پہ ٹکاتے ہوئے، پاؤں اُسی جانب بڑھاتے ہوئے چلنا ہے، چلتے رہنا ہے۔

خود کو دلاسے تسلیاں دے دے کر، خود کو جھڑکیاں دے دے کر بیورغ بالآخر محل کی اوپری منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ میرے قلم میں طاقت ہوتی تو آگے کے منظر نامے کو بیان کر کے بلوچ کلاسیک کا حق ادا کرتا۔ مگر نہیں، میں ایمان کو حاضر ناظر جان کر اعلان کرتا ہوں کہ میں بیورغ سے زیادہ اثر دار تحریر نہیں لکھ سکتا۔ بیورغ سے بڑا ڈرامہ نگار بلوچی زبان میں آج تک پیدا نہ ہوا۔ اُس

شخص کا کمال یہ ہے کہ وہ آپ کو ڈرامے کے ہر سین میں اپنے ساتھ ساتھ رکھتا ہے۔ جیسے آپ خود وہ منظر دیکھ رہے ہوں۔ کیا صورت گری ہے، کیا منظر نگاری ہے۔ میں تو اس ڈرامہ نگار کا محض مترجم (اور یہ کوئی چھوٹا مقام تو نہیں!) بن سکتا ہوں:

چوکہ دَماڑی ئے سرہ کا تکاں
گوں منی پاذ درفشا مزاریا
تراس کشہ زنزیرے مہ پریں دوستا
کٹ اشتئی گوں بخملیں بھوفا
دِیرہ لڑزی مس یک گذے توخا
دیرہ لڑزیث واژمناں پڑُسی
''تہ چہ کسے ئیئے داں مناں کا تکئے
یا مال دھنڑارے ئے یابزگری اے ئیئے
یاشماں بوروخیں گنوخائے
او بنگلیں ورنا میر بلوچانی
چکّشو تقدیرا ترا آڑتہ
مئیں سرا چوکی چیار پڑُہ چرّاں
گندنواں گہہ گیریں سرا گڈاں
مس براں بازارہ دفاٹنگاں
بانگھاں دوست و دژمنے گنداں

ترجمہ:

جب میں محل کی اوپری منزل پر پہنچا
میرے شیر جیسے قدموں کی تھراہٹ سے
وہ زنجیر زلف محبوبہ بدک گئی
اس نے مخملیں بستر والی چارپائی چھوڑ دی
ایک چادر میں دور کھڑی کانپتی ہے

دور لرزتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے

”تم کون ہو مجھ تک آنے والے

یا تو چرواہے ہو یا کسان ہو

یا پھر منمناتے بڑبڑاتے پاگلوں میں سے ہو

اے لاابالی بلوچ نوجوان

تمہاری تمہیں تقدیر کھینچ کر یہاں لائی ہے

مجھ پہ چوکیدار چارتہوں میں پھرتے ہیں

دیکھنا وہ تمہارا ضدی سر اڑا دیں گے

اور لے جا کر چوک پر لٹکا دیں گے

تا کہ کل صبح دوست دشمن دیکھ لیں

میں نے مندرجہ بالا اشعار پڑھ کر کئی بار اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور تصور میں بانکے بیورغ کو ”خترپ“ کی آواز کے ساتھ گراں ناز کے بیڈروم میں ”جمپ اِن“ ہوتے دیکھا۔ میں نے ردعمل میں ایک پری روح کو محض ایک چادر میں گھبرا کر پیچھے ہٹتے دیکھا۔ دوشیزہ اچانک ایک غیر مرد کو اپنے بیڈروم میں دیکھتی ہے تو غصے، تحیر اور گھبراہٹ میں کانپ جاتی ہے۔ ایسا لمحہ جو بیورغ کا نام آتے ہی میرے ذہن میں کوند جاتا ہے، میں مستغرق ہو جاتا ہوں۔ میں باریک مشاہدہ اور باریک بیانی کے قربان جاتا ہوں۔

وکیل و بلیغ اور کلام کا ماہر بیورغ اُس شہزادی کو اُس کے سوالات کا تفصیلی جواب دیتا ہے۔ وہ اُسے اپنے بارے میں بتاتا ہے، اپنے علاقے کے بارے میں بتاتا ہے:

نئیں دھڑارے آں نئیں بزگری اے آں

نیں کہ مس بوروخیں گنوخے آں

مس نیاں شاں ٹیکاں شنذی ایناں

کاڑچہ کشنت و گڈ دینت بیشاں

ہامغہ میثی دمغاں لوڑھاں

مس کوٹغے سیوی ئے طلو گاراں

مس ہماں بیورغاں کلامانی

کہ باہرہ تنگہ دروشمیں بچاں

کہ قول تراماڑی ئے بنا داثوں

مس وثی قولیے موکغہ کاتکاں

آں مزں چیڑیں رند مناں سُجاں

چاکر و ایرانی نریاں زنڈیں

کئے منی گہہ گیریں سرہ گڈی

باڑت مس بازارہ دفہ ٹنگی

ترجمہ:

نہ میں چرواہا ہوں اور نہ کسان ہوں

نہ میں منمناتا ہوا پاگل ہوں

میں اُن بھوکوں ننگوں سے نہیں ہوں

جو خنجر نکال کر بھیڑ پر حملہ کرتے ہیں

کچا کچا دنبے کی چکی نگل جاتے ہیں

مس تو نصف سبی کا مالک ہوں

میں وہ بہادر بیورغ ہوں

باہر کا سنہرا بیٹا

میں نے محل کے نیچے سے تمہیں قول دیا تھا

میں تو اپنا قول نبھانے آیا ہوں

میری بڑی قوم ہے، رند جس کا نام ہے

چاکر ہے اور ایرانی گھوڑے ہیں
کون میرے ہٹ دھرم سر کو کاٹ سکے گا
اور لے کر جا کر چوک پر لٹکا سکے گا

اب کیا گنجائش رہ گئی بحث مباحثے کی ۔وطن سے دور وطن دوست کی آہ وزاری اور یادوں کی پر درد آواز کی دنیا کے دوست تھے وہ ۔اس قدر ناشناس کب تھے وہ؟ ۔شہزادی، بیورغ کو ہر لحاظ سے ایک مکمل نوجوان وجواں مرد پاتی ہے ۔اجڑے ہوئے دل بغیر اگر مگر کے جُڑ گئے ۔تاب لا سکو تو آگے سنو!:

نِیں توخ گراں بؤریں چادر و چنّی
تِنگ دینت ڈال شاہیں بروت رکّاں
اڈ گرنت ہر دوں دل زہیرانی
واسے ژہ مُرواریں دفا گپتیں
کمتر ژہ گوئزمی بارغیں سرینا
گیشتر ژہ دکانیں گروہاراں
ذونق ژہ جوائیں مرڑدما گپتوں

ترجمہ:

پھر سفید چادر اور دوپٹہ آپس میں گھل مل جاتے ہیں
بڑی مونچھیں ہونٹ پیتی ہیں
دونوں محبت بھرے دل سیراب ہوتے ہیں
مروارد بھرے منہ سے میں نے مزے لیے
بھڑ جیسی پتلی کمر سے کم
اور پستانوں اور ہار سے زیادہ تر
میں اچھی انسان سے خوب لطف اندوز ہوا

مردانہ چادر اور زنانہ چُنری کا گھل مل جانا کیسی ترکیب ہے، کیسا استعارہ ہے؟ ۔بڑی بڑی مونچھوں کا ہونٹ پینا کبھی سنا ہے؟ ۔کمر کی بِھڑ کی کمر جیسی پتلائی! ....زبان واحساسات کا ماسٹر ہے بلوچ کلاسیک ۔اگلا جنم ملے تو قول ہے، پورے کا پورا بلوچ کلاسیک پہ لگا دوں گا۔

داں شفئے سہ پا سا ہموذبیثاں
چیارمی آگوں مُلّوئے بانگا
آستغا چکی گوں دست و بانہیاں
پاذا او دوست کہ رنگشہ باما

ترجمہ:

رات کے تین پہر وہاں رہا
چوتھی پہر ملاّ کی بانگ کے ساتھ
وہ زیور بھرے بازو سے مجھے جگاتی ہے
اٹھ جا دوست کہ صبح ہو رہی ہے

کہانی کی روانی میں باریکیوں کو کبھی بھلایا نہیں جاتا ۔کلاسیک ہر نئے منظر کو اپنے سیاق و سباق کے ساتھ ادبی حجاب و ذوق میں لپیٹ کر بیان کرتا جاتا ہے:

موکلے گپتو کاتکوں گوئر ملاّ
مل ترا لادھی شینہنڑے پروشا
تہ چُشیں ہنڑکاٹہ جش دوشی
ماں ہزار دوستو دژمنہ نیا ما

ترجمہ:

میں نے اجازت لی اور گھوڑی کے پاس آیا
گھوڑی (مل) تمہیں جنگل کا شیر ٹکرے کر دے
تم رات کو کس قدر زور زور سے ہنہنا رہی تھیں

دوستو! میں نے بلوچی کلاسیک میں نے پہلی بار کسی جواں مرد کو اپنی گھوڑی کو بد عائیں دیتے دیکھا۔ نوجوان کے دو ہی تو مرگ و زند کے ساتھی ہوتے تھے: گھوڑی اور تلوار۔ انہیں جان کی طرح عزیز رکھا جاتا ہے۔ مگر آج بیورغ جیسا بہادر اپنی گھوڑی کو بد دعائیں دینے والا غیر بہادری کا کام کر رہا تھا۔

مگر ایک بات یہ نوٹ کریں کہ وہ اپنے اِس ہمزاد کو اس بات پر نہیں کوس رہا تھا کہ اُس نے دشمن تک اُسے پہنچانے میں کوئی کمزوری سستی دکھائی تھی۔ یا اپنی سبک گامی میں کمی سے اپنے مالک کو شکوہ شکایت کا موقع دیا تھا۔ نہیں نہیں۔ اب گھوڑی اپنے مالک کی دوری میں اپنے جبلت کے ہاتھوں ہنہنائے بھی نہ، یہ کیسے ممکن ہے۔ بہر حال ہم نے بلوچی کلاسیک کا یہ رُخ بھی دیکھا، اولین بار، آخری بار۔

ابھی رکے رہیں۔ ہم آپ کو یہ بھی دکھاتے ہیں کہ بیورغ اپنے دوسرے دست و بازو ،یعنی تلوار کو کس طرح اور کیوں کوستا ہے۔ شاید پرتگالیوں کے خلاف لڑنے والے ہمل کے بعد بیورغ دوسرا شخص ہے جو اپنی تلوار سے گلہ مند ہے۔ ذرا دیکھیے:

نیں دیم پہ دراژپاندیں شماں داثیں
یا خذا گوری و لہرے پیدار
گڑہ یک گرے ماخ و ولہر گورانی
بور وں پہ پٹی آ یلہ داثیں
دیرماں ہو شاں سُدھ کثیں روشئے
روش شتو پیشینا چغل بیثہ
کہ مثغہ گورانی ہماں ماثو
ہیذو جھگ اِش پئے مُدّواں ژِلنت
درُوہثیں کنڈھی تیغ ہراسانی

زڑتو ما بے چندرا چغل داثہ
دَر،شتہ گورانی ہماں ما ثو
ما گڈثہ ملیے پاذ جھڑپانی
دل منی زالیں وزتاں کپتہ
تیغ ترا تی خانے برا پوری
تہ گوئرے لوڑیاں تفر باثئے
ماں بزدھنڑ یارانی کو فغا باثئے

ترجمہ:

میں وسیع میدانوں کی طرف نکل آیا
اے خدا زیبروں کا کوئی ریوڑ لا
اور پھر ایک طرف سے میں دوسری طرف سے زیبروں کا ایک جُھنڈ
میں نے گھوڑی اُن کے پیچھے دوڑا دی
میں نے ہوش سنبھالا اور وقت دیکھا
سورج عصر ہونے کا بتا رہا تھا
اب وہ زیبرا
تھک چکا تھا
اُس کی پشت پر پسینہ بہہ رہا تھا
میں نے نیام سے اپنی تلوار نکالی لی
اور زیبرا پہ پھینک دی
بچ نکلا وہ زیبرا
الٹا تلوار سے میری گھوڑی کا چست پیر زخمی ہو گیا
میرا دل عورتوں کی سی فکروں میں ڈوب گیا

اے تلوار! تو شالا کسی اور کی ہو جائے

تو شالا لوہاروں کی کلہاڑی بن جائے

تم شالا چرواہوں کے کندھے کی کلہاڑی بن جائے

بہر حال بیورغ چند روز تک دِن کو شکار کرنے نکلتا اور راتوں کو چوری چھپے محل میں وصلِ یار کرتا۔ پہرداروں سے چھپتے چھپاتے یا انہیں رشوت سے خرید کر۔ مگر تا بہ کئے؟۔ گراں ناز تو ساری صورت حال جانتی تھی۔ ایک بند معاشرے میں اُسے اس سارے واقعے کے سنگین نتائج کا اندازہ ہو گیا۔ ایک ہفتہ وہاں اِس حالت میں گزر چکا تھا کہ:

داں ہپت شف و ہپت روشا مناں داشتئی
ذونق ژہ لڈوخیں جنا گپتاں

ترجمہ:

میں ایک ہفتہ وہاں رہا
میں مدھر چال والی دوشیزہ سے لطف اندواز ہوا

تب ایک دانشمند شہزادی نے اپنے دل کی بات بیورغ سے یوں کی:

گال کشہ مہلینج عاقلیں لعلا
اغ ترا مڑدی مہجوے مانیں
ماروثی زیداؤں برغ جوانیں
اغ نا گہا بادشاہے سئی بیثہ
ہر دو ناں نَیلی زیندغ و دراہا

ترجمہ:

عاقل محبوبہ بولی
اگر تم میں مردانہ جرأت ہے
تو بہتر ہے کہ مجھے اپنے علاقے لے جاؤ

(کیونکہ) اگر بادشاہ کو خبر ہو گئی
تو وہ ہم دونوں کو زندہ سلامت نہیں چھوڑے گا

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں؟۔ بھلا بیورغ میں جرأت کی کوئی کمی تھی؟۔ اس نے فوراً ہی شہزادی کو اپنی گھوڑی کی پشت پر بٹھا کر بلوچستان لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وطن تو ویسے ہی یادوں کے دل کا مرکزہ ہوتا ہے:

بروں ہمو ذا کہ دیس بلوچی ایں
دیس بلوچی ئے مس دلا دوستیں
قندہار شہراژہ میر جنوں زڑتہ
گڑہ زڑتو مس مل ئے مدّواں داشہ
لیکوی پنجاہ کور گوازینتیں
روش مناں دشتئے کپچھیا بیثہ
دیم کشئیں بولانا گیاوینا

ترجمہ:

وہیں چلتے ہیں جہاں بلوچی دیس ہے
بلوچی دیس مجھے پیارا ہے
قندہار شہر سے میں نے امیر زادی اٹھالی
اٹھا کر میں نے مل نامی گھوڑی کی پشت پر بٹھالیا
گن کر ہم نے پچاس دریا پار کیے
مجھے دشت کے علاقے میں صبح ہو گئی
ہم نے وسیع بولان کا رخ کیا

جب بیورغ اپنی نیوٹران کو لے کر سبی کے قریب پہنچا تو متفکر و دور نگاہ گراں ناز نے اُس سے پوچھا:

مس کہ داں سیوی ءَ دہا کاتکاں
فارسی لوزے کشتہ مئیں دوستا
او بیورغ وڈیرہ منڑایانی!
دئے وتی دیمی لشکرہ حالا
کئے تئی دوست و کئے تئی دژمن
پوژ کئی بازو یا کئی کمیں

ترجمہ:

میں جب سبی کے علاقے پہنچا
تو فارسی زبان میں میری دوست بولی
بیورغ، بہادری کے سردار
آگے موجود اپنے لوگوں کے بارے میں مجھے بتا
کون تیرا دوست، کون ہے دشمن؟
اور کس کی فوج زیادہ اور کس کی کم ہے

بیورغ نے جواب میں تفصیل سے اپنے علاقے کے بارے میں اُسے بتایا۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں بنیادی اور ضروری معلومات اُسے دیں:

مس جواو گڑدیثوں بہ گرانازا
چاکر مئیں دوست و گوہرام مئیں دژمن

ترجمہ:

میں نے گراں ناز کو جواب دیا
چاکر میرا دوست اور گوہرام دشمن

گراں ناز: اے دوئیناں ژہ پوژ کئی بازیں

ترجمہ: اِن دونوں میں سے کس کے پاس زیادہ بڑی فوج ہے

بیورغ:

چل ہزار میریں چاکرہ اُڑدیں
سی ہزار میرالی بہادراں
دَہ ہزار راہچی دِہ گوں منی گوانکا
سی ہزار گوہرامئے لڑیں تیغاں

ترجمہ:

چالیس ہزار چاکر کی سپاہ ہے
تیس ہزار میرالی بہادر ہیں
دس ہزار اور لوگ میری آواز پہ پہنچتے ہیں
تیس ہزار گوہرام کے تیغ بکف ہیں لوگ

تب عقلمند و دانا گراں ناز، داخلی قبائلی مناقشوں سے بالاتر گراں ناز، اپنے باپ کی افواج کی تعداد قوت سے آشنا گراں ناز فیصلہ کن انداز میں اُسے صلاح دیتی ہے:

گال کثہ مہلبیخ عاقلیں لعلا
اے دوئیناں ژہ بادشاہ زوریں
رَوں گوئر گوہرامئے لڑیں پوژاں
چاکرہ آرامہ نیئے لوغا
چاکرہ کیث و وث ھذا کاری

ترجمہ:

عاقل حسینہ محبوبہ بولی
ان دونوں کی مشترکہ قوت سے بھی بادشاہ زیادہ طاقتور ہے
چلے چلو گوہرام کی تیغوں کی طرف
چاکر کو خود چین نہ آئے گا
اور وہ آئے گا، خدا اُسے لائے گا

بات بیورغ کی سمجھ میں آجاتی ہے۔مگر جس طرح بلوچستان کی سڑکوں پہ سفر کے دوران ایک وادی طے ہوجاتی ہے تو پہاڑوں سے گھری دوسری وادی شروع ہوتی ہے، یا جس طرح منیر نیازی ایک دریا عبور کرتا ہے تو پھر ایک اور دریا گزرنا پڑتا ہے............مشکلیں تہہ در تہہ رکھی ہوتی ہیں، ایک سے گزرو دوسری شروع ہوتی ہے۔یوں بیورغ وہ فیصلہ کرلیتا ہے جس کا قبائلی دشمنی میں گرفتار کوئی شخص آج بھی جرأت نہیں کرے گا۔روایتیں صدیوں کے عمل میں بن جاتی ہیں۔اُن پر چلنا، اور چلتے رہنا نسلوں تک چلتا ہے۔انہیں توڑتے ہیں صرف اور صرف بہادر لوگ۔اور بیورغ سے بہادر شخص پورے منطقے میں نہ تھا۔چنانچہ گوئہرام کا بدترین دشمن بیورغ، پناہ کے لیے گوئہرام کے پاس جاتا ہے۔محبت کے دستور نرالے!!۔

روش پیشینا و بیگھئے پہرا
کاتکوں گوئر گاجانئے لڑیں شہرا
اوذا گوئر گوئہر اما قویہینا

ترجمہ:

ظہر کے وقت، سہ پہر کے سمے
ہم گاجان کے بڑے شہر پہنچے
وہاں، طاقتور گوئہرام کے پاس

ناگہان و ناگماں آمد کی وجہ تو بتانی پڑتی ہے بدترین دشمن کو۔اور بیورغ بات زبان کے نیچے چھپاتا نہیں، سیدھا سیدھا اور سادہ سادہ بیان کرتا ہے۔قبائلی آن کے ساتھ انسانی شان کے ساتھ:

گو نشوں آوار بادشاہانی
اغ مناں دارئے مس گوئرۂ توہ نداں
اغ نہ دارئے دِہ ئیں طمع گیراں

ترجمہ:

میرے پاس بادشاہی مالِ غنیمت ہے

اگر مجھے پناہ دوگے تو تمہارے پاس ٹھہروں گا
اگر پناہ نہ دوگے تو میں زیادہ پرواہ نہیں کرتا

اب ذرا دوسرے بلوچ کی اقدار پرستی دیکھیے۔اُسے معلوم ہے کہ بیورغ اس کے دشمن قبیلے کا سب سے بہادر شخص ہے۔اُسے نقصان پہنچانے کا ہر موقع اُسے میسر تھا۔مگر بلوچیت، تو بلوچیت ہوتی ہے، انسانیت انسانیت ہوتی ہے۔پناہ مانگنے والے کو کون انکار کرے؟۔عشاق کے کام کیسے نہ آیا جائے؟۔رسم و رواج سے کون روگردانی کرے۔تن و مال و عزت و جان سب قربان:

گوئشتغہ گوہرا ما قو یہینا
بیا کہ بیا یاشئے میر بلوچانی
گوں وثی دوستا حیر و آمانی
ہردمے سیر وشاذہاں باشئے

ترجمہ:

کہا گوئہرام قوی نے
خوش آمدید، میر بلوچ
اپنی محبوبہ کے ساتھ آرام وچین کے ساتھ
ہردم تمہیں مسرت وشادمانی نصیب ہو

نہ تکلف نہ تکلیف۔اس نے پناہ طلب کی، دوسرے نے پناہ دی۔کوئی لکھا پڑھی نہیں، کوئی کاغذی کاروائی نہیں۔کوئی گواہ کوئی ضامن نہیں۔سارے شرط و شرائط بلوچ ویلیو سسٹم میں موجود ہوتے ہیں۔پناہ دینے والے کو کیا کیا پہاڑ پار کرنے پڑیں گے اور پناہ گیر کو کیا کیا پابندیاں قبول کرنی ہونگی، یہ ساری تفصیل پہلے سے موجود ہے۔اور ہر بالغ شخص کو اُس کا ایک ایک شق معلوم ہوتا ہے۔سو ہر ایک فریق اتاہ ذمہ داریوں کے باوجود کمفرٹیبل!!

عین رسم و رواج کے مطابق اُس نے بیورغ کو صرف خوش آمدید ہی نہ کہا بلکہ گوئہرام

نے اُس معزز مہمان کے لیے بلوچی مہمان نوازی کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے:

واند کثو ماڑی اے مناں داثئی
آڑ تغاں کٹ و گیتکغاں غالی
جاگہہ ومیری اے مناں داثئی
پر منہ کایاں تال پلایانی
پکغیں سجی گوژد گرانڈانی
پُرانتاں وٹی شھذ و شیرانی

ترجمہ:

ایک محل خالی کر کے مجھے دے دیا
پلنگ اور قالین بچھائے گئے
اس نے مجھے امیرانہ جگہ دی
میرے لیے آتی ہیں بھری پراتیں پلاؤ کی
سجی اور گوشت دنبوں کے
شہد وشیر بھرے کٹورے

ظاہر ہے گوہرام نے ایک بہادر دشمن کی عزت وخدمت میں کوئی کمی نہیں کی جو اُس کے پاس پناہ گزیں ہو کر آیا تھا۔ انواع واقسام کے خوراک کی ڈشیں صبح وشام اِس جوان مرد اور اُس کی محبوبہ کی خدمت میں۔ مگر ترک دوشیزہ گراں ناز ششدر وحیران، کہ بیورغ کھانا نہ خود کھاتا تھا، اور نہ اُسے کھانے دیتا تھا۔ بس، سب کچھ بن کھائے محل کے نیچے گرا دیتا تھا اور کچھ تھال کے پیندے میں چھوڑ دیتا تھا:

نَیں منہ واڑتاں نَیں منی دوستا
نیم اوو ماڑی ئے بُنّارتکاں
کمترا تالانی بُنہ کشتاں

گیشتر ماں انبارہ بُنّار تکاں

ترجمہ:

نہ میں کھاتا تھا نہ میری محبوبہ کھاتی تھی
ہم آدھا حصہ پھینکتے محل کے نیچے
کچھ برتنوں میں چھوڑ دیتے
زیادہ تر انبار کے نیچے ڈالتے

ترک شہزادی کی ساری فراست وعقل مندی اپنی جگہ، مگر بیورغ کے لیے بلوچ روایتوں میں سے حسین ترین باتوں کی پیروی تو شان ووقار کا درجہ رکھتی تھی۔ گراں ناز کی دلچسپ حیرانی تو فطری بات تھی:

عاقلیں ماہ لینجا مناں گوئشتہ
بیورغ او وڈیرہ مڑایانی
اے تئی شوئیں قصوو چالے
ماں چترہ چکا دِہ گُھسوے مانیں

ترجمہ:

عاقل محبوبہ نے مجھ سے کہا
اے بیورغ، اے بہادری کے سردار
یہ تمہاری کیا کہانی ہے، یہ کیا ریت وحرکت ہے
مہمانی کی چٹائی پر بھی غصہ ودشمنی نہیں بھلاتے ہو

تب گراں ناز بات کی تہہ تک پہنچی۔ ایسی گہری اور پختہ بات کہ بلوچوں میں موجود ہے۔ قبائلی عصبیت کو محبت جیسی پاک چیز بھی دھو نہیں سکتی۔ بیورغ نے اپنی محبوبہ کے سامنے وضاحت جو کر دی:

ما جواو گڑدینتہ خمار چما

''ماخ و گوئہرام ژہ بنا سیالوں
کہ مس وراں میرئے نہقہ ونغناں
گنّواں روشے آ نمک واراں
لونڑ حرام بنت گڑ کور کناں چماں

ترجمہ:

ہم نے خمارِ چشم کو جواب دیا
میں اور گوئہرام اصل میں دشمن ہیں
اگر میں میر گوئہرام کا کھانا اور طعام کھالوں
کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا نمک خوار ہو جاؤں
نمک حرامی تو آنکھوں سے اندھا کر دیتی ہے

اِس دوران غیبی امداد آ جاتی ہے۔ بستی کا دکاندار غیر لاشاری ہوتا ہے، یعنی وہ گوئہرام کے قبیلے کا نہیں ہے۔ یعنی دشمن قبیلے کا نہیں ہے۔ وہ نسل کا میمن ہوتا ہے (پندرھویں صدی میں بلوچ معاشرہ اور میمن !!۔ ہے نا دلچسپ بات؟)۔ وہ دکاندار پیشکش کرتا ہے:

میمنڑے کیث کہ مس تئی یاراں
ہر چی کہ لوٹئے پڑ تو ہ کاراں

ترجمہ:

ایک میمن آتا ہے کہ میں تمہارا دوست ہوں
جو چیز چاہیے لا دوں گا

بیورغ کی دشمنی تو لاشاری قبیلہ سے ہے۔ بس، اُس قبیلے کا نمک نہیں کھانا ہے ۔ یہ تو غیر لاشاری ہے، اور پھر دکاندار ہے۔ لہٰذا وہ اُس کی پیشکش قبول کرتا ہے، قیمتاً، آرڈر دیتا ہے کہ:

شکل وشیراں بیار دئے نوشاں
ململیں تھانے بیار مس دوشاں

ترجمہ:

شکر اور شیر لا دو میں نوش کروں
ململ کی تھان لاؤ کہ لباس بنالوں

میں، مکالمہ پر مبنی خوبصورت کلاسیکل شاعری میں صرف اس قدر مداخلت کروں گا کہ:

سئے چیار روشا داشتغت درزی
ہپت ہزار کلدار بیثغاں قرضی

ترجمہ:

تین چار دن تک درزی مصروف رہے
سات ہزار کلدار کا مقروض ہو گیا ہوں

چھوڑیے مقروض عاشق کو، کہ ابھی عشق کے کڑے امتحان سامنے ہیں۔ حال کا منظر نامہ یوں ہے کہ، اسی دوران گوئہرام چاکر کی طرف تیز رفتار قاصد روانہ کرتا ہے اور اُسے حالات کی ساری سنگینی کی تفصیل سناتا ہے؛

محرمے گوئہراما کثہ رائی
چاکرے معلوم دار کنائیثئی
''بیا کہ بیورغا بستہ یہ بارے
چُرو چانکے ئیں شیلوی آفے
ئیں شفانک وئیں چوروی کارے
اے دیر سریں کورے کہ گم و گازاریں
چولہر سمندرئے ماں اچھلاں بیاباں

ترجمہ:

گوائہرام نے قاصد بھیجا
چاکر کو خبر کر دی اس نے

چاکر دیکھو دیکھو بیورغ نے گراں بار کر دیا ہے

نہ تو چلّو بھر ہے اور نہ چھوٹی سیلابی ندی

نہ یہ کسی چرواہے یا کمسن لڑکے کا بچگانہ اقدام

یہ تو دور دراز کا طوفانی سیلابی دریا ہے

جیسے سمندری لہریں غصے میں آئیں

یہ کوئی معمولی پیغام تو نہ تھا۔ ایسی اطلاع پہ ظاہر ہے رند قبیلہ نے حرکت میں آنا تھا۔

چنانچہ:

گڑہ　روش　ٹکّا　او　ملّو　ہ　بانگا

ترپ　کشہ　سیوی　پڑیں　رنداں

ترجمہ:

تب طلوع آفتاب اور ملاّ کی اذان کے وقت

سیوی کے رند گھڑسواروں کی ٹاپیں سنائی دیں

اسی اثنا میں قندہار کا فارسی بان گورنر گراں ناز کی گمشدگی کا سن کر، اور بیورغ کی دیدہ دلیری کی کھوج لگا کر اپنی فوجوں کے ساتھ بیورغ وگراناز کا پیچھا کرتا ہے۔ دن رات ایک کرتا ہوا بالآخر وہ پہنچ جاتا ہے اور پہنچ کر جنگ کے لیے خیمے گاڑتا ہے۔ اور مجرم پیش کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

گھورکشہ　فوجاں　بادشاہی　آں

مُرگِ　ماں　پلاّنی　سرانداں

آغیں　پہ　بیورغا　شترامانان

ترجمہ:

بادشاہی فوجیں موج در موج آئیں

پرندے اُن کے نیزوں پر بیٹھتے ہیں

وہ نیند میں بھی بیورغ کا نام بڑبڑاتا ہے

''مجرم پیش کرو، یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ!''۔ رند و لاشار بیورغ وگراں ناز تو حوالے نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا جنگ! ۔ اگلی صبح جنگ کا میدان سجنے کا طے ہوا۔

لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ جنگ چھڑ جائے گی تو آپ کا خیال غلط ہے۔ اس لیے کہ ہمارا آپ کا واسطہ بہادر بیورغ سے ہے۔ جہاں دیدہ اور دیدہ ور بیورغ سے۔ وہ تفکر میں پڑ جاتا ہے کہ اب تو خوب مسلح و تیار دو افواج آمنے سامنے ہیں۔ کشتوں کے پشتے لگنے ہیں۔ کتنے لوگ موت کے منہ میں جائیں گے۔ کتنے آدم زاد زخموں اپاہجیوں اور آہوں کراہوں کا شکار ہو جائیں گے۔ دو قوموں کی جنگ میں یتیموں، بیواؤں کی تعداد لاتعداد ہوگی۔ مال مویشی قبضہ ہوں گے، زمین اغیار کے پاؤں تلے دھنسے گی۔

چنانچہ بیورغ، بلوچوں اور ترکوں کی بڑی تباہی سے نجات کا ایک ہی راستہ دیکھتا ہے۔ وہ محض ایک شخص یعنی اپنی ایک حرکت سے سینکڑوں انسانوں کا قتل اور بیوگی، یتیمی اپنی تصور کی آنکھ سے واضح دیکھتا ہے۔ وہ بہادر، ایک مدبر و فلاسفر کے سے احساس میں ڈوب جاتا ہے۔

تب وہ ایک جوا کھیلتا ہے۔ رات گئے وہ خود تن تنہا چھپتے چھپاتے نکل جاتا ہے، دشمن افواج کے کیمپ کی جانب۔ غیر اہم اور بے محافظ راستوں سے ہوتا ہوا یہ گوریلا گورنر کے کیمپ پہنچ جاتا ہے۔ وہ ایک ایک محافظ کو اپنی تلوار سے خاموش کرتا جاتا ہے اور چھپتا چھپاتا بالآخر امیر کے اپنے خیمے کے باہر موجود پہرے دار کو بھی قتل کرتا ہے اور خیمے میں داخل ہو جاتا ہے۔ جو ملازم بادشاہ کا جسم دبا رہا ہوتا ہے، بیورغ کمال مہارت اور استادی سے اس کا گلہ بھی کاٹ دیتا ہے۔ اور خود اُس کی جگہ لے کر بادشاہ کا جسم دبانے لگ جاتا ہے۔ یوں، کہ سوئے بادشاہ کو خبر بھی نہیں ہوتی:

بھیڑشہ　ما　پہ　شاھہ　تمبو　آ

یہ　پڑے　چاری　حرکتہ　بیاں

ہیچ　ماں　ہیسی　چوٹوا　زڑتہ

کرّ کشہ   کنڈھی   تیغ   حراسانی

بھیڑ   شہ   ما   گویَر   شاھہ   تمبو آ

کشتہ   مس   دستئے   گوہریں   ھندی

لانچو   دست   و   نشتاں   ماں   کٹا

ترجمہ:

میں بادشاہ کے خیمے کی طرف بڑھا

ایک بار چوکیدار حرکت میں آئے

جرم کی بات میں نے اپنے سر پر لی

میں نے خوبصورت خراسانی تلوار نکال لی

میں شاہ کے خیمے کی طرف روانہ ہوا

میں نے تلوار سونت لی

آستینیں چڑھا کر میں اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا

ترک بادشاہ کو بیورغ سے نفرت اس قدر کہ پہلو بدلتا ہے تو بیورغ کو کوستا ہے۔ اور ہر بار بیورغ جواب دیتا ہے:

’بیورغ مناں‘۔(بیورغ میں ہوں)............

اور یوں بالآخر بادشاہ ہڑبڑا کر جاگ جاتا ہے۔ اپنے خدام اور محافظوں کی پڑی لاشیں دیکھتا ہے اور حیرت واستعجاب سے پوچھتا ہے؛

سارئشہ   بادشاھا   گرانینا

پولہ   کنت   ایذا   بادشاہ   گرانیں

تہ   کہ   تاں   ھوتئے   بنگلیں   ورنا؟

تہ   کجام   گیابانی   مزارا   نئے؟

ترجمہ:

گراں شرف بادشاہ جاگ گیا

تو اُس نے عظمت سے پوچھ لیا

تم کون ہوا ے خوبرو نوجوان

تم کس گیابان کے شیر ہو

اور اپنی منظر نگار شاعری میں بیورغ ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے بن جھجکے واضح انداز میں اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ اُس حرکت کی وجہ سے کشت وخون ہونے کو ناجائز کہہ دیا۔ اور یہ کہ ’مجرم میں اکیلا شخص ہوں، معاف کردو تو منتظر ہوں، نہ کرو تو گردن حاضر۔ کشتوں کے پشتے نہیں لگنے چاہییں‘:

مس   جواو   داشہ   بادشاہارا

مس   ہماں   بیورغاں   کلامانی

اژمناں   کارے   بیثہ   شیطانی

تہ   مناں   بشکئے   کہ   گویژ   تو   ہ   کاتکاں

اغ   نہ   بشکئے   تہ   مس   تئ   دستاں

ترجمہ:

میں نے بادشاہ کو جواب دیا

میں عہد وقول کا دھنی وہی بیورغ ہوں

میرے ہاتھوں ایک خطا سرزد ہوئی ہے

میں خود آیا ہوں اگر معاف کردو گے

اگر معاف نہیں کروگے تو میں تمہارے قبضے میں ہوں

تُرک سردار آس پاس اپنے خدام اور محافظوں کی پڑی لاشیں دیکھتا ہے، اس کی بہادری دیکھتا ہے۔ اس کی دوراندیشی دیکھتا ہے کہ اُس نے سنتریوں محافظوں کو قتل کردیا، بیورغ چاہتا تو مجھ بے محافظ وبے تیغ سوئے ہوئے آدمی کو بھی قتل کرسکتا تھا۔ مگر اُس بڑے دل والے بہادر نے تو اُس کی جان بخش دی تھی۔ ترک اِس سب سے بہت متاثر ہوا، اور صبح سویرے اپنے سرداروں

کمانڈروں کو بلایا، سارا ماجرا سنایا، اور:

زیث کشو قاضی اے گھر ائیتئی
مئے نیکہ اے لعلا گوں پڑھائیتئی
داشہ او بشکاثئی مناں گراں ناز
لال گوں مسکیفاں مناں داثئی
ماوثی حَیرُ وث کشو کاتکوں

ترجمہ:

فوراً ہی ایک قاضی بلوالیا اُس نے
اُس لعل کے ساتھ میرا نکاح پڑھوایا
اس نے مجھے گراں ناز بخش دی
لعل کو نعمتوں کے ساتھ میرے حوالے کیا
میں اپنا تصفیہ خود کر کے آیا ہوں

میرے قاری! میں آپ کو بیورغ کے اس سب سے بڑے انسان دوست اقدام کی توصیف کا نہیں کہوں گا۔ اس لیے کہ آپ بھی میری طرح اتنے بڑے فیصلے کی تحسین کر ہی نہیں سکتے۔ ہم آپ تو 'زہم جنی' (تیغ زنی) کی ایک ہی صورت جانتے ہیں: لاشیں، آہیں، لہو، شعلے، نعرے، تالیاں۔ خواہ وہ جنگ حقیر ترین مقاصد کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ انسانی سماج یقیناً عمر و عقل میں بڑا ہوگا۔ اور تبھی قرار پائے گا کہ بہادر بیورغ کی سب سے بڑی بہادری تُرک و بلوچ کے درمیان تقریباً حتمی، مگر بے کار جنگ کو روکنا تھا.........زندگی بھر کا اس کا سب سے بڑا کارنامہ!!۔

ایک اور بات سے آپ کو بھی دلچسپی ہوگی، اور میں بہت سرگرداں رہا کہ آخر بیورغ کی اولاد کیا تھی۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ بلوچوں میں گشکوری قبیلہ خود کو بیورغ کی آل اولاد کہلاتا ہے۔ مگر ابھی تک اس کا حوالہ مجھے نہ ملا تھا۔ ڈیمز نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ نہ صرف بیورغ کی اولاد کا مسئلہ، بلکہ یہ بھی کہ "گراں ناز سے بیورغ کا ایک بیٹا تھا، گشکور نام کا"۔

****

بیورغ اور فیوڈل ازم

کلاسیکس تو ہمارے ادب کا سرمایہ ہیں۔ ان میں دراصل اپنے مخصوص عہد کی معاشرت، طرزِ بود و باش، سماجی معاشی حالات، اور مذہبی عقائد گندھے ہوئے ہیں۔ میر چاکر کا پورا دور بلوچی زبان و ادب کا ایک حسین دور ہے۔ بیورغ جیسا متحرک و دانا نوجوان اپنے ماموں چاکر کے عہدے یعنی اُس کی سرداری کی حفاظت کرتا ہے، اُس کی خدمات سرانجام دیتا ہے، اور اس کی خاطر جنگیں لڑتا ہے۔ مگر ایسی متحرک روح تو کبھی کبھی چوکھاٹ پار بھی کر لیتی ہے۔ محافظ ہوتے ہوئے بیورغ کی ایک آدھ حرکات خود کبھی تخت و جاہ کے لیے خطرہ بھی بن جاتی ہیں۔

سبی کا میدان شمال کی طرف جس پہاڑی کے ساتھ بغلگیر ہوتا ہے اُس پہاڑی پر ایک مزار ہے۔ مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ وہ شیہہ کٹی کا مزار ہے۔ ارے اس کا نام تو میں نے سات آٹھ سال کی عمر میں کلاسیکل شاعری میں سن رکھا تھا۔

آیئے معلوم کریں کہ وہ کون تھا۔

شیہہ کٹی چاکر کا مرشد تھا۔ اب اُس زمانے میں مرشدی مریدی کیا ہوگی، یا سردار بھلا کس کی مریدی کرے گا؟۔ بس یہی سمجھیں کہ شیہہ کٹی اُس کے اقتدار کی حفاظت اپنی کرامت اور روحانی اثر و رسوخ سے کرتا تھا۔ اِس شیہہ کٹی نے بغیر کسی خاص وجہ کے بیورغ کے باپ باہَر کو قتل کر دیا۔ بیورغ پہ کیا بیتی، اس نے اس درد کا کس طرح سامنا کیا اور انتقام کی آگ بالآخر کس طرح سرد کر دی، ہم اس سب کے لیے ایک بار پھر بیورغ کی شاعری مستعار لیتے ہیں۔

چے تئ سیالِی گھُسو ے زیانا
کشتہ تہ باہَر مئے منڑایانی
نِیں نشتئو آں روشئے مناں چاری
کہ شیہہ کٹیا گوں پُسغا بیاری
بیاری مس چیار راہے سرداری
مس دہ چو شیری حلمہا بیاراں
گرڑدنا گڈ گواشی بہ بھورنیاں

ماں بروتان و نوش کناں ہوناں
گڑہ جاں منی لہمیں سمبغاں ساڑبی

ترجمہ:

تمہیں ایسا کیا غصہ اور دشمنی تھی
کہ تم نے بہادر باہڑ کو قتل کر دیا
میں اس روز کے انتظار میں ہوں
کہ شیہہ کٹی بیٹے کے ساتھ آئے
آ کر ایک چہار راہ پہ کھڑے ہوں
میں شیر جیسا حملہ کر دوں
گردن اڑا ڈالوں
اور پھر اپنی مچھوں سے اس کا خون نوش کروں
تبھی میرا جسم گرم شعلوں سے ٹھنڈا ہو جائے

پیر پرست لوگ خواہ جتنا 'توبہ استغفار' پڑھیں، بلوچ رواج تو نبھانا تھا۔ بیورغ ایسے معاملوں میں نہ 'ماموں' چاکر کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ہی 'سردار' چاکر کی۔ بلوچ اقدار کو سرفراز رکھنا مقصدِ حیات بھی ہے اور فلسفۂ حیات بھی۔ وہ انصاف کے سارے تقاضے اپنی تلوار سے پورے کرتا ہے۔

جب اُس کا سردار (جو اُس کا ماموں بھی ہے) اُس سے ناراض ہوتا ہے تو برملا وہ مصرعے کہتا ہے جو آج بھی بلوچی زبان کی مقبول ترین ضرب المثال کی حیثیت رکھتے ہیں؛

بلاں مار سرڑدارے مہ وی راضی
بلاں ثی براتان و دادناں بندکاں
زاثغیں گوخان اوں مہ ذا دینی
بارغیں بوران اوں مہ بشکائی

ترجمہ:

بے شک سردار راضی نہ ہو
بے شک وہ اپنی بخششیں عنایتیں بند کر دے
دودھ دینے والی گائے شیر خوری کے لیے نہ دے
اصیل تیز رفتار گھوڑے نہ بخشے

اور یہیں پہ وہ دو مصرعے بھی اُسے ودیعت ہوتے ہیں جن کی دائمیت پچھلی پانچ صدیوں میں کبھی کند نہ ہوئی؛

رند نہ ویث لاشار دِہ منی براثیں
سندھ نہ وی ہندوستاں ولایت ایں

ترجمہ:

رند نہ ہو تو لاشار بھی بلوچ بھائی ہے
سندھ نہ ہو تو ہندوستان بھی ٹھکانہ ہے

****

'بڑھاپے کی لو ریاں نہ دو بچوں کو'

دلچسپ بات یہ ہے کہ قبائلی بلوچستان میں تیغ و تیر کا دھنی بیورغ، طویل عمر پا گیا۔ اور پھر ہم وہ نفسیاتی کیفیت دیکھتے ہیں جس کی مثالیں ہماری روزمرہ زندگی میں بے شمار ملتی ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ ایسا بھرپور جوان جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنی ناتوانی پہ بہت کڑھتا ہے۔ کیا کیا کچھ یاد کرتا ہے، کیا کیا امکانات موجود پا کر بھی اپنی بے بساعتی اور ضعف کو کوستا ہے۔ اس بارے میں بیورغ جیسا خوبصورت کلام بلوچی زبان میں دوبارہ نہیں آیا۔ اور زبانوں میں بھی میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ مگر بیورغ کی شاعری کا ذائقہ اور خوشبو تو بالکل ممتاز ہے۔ اِسی معمر شدہ بیورغ کو دیکھیے کہ اب خواتین کو کیا مشورہ دیتا ہے:

مس جناں جوائیناں دیاں پنتے

که شوا وثی لجاں سکترا داریں
نواں چورو او پیر مڑد بہ پرا منت
ٹمبرو گوں او شیشیں گلالکاں
(شوئے) براث باں شکی نیاذ و دیواناں

ترجمہ:

میں اچھی خواتین کو ایک نصیحت کرتا ہوں
تم اپنی عصمت کی خوب حفاظت کرو
ایسا نہ ہو کہ لڑکے اور بوڑھے تمہیں ورغلائیں
نوخیز جواں اپنے خوبصورت بالوں کے ساتھ
(کہ) تمہارے بھائی محفلوں میں شرمندہ ہوں گے

اب ذرا دیکھیں وہ خود اپنی سابقہ نوجوانی کو کس طرح بیان کرتا ہے؛

حا لینو ورنایاں گشینیاں
دست رسا بالا ذامہ رنجینیں
ماوثی بالاذ ، ہچ نہ رنجینتہ
ململ و خاسائیں گذہ دوتکاں
ثہ بہانانی چندنیں زیناں
پہ اُملانی ہارو کنڈیاں
پہ کنُشکانی کاغذیں رکاں
پہ کنالانی پلگیں ونگاں
باہر ئے مُڈی آ بسیارینا
نیم کثوں کیس و کمبریں لنگی
نیم کثوں پاذ ئے چاغلیں جُتی
دانکوداں ورنائی اہ حد یثانی

نیم شفاں مسکیں پادروّہ داثاں
حیمھی بانکّہ کشت ہاغہ
واسوں ثہ پن واریں دفہ گپتاں
چوڑ ثہ گوئزمی بارغیں سریناں
گُل ثہ ہنگیں چیڑواں پر وشتاں
بِرّ وں پہ بورانی بہاں گپتاں
گراں بہائیاثہ مِڑ مِڑ یں مڑداں
ململ وخاصا و دوتا ئیاں
داثاں ماچروخیں شغاسی آں
دیر واں دست دستہ کشت کا ڈاں
اے چہ داذے کہ داثغئے مستا
داثغاں بیور غاملو کینا
پہ وثی نا مو زا بلوچی آ
دیر و مادگّانی دفہ بوتکاں
اوثہ 'باہرہ' مُڈی آبہ گانجینا
براث مناں پلّنت کہ گا رمخاں مالاں
کہ مستر ہ بثوباز تر بوثنت
دانکوکہ مار خاوند ئے نغا ہ نیخیں
مارا نَیں کسے ئے تماہ بازیں
چاکرئے ساڑ تیں ساماناں پُشتیں
مں ہانسکار درنگانی سرا چّراں

ترجمہ:

اے اچھے جوانو تمہیں خبر ہو
جہاں تک بس چلے اپنے جسم کو ناراض نہ کرو
میں نے اپنے جسم کو کبھی ناراض نہ کیا

میں ململ اور خاصا نامی لباس بنواتا رہا
گھوڑوں کی چندن جیسی زینوں سے لطف اندوز رہا
اپنی محبوباؤں کے ہار اور زیورات کے لیے
حسیناؤں کے باریک لبوں سے کیف لیتا رہا
شکار کیے دبنے کی بچی کی ہوئی پٹھ کے لیے
میں نے باہر کی بڑی دولت سے
آدھا خرچ کیا کھیس اور لنگیوں پہ
نیم خرچ کیا پیروں کی قیمتی آرام دہ جوتیوں پہ
جب تک بھرپور جوانی تھی
نیم شبوں کو حسین کام پہ نکلتے
خیموں کی مالکنوں کو جگاتے
خوشبودار بوٹیاں چبانے والے لبوں کے بوسے لیتے
ہم پھول سرسبز شاخوں سے توڑتے
ہم چُن کر کمسن (جو ابھی سواری کی عمر میں نہیں) اسپ بچے خریدتے
بہت اونچی قیمتوں پر کنجوس افراد سے
قیمتی اور نایاب کپڑے
ہم گھومنے والے گداگروں کو دے دیتے
(یہ تحائف) آبادیوں میں حسینائیں باہم بانٹتیں
یہ کیا حسین تحفہ ہے جو بے پرواہ نے تمہیں دیا ہے
دیا ہے ملوک بیورغ نے
اپنی بلوچی ناموس کی خاطر
ہم شاہراہوں پر ڈیرے ڈالتے

اور باہر کی فراواں دولت خرچ کرتے
بھائی میری منتیں کرتے کہ جانور ضائع نہ کر
یہ بڑے ہوکر زیادہ قیمت لائیں گے
جب تک ہم پہ خدا کی نظر نیک ہے
ہمیں کسی کی کوئی پرواہ نہیں
چاکر کا ٹھنڈا سایہ مجھ پہ ہے
(اس لیے) میں قصداً خطرناک چٹانوں پر گھومتا ہوں

اور پھر بڑھاپا آ گیا۔..........بڑھاپے پہ دنیا بھر کے ادب میں بات کی گئی۔ شہ پارے موجود ہیں۔ اور اگر موقع ملا تو بلوچی ادب میں موجود مواد سے اُن کا موازنہ بھی کروں گا۔ مگر یہاں میں کسی بھی طرح کی بڑائی اور دعوے سے گریز کرتے ہوئے صرف بیورغ کے تذکرہ کردہ بڑھاپے کو نقل کروں گا۔ لطف اندوز ہوتے جایئے کہ وہ کس خوبصورت انداز میں اُس کے ایک ایک مرحلے کے بارے میں بتاتا جاتا ہے:

شصت پہ شاہی دھم دھماں گوئستہ
(نیں) پیرھئے چاریاں مناں گپتہ
مس بروتان و تنگویں ریشاں
(نیں) کاڈ پہ ماما‌ئی جناں گوانکاں

ترجمہ:

ساٹھ برس اس طرح شاہی شان وشوکت سے گزرے
اب بڑھاپے کے جاسوسوں نے مجھے گرفتار کرلیا
مونچھوں اور سنہری داڑھی میں
اب حسینائیں ماموں کہہ کر پکارتی ہیں

دنیا بھر کی طرح بلوچ بھی اپنے بچوں کو بڑی عمر کی دعا دیتے ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ ہم بچپن

جب بھی کسی بزرگ سن سے ملاتے تو وہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا: ''مزن باشئے ، پیر باشئے''۔ جواں مرگی تباہ کن موت ہوتی ہے، اسی لیے انسان ہمیشہ بچوں کو بڑی عمر کی دعا دیتے ہیں۔ نیز پوری میڈیکل سائنس انسانی عمر کی طوالت کی جدوجہد میں ہے۔

مگر ایک بیورغ ہے کہ بڑھاپے سے اس قدر بیزار کہ نہایت خوبصورتی سے بچوں کو بڑھاپے کی لوریاں نہ سنانے کی نصیحت کرتا ہے:

پیرھئے لولیا ل مہ ذے بچاں
پیر ہاعیو ے مس گندغیں دیشہ
اے بلہ زیرئے جنگیں گوں ریشاں
گوں دف و د تان و بروتاناں
چمے ژہ دیریں گندغا کوشتاں
دست لڑزنت ژہ سمیریں واغاں
لنگ ژہ مہمیزاں نریا نانی

ترجمہ:

اپنے بچوں کو بڑھاپے کی لوریاں مت دو
اس لیے کہ بڑھاپے میں، میں نے بہت بڑا عیب دیکھا ہے
اس بدبخت کی جنگ ہے داڑھی کے ساتھ
دانتوں کے ساتھ اور مونچھوں کے ساتھ
آنکھ دوربینی سے رک جاتی ہے
ہاتھ گھوڑی کی خوبصورت باگ تھامتے ہوئے لرزتے ہیں
ران ایڑ لگاتے ہوئے لڑکھڑاتی ہیں

اور آخری شعر، اس پورے طویل و مرصع شیئر کا حاصل، نچوڑ اور تمنا۔ دنیا بھر کے سارے زندہ انسانوں کا ارمان، انسان جو بوڑھے ہیں، انسان جو بوڑھے ہونگے:

او منی ورنائی مزن مرّیں
دو برا پہناذے مناں داشیں

ترجمہ:

اے میری بے مثال جوانی
بس، ایک بار پھر مجھ پہ لوٹ آؤ

****

قبائلی برادر کشی کی مخالفت

اُس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے، جب آپ ساری زندگی جنگ و روایت پرستی کا کمانڈر بنے رہیں اور پختہ عمر میں جا کر، عقل و منطق کے سامنے ہتھیار ڈال دیں (گو کہ یہ اعلیٰ ترین جنگی شجاعت ہوتی ہے)۔ تب آپ اکیلے رہ جاتے ہیں اس لیے کہ جس لشکر کو آپ نے جنگ و خون آشامی پہ لگائے رکھا وہ اُس 'آکسیجن' کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ وہ تو آپ کی امن و مصالحت کی اختیار کردہ نئی راہ کو آپ کے ساتھ ہی قتل کر ڈالے گا۔ اور اگر آپ خوش قسمت ہیں اور تلوار سے بچ بھی جاتے ہیں تو پھر آپ کو تنہائی مار دے گی (آپ Isolate کر دیے جائیں گے)۔ اس لیے کہ پاپولر رائے آپ کے ساتھ نہ ہوگی۔

ہم بلوچ تاریخ میں کس کی مثال لائیں کہ اس کا ہر صفحہ اس طرح کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ مگر یہ کوئی خوبصورت سلسلہ نہیں، بہت دردناک اور افسوس ناک مثالیں ہیں۔ لہٰذا، بس اپنے موضوع سے ہی چپٹے رہنا بہتر ہے۔

چاکر و گوہرام جب گوہر جتڑیں کے تنازعے میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور چاکر لاشاریوں کو تباہ و برباد کرنے کا عہد و ارادہ کرتا ہے تو دور اندیش بیورغ اُسے تباہی کے اس راستے پر جانے سے روکتا ہے۔ دلیل و استدلال، دانائی و عقل بحث و مباحثہ سب تدبیریں استعمال کرتا ہے۔ ایک لکھاری کو کبھی اپنی باتیں اور فقرے دہرانے نہیں چاہئیں۔ مگر میں خود کو دہرانے کا رسک لے کر

آپ کو اس کے مقدس دلائل دوبارہ سنانا چاہوں گا۔

سڑدار کینغاں کوتاہ کاں
بِل دئے غصّواں سیالی آں
گوئر رّایاں مرو چوٹیناں
گوئرزّا، گرڈناں بھوریناں
(مرشی)رندانہ برے میٹر نیئے
رندو میلائیں لاشاری
آف و بنّوی مانایاں
ہوشغ بُرکناں آپتیا

ترجمہ:

سردار کینہ کم کرو
چھوڑ دو غصے اور بغض کو
راہ سے ہٹ کر بے راہ نہ چلو
(کہ) بے راہ چلنا گردن توڑ ہوتا ہے
آج رندوں کو جا کر لڑاؤ گے
جب رند اور لاشاری ٹکرائیں گے
تو جیسے پانی بند سے ٹکراتا ہے
یہ ایک دوسرے کو فصل کی کٹائی کی طرح کاٹ ڈالیں گے

مگر جس وقت بھی ہنگامی صورت حال میں قبائلی ہیرارکی ٹوٹ جاتی ہے اور جمہوری کے بجائے کسی بھی فرد کا ویٹو لگ جاتا ہے تو پھر بڑی تباہی آجاتی ہے۔ ماقبل فیوڈل دور میں شجاعت و بہادری کا فوری وحتمی اظہار سر کاٹنے یا کٹوانے میں ہوتا ہے۔ آپ بہادر سے بہادر اور مدبر سے مدبر شخص کو بھی محفل میں بزدلی کا بس طعنہ ماریں، اور اُس کے بعد جس طرح کی بھی جنگ چھیڑنا چاہیں

اُس شخص کا ووٹ جنگ کے حق میں ہی ہوگا۔ جنگ باز وجری بیورغ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ سردار چاکر کو معمولی بات پہ جنگ جیسی ہولنا کیوں سے خبردار کرتے ہوئے حملے سے روکنے کی عاقلانہ کوششیں کررہا تھا کہ، اپنے اشرف وانسانی دلائل سے جنگ کی المنا کی کو دُور ہانک رہا تھا کہ میرآن جیسی بھاری شخصیت نے ہلکے پن کی انتہا کردی؛

چندھی بٹاکی رپتغاں
جاڑو او ریحاں سگھ سراں
نامے جنانی گپتغاں
میراں مالمیں گال کپتہ
بیورغ گونڈلاں سہمینتہ
شلّیں نیزغ و کاٹاراں
ہندی آں مزں پریناں
برچھی آں ہر اسے داشہ
ہموذا کہ رؤوں دعوائی
چوشیں لنگوے گوں گیژوں
تیر دھوری ترا دیر داری

ترجمہ:

چند ڈینگیں مارنے والے بول پڑے
سب سے بڑھ کر جاڑو اور ریحان
عورتوں کا نام لے لے کر عہد کیا
بڑے شان والا میران بولا
بیورغ تیروں سے سہم گیا ہے
چمک دار نیزوں سے، خنجروں سے

چوڑی تلواروں سے،

برچھیوں نے اسے خوفزدہ کردیا ہے

ہم جہاں جنگ کریں گے

ایک ڈومب ساتھ رکھیں گے

جو تمہیں تیرکش کے فاصلے سے پرے رکھے

اللہ اکبر! ایٹم بم گرادیاناں؟۔ اشتعال انگیز جملے کاٹ ڈالتے ہیں۔ اُن کی ہلکی اور طفلانہ نعرے بازی کام دکھا گئی۔ قبائلی اجتماع کے اندر یہ مہلک تیر تھا جو بیورغ کی غیرت کا سینہ چھلنی کر گیا۔ ....اور یہاں بیورغ مست توکلی نہ بنا، بزدلی دکھا ہی گیا۔ مست جیسا بہادر ہوتا تو تین صلواتیں بھیجتا برادرکشی پر، اور پورا منظر نامہ بدل دیتا۔ اُس کی عقل کو شکست ہوگئی، اس کا خرد لڑکھڑا گیا، فہمیدگی خاک آلود ہوگئی۔ مغز کی جگہ حرام مغز نے لے لی، بیورغ ایک ہلکے طعنے اور نعرے کے سامنے ہتھیار ڈال گیا۔ اُس کے کامن سینس نے دغا دی۔

وہ غصہ سے آگ بگولہ ہوگیا۔ چاکر کے راستے سے ہٹا۔ اور مصمم انداز میں کہا؛

سوغند مس گرانیں زڑتغاں

نامے جنانی گپتغاں

بیائیں سروغانے مناں

ترجمہ:

میں نے بڑی سوگندیں کھائیں

محترم عورتوں کا نام لے کے قسمیں کھائیں

(کہ) اب جنگ میں تمہاری راہنمائی ہی میں کروں گا

اور جب بیورغ امن کا جھنڈا پھینک چکا تو پھر سارا فیصلہ آگ و آہن کے ہاتھ جا چکا تھا۔ اب کون تھا جو گھائل فاختہ کی چارہ گری کر پاتا؟۔ جب بیورغ جانتے بوجھتے بھی جنگ دیوتا کا چیلا بن گیا تو پھر عزرائیل سے نرمی کرنے کی امید کیا ہوسکتی تھی۔ بلوچ دانشور چاکر پہ تنقید کرتے ہیں۔ مگر

میری نظر میں بیورغ کی زندگی بھر کی صرف اور صرف ایک بزدلی نے رندولاشار کو شیر و شکر بننے کا موقع ہمیشہ کے لیے ضایع کر دیا۔ اور بزدلی بھی کیا حقیر بزدلی تھی۔ ایک طعنہ نے اس مدبر انسان کو مشتعل کر ڈالا۔ اشتعال میں آنے سے زیادہ بڑی بزدلی میں نے آج تک نہ دیکھی؛

ایذا گال کشہ بیورغا

مس کہ لیڑوی زاں بنداں

زاں بنداں پرے سردارا

رِندانہ برے میڑینئے

رنداں سرجمی آ بیار ئے

میرانا مناں پیدارئے

ماخ و تیغ زنیں لا شاری

اوذا کہ بروں دعوائی

آف و بنّوی ماناؤں

ہوشغ چھوف کنوں آپتی آ

میرانیں ہما درشکہ بر

(کہ) ژہ قندہار ہ گراں سوذاگر

(چاکر) لجاں بڑز تریں کوہے کش

دیریں تکّہ اے چم دیذ کس

ترجمہ:

تب بیورغ بولا

میں اُس اونٹ کی مانند ہوں جسے باندھ دیا گیا ہو

باندھا ہوا ہوں سردار کی وفا میں

رندوں کو لڑانے لے جاتے ہو

رندوں کو سلامت لا کر دکھانا

مجھے میران کو زندہ لا دکھانا
ہم اور تیغ زن لاشاری
جب باہم جنگ کریں گے
سیلابی پانی اور بند جیسے ٹکرائیں گے
ایک دوسرے کو فصل کی طرح کاٹیں گے
میران تو درخت کا وہ میوہ ہے
جسے قندہار سے سوداگر خرید لاتے ہیں
(چاکر) عصمتوں (عورتوں) کو بلند تر پہاڑوں میں لے جاؤ
دور دراز کے علاقے کا انتخاب کر

ایسی ہے دیدہ ور کی دور اندیشی۔ جب آپ پہاڑ سے پہاڑ کو ٹکرائیں گے تو زندگیوں کا بلیدان تو ہوگا۔ تہذیب کا تختہ تو الٹ جائے گا۔ سردار کی وفا اور اپنے قبیلے کی خیر طلبی میں بندھے اونٹ، بیورغ نے جنگ کی وسعت و تباہ کاریاں دیکھیں، بھانپیں۔ بستیوں کی تباہی تو لازم تھی۔ لج اور غیرت کو خطرہ تو تھا۔ مگر یہ اب کیسے ممکن تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو آریائی مہاجرتیں حملوں کی صورت اختیار نہ کرتیں، چنگیز و ہلاکو لائبریریاں نہ جلا پاتے۔ آباد (settled) بستیوں کو دوبارہ پہاڑ کی خیمہ والی زندگی کی طرف لے جانا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا کہ شہری زندگی کو غاروں کی آبادی بنانا۔ چنانچہ وہی بڑے بول بولنے والے براہندغ اُس کی اِس دور اندیشی کو بھی مسترد کرتے ہیں؛

ایذا گال کشہ میرآنا
نَیلوں جاگہہ و ماڑیاں
جؤ او بتلغیں شاہ جوآں
دوست مئے کیغدیں ماندا بنت
ماندا بنت پرے ماڑی آں

ترجمہ:

یہاں میران بول پڑا
ہم اپنے بنگلوں محلوں کو نہ چھوڑیں گے
بہتے پانیوں کو، نہروں کو
ہماری نازک عورتیں اداس ہو جائیں گی
اداس ہو جائیں گی اپنے محل و ماڑیوں کے لیے

ضدی چاکر اپنی افواج نلی لے گیا۔ اسی لیے یہ جنگ 'نلی جنگ' کے نام سے مشہور ہے۔ مگر، یہاں جنگ کا پانسہ سمجھو پہلے ہی پلٹ چکا تھا۔ اس لیے کہ جنگی حکمتِ عملی کے تحت دشمن قبیلہ لاشاری پہلے سے درہ کی بلندیاں قبضہ کر چکا تھا۔ اب راستہ کیا تھا؟۔ پیچھے تو ہٹ نہیں سکتے تھے۔ سیدھا بلندی چڑھنا اور دشمن سے دو دو ہاتھ کرنا ہی واحد انتخاب تھا۔ جنگ کا یہ منظر نامہ ہی رند کے خلاف تھا۔

زند گوں سیالی جھیڑواں
کل گوں کفوچی تو پکاں
بلان و شیرازی لڑاں
کوہاں وگینڈی اسپراں
تاسیں رخیف ودورواں
پٹیں قباہ و شدواں
پاذگوں لعلیں موزغاں

ترجمہ:

دشمنی کے جذبات سے بھرے رند
تیر کمانوں سے لیس
شیرازی شمشیریں لیے
گینڈے چمڑے سے بنی ڈھالوں سے

کانسی سے بنے رکابوں میں پاؤں ڈالے
ابریشمی قباؤں دستاروں کے ساتھ
احمریں موزوں کے ساتھ

روشا کہ مچا رے بڑتہ
جنگ بادشا ہی مچشہ
رند او وبہان ژل بثیغاں

ترجمہ:

سورج ذرا طلاع ہوا
بادشاہوں والی جنگ چھڑ گئی
رند اور اُن کے گھوڑے لپکے

اور............

اوذا حذا قہر آتکغا
وہشیں دنیا جور بثیغاں
جنگ کثو مانا تلغاں

ترجمہ:

وہاں سمجھو خدا قہر میں آچکا تھا
میٹھی دنیا زہر کی طرح تلخ ہوگئی
جنگ زوروں پر تھی

کہتے ہیں کہ اس جنگ میں تیس ہزار سے زائد بلوچوں نے حصہ لیا۔اور پھر جنگ ہوئی، تباہی ہوئی۔رند بڑی تعداد میں مارے گئے۔

رند جثو نہ بھڑتغاں

میر ہان و بیو رغ کپتغاں

ترجمہ:

رند لڑتے رہے
میران و بیورغ گر گئے

میران رند مارا گیا۔چاکر کا خیال تھا کہ بیورغ بھی مارا گیا۔مگر بیورغ دراصل شدید زخمی انداز میں لاشوں میں پڑا ہوا تھا ۔ وہ گرتا پڑتا تیسرے دن رندوں کے پاس پہنچا جب وہ لوگ (بشمول اُس کے اپنے) مقتولوں کی خیرات دے رہے تھے۔عورتیں کھڑی ہوکر (رقص کے انداز میں) ماتم کررہی تھیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ گراناز جب ماتم کرتی دائرے کے جنوبی سرے پر آجاتی تو ڈھاڈر کی طرف غور سے نگاہ کرتی۔ چاکر نے دیکھ لیا۔اس نے اُسے کہلا بھیجا کہ بیورغ صرف تمہیں پیارا نہ تھا، وہ ہم سب کی آنکھ کا تارا تھا، اس طرح ڈھاڈر کی طرف نہ دیکھو۔دوسری بار گراناز پھر ذرا سی رکی اور ڈھاڈر کی طرف دیکھنے لگی۔چاکر نے پھر کہلا بھیجا کہ اگر تیسری دفعہ بھی ایسا کروگی تو بہت برا ہوگا۔مگر تیسری دفعہ بھی گراناز نے ایسا ہی کیا اور زور سے بولی: ”مجھے یقین ہے کہ وہ دُور بیورغ آرہا ہے“۔

چاکر نے گھڑسوار بھیجا۔وہ واقعہ زخمی بیورغ تھا۔

میراں پڑا پرنیتیش
اوذا ماں نلی ئے گٹاں
گوں ہو صذ بنگلیں ورنایاں
عومر غمزدیّا گڑتہ
بیورغ ٹپیا آتکہ

ترجمہ:

میران میدانِ جنگ میں مارا گیا
وہاں نلی کے کٹھن علاقے میں

سات سو جواں مرد جوانوں کے ساتھ
عومر غمزدہ لوٹا
بیورغ زخمی حالت میں

بس میں آخری تین مصرعے ان کی ڈار سے علیحدہ کرتا ہوں کہ اُن تین مصرعوں میں اُس نا قابلِ بیاں پشیمانی اور غم کا اظہار بہت وزنی ہے، اُسے علیحدہ درج کرنا ضروری تھا؛

چاکر غم زذیا گڑتہ
پہ ہمو چوٹویں میرانا
راستیں دست وثی بھوریتوں

ترجمہ:

چاکر غمزدہ لوٹا
خوبصورت بالوں والے میران کی موت سے
میں نے اپنا دایاں ہاتھ توڑ ڈالا

چاکر کی تو گویا کمر ہی ٹوٹ گئی۔ قبائلی انا اور بے سمجھ ضد وہ شکست کھا گئی۔ چاکر اعظم کے دست و بازو ٹوٹ گئے۔ وہ ایک زخمی شیر کی طرح اپنے زخم چاٹنے لگا۔.......... بہادر، دیدہ ور اور پر بصیرت عزیزوں کی موت مار دیتی ہے!!

****

شَلی و حسن مولانغ

Shali O Hasan Maulanagh

رند کا عہد مکمل طور پر ایک حیرت کدہ تھا۔ اب آپ دیکھیں کہ پورے عالمی کلاسیک میں بھلا آپ کو کوئی کردار ایسا بھی ملے گا جس کی وجہِ شہرت صرف اور صرف محبتیں کرنا ہو؟۔ بھئی کیوپڈ ''محبت کا دیوتا'' کہلاتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں بھی تالاب میں نہانے والیوں کے کپڑے چرا کر درخت پر چڑھنے والا (تا کہ اُن عورتوں کو برہنہ دیکھ سکے) بھی ایک دیوتا ہے۔ بلوچ کے ہاں دیوتا والی بات تو موجود نہیں۔ البتہ بلوچی کلاسیک میں ایسا شخص موجود ہے۔ نہیں نہیں بیورغ نہیں، اس لیے کہ وہ تو اور بھی بہت سی خصلتوں اہلیتوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ صرف اور صرف محبتیں کرنے کے لیے شہرت پانے والے مست ولا پرواہ ولا ابالی نوجوان کا نام تھا، حسن رند۔ کثیر التعداد معاشقوں کی وجہ سے اس کا نام حسن رند کے بجائے حسن 'مولانغ' پڑ گیا اور 'مولانغ' بولتے ہیں ایسے شخص کو جس کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو، جو بہت زیادہ نارمل نہ ہو، جو زمانہ سازی نہ کرتا ہو، جو اپنے من کا مالک ہو۔

یہ تین بھائی تھے: حسن، ہارین اور محمد۔

اُدھر شَلی نامی ایک مہیری عورت بہت الھڑ، مست، شوقین اور بے خطر عورت تھی۔ وہ بہت مالدار خاتون تھی۔ اُس نے جب حسن مولانغ کی وجہِ شہرت سنی تو اُسے شاعری میں یوں پیغام بھیجا:

دُریں   شلی   آ   گال   کشہ
اِشاں   حسنا   سر   کنیں
وہاویں   تہ   ہاغہ   اِش   کنیں
کپتئے   منی   موڑیں   دلا
گرنچ   بیٹھو   ایرہ   غیئے

ترجمہ:

دُر جیسی شلی نے کہا
میرا پیغام حسن تک پہنچاؤ
اگر وہ سویا ہو تو جگا کر سناؤ
تم میرے موجی دل میں سما گئے ہو
گرہ بن کر، نکلتے ہی نہیں

اب بتایئے۔ آگے میں آپ نہیں کہ اگر، مگر، چونکہ چنانچہ کا صرف ونحو کرتے پھریں گے۔ ارے یہ تو حسن مولانغ ہے۔ ہول ٹائمر ہے محبت میں۔ حُسن کو حُسن کی چیلنج نما دعوت مل گئی۔ اُس نے مسافت نہ دیکھی، گرمی سردی کا نہ سوچا، رقیب اور دشمن کی پرواہ نہ کی۔ بس حسینہ کا پیغام ہی کافی تھا۔ حسینہ جو اُس نے دیکھی نہ تھی۔ بس اُس کے بارے میں سُن رکھا تھا۔

حسن تیار ہوا تو اس کے بھائیوں نے اس کی منتیں کیں کہ نہ جائے۔ بستی کی دوسری عورتوں نے بھی اسے روکا، اپنی دوستی کی پیشکش کی:

آں   یک   شلی   ما   صد   شلی
اڑما   شلی   چے   آ   گہیں

ترجمہ:

وہ ایک شلی ہے تو ہم سو شلی ہیں
شلی ہم سے کس بات میں بہتر ہے

مگر حسن دلیل درخواست کچھ نہیں مانتا، آپے میں جو نہ تھا۔ وہ انہیں یوں جواب دیتا ہے:

شوا   صد   شلی   آں   یہ   شلی
کلاں   گہیں   درّیں   شلی

ترجمہ:

تم سو شلی ایک طرف، وہ ایک شلی ایک طرف
تم سب سے اچھی ہے پیاری شلی

اب اور کیا کیا جائے؟ ۔ اُسے تو عشق کا نشہ چڑھ چکا تھا۔ جب سب دلائل ناکام ہوئے تو عورتوں نے اُسے لالچی ہونے کا طعنہ دیا کہ وہ شلی کے مال پہ نگاہ رکھتا ہوگا:

لوغئے   لحیف   اش   چاڑ   دہاں
بگئے   جھروٹیں   گیشتراں
گیوار   تو   دیر   ا   چَراں
ناما   حسن   رند   ئے   چَراں

ترجمہ:

اس کے گھر میں چودہ لحافیں ہیں
اس کے نوجوان اونٹ زیادہ ہیں
الگ کر کے چَرتے ہیں
حسن رند کے نام سے الگ چرتے ہیں

مگر حسن مولانغ پر کوئی حربہ کوئی گُر نہیں چلتا۔ وہ سر کی ایک جنبش سے سارے دلائل، سارے حربے مسترد کرتا ہے، اور شلی کو یوں پیغام بھیجتا ہے:

کایان   و   کایاں   مس   شلی
نادیغیں   بیلی   منی
براثاں   پہ   منت   داشتغاں
سیالیں   جناں   پہ   موہڑی

رندیں جناں ہار وسری
تیغی منی تیغا بہ سج
موچی منی کوشاں بہ دوش
کتری منی جانئے گذاں
براثاں مس زیراں محمدا
بوراں گشینی مھلوا
عالی ئے زرمُشتیں لُڑا
مِہلو منی ''مول ہا ''سوہویں
مُول اژمہیرا دیر تریں
ہاریں براث مئیں کستریں
منی مہلوئے واغامہ گر
پیغام شلی ئے آتکغاں
پیغام و ہمبوئیں سلام
مناں داشنت رائی مڑدماں
مناں دیغرے سربیثغاں
مس ایوکا بان ورواں
پہ لالیں شلی ئے گندغا
مس گوں دَھہ بان ورواں
پہ درّیں شلی ئے گندغا
مس گوں صذہ بان ورواں
پہ دریں شلی ئے گندغا

ترجمہ:

میں آؤں گا، میں آؤں گا' شلی
اَن دیکھی محبوبہ میری
بھائیوں نے رکنے کی بہت سماجت کی
دور کی عورتوں نے طمع بھرے انداز میں
رند عورتوں نے ہار اور سر کی پیشکش کر کے
اے تلوار ساز، میری تلوار تیز کر دو
اے موچی میرے لیے جوتی سی دے
درزی میرے لیے لباس بنا دے
بھائیوں میں سے میں محمد کو ساتھ لوں گا
گھوڑوں میں سے مہلب نامی گھوڑی منتخب کروں
عالی کی چاندی کے دستے والی تلوار کو
میری مہلب مُولہا سے واقف ہے
مول مہیر سے ذرا دور ہے
ہاریں، اے میرے چھوٹے بھائی
میرے مہلب کی باگیں نہ پکڑ
شلی کا پیغام آیا ہے
پیغام اور پیار بھرے سلام
مجھے راہ گیروں نے پہنچائے
مجھے عصر کے وقت ملے
میں تنہا ہوں گا بھی جاؤں گا
لال شلی کو دیکھنے
میں دس ہو کر بھی جاؤں گا

اچھی شلی کو دیکھنے

میں سوہو کر بھی جاؤں گا

اچھی شلی کو دیکھنے

بلوچی کلاسیک اپنا روایتی موڑ یہاں بھی مڑتی ہے۔ کہانی یوں بڑھتی ہے کہ وہاں علاقے میں ایک اور حسن بھی تھا، جسے حسن موڈُو کہتے تھے۔ وہ شلی پہ عاشق تھا۔ اور بہت عرصے سے اُس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ مگر شلی اُس سے کوئی التفات نہ رکھتی تھی۔ اُسے اُس سے ہزار گنا اچھا محبوب ملنے کی یقین جو تھی۔ اُس نے اُسے دھتکار دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر دوستی کروں گی تو حسن رند سے ہی کروں گی۔

اب جب حسن موڈو کو حسن مولانغ کے سلام و پیام کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو وہ وِلّن ایک رات شلی کے گھر مہمان ہوا اور اُسے کہلوا بھیجا کہ ''میں حسن رند (حسن مولانغ) ہوں۔ رات کو آ جانا وصل کے لیے''۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ شلی نے نہ حسن رند (مولانغ) کو دیکھا تھا اور نہ حسن موڈو کو۔ تو کس طرح معلوم کرے کہ معاملہ حقیقی ہے اور اس میں کوئی سازش دھوکہ شامل نہیں ہے۔

عقل مند شلی نے مہمانی کے لیے دنبہ ذبح کیا۔ مگر لونڈی سے کہا کہ خود وہاں موجود رہ کر دیکھ لے کہ مہمان گوشت کھاتے کس طرح ہیں؟۔ لونڈی نے واپس آ کر رپورٹ دی کہ حسن نے گوشت تو کھالیا۔ مگر اس کے بعد اس نے ہڈیاں ایک ایک کر کے چبالیں۔ شلی کو اندازہ ہوا کہ حسن رند (مولانغ) یہ حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ اس نے لونڈی کو حکم دیا کہ رات کو شلی بن کر حسن کے ساتھ رہے۔ لونڈی نے تعمیل کی اور رات اس کے ساتھ گزار کر صبح سویرے واپس ہوئی۔ جب دن ہوا تو حسن موڈُو نے شلی کو پیغام بھیجا کہ ''تم تو کہتی تھیں کہ صرف حسن رند کے ساتھ دوستی کرو گی۔ رات کو تو میں تھا تمہارے ساتھ۔ اب بتاؤ''؟۔

شلی نے جواب بھیجا ''اگر تم حسن رند (مولانغ) نہ تھے تو میں بھی شلی نہ تھی۔ میں تو رات کو ہی تمہیں پہچان گئی تھی جب تم گوشت کھانے کے بعد کتوں کی طرح ہڈی چبا رہے تھے۔ تم رات کو میرے ساتھ نہیں، میری لونڈی کے ساتھ سوئے تھے''۔

پشیمانی اور ندامت بھرا حسن موڈو سخت غصہ ہوا اور قول دیا کہ وہ حسن رند (مولانغ) کو قتل کر دے گا۔

اب ہوا یوں کہ اُس طرف سے حسن رند (مولانغ) اپنے بھائی محمد کے ساتھ شلی سے ملنے آ رہا تھا اور اس طرف سے شکست خوردہ اور غصے سے بپھرا حسن موڈو جا رہا تھا۔ جنگ چھڑی اور حسن رند اپنے بھائی کے ساتھ قتل ہوا۔ جب شلی تک یہ جانکاہ خبر، پہنچی تو:

او ہو او افسوسا کناں

مولانغئے بورے برتیش

دڑدیں مروشی مس سرا

ساڑت پہ ہُلقانہ نوی

ساڑت پہ ہُلق و لو جھڑاں

ترجمہ:

اوھو اور افسوس کرتی ہوں

وہ مولانغ کی گھوڑی لے گئے

ایسا درد ہے آج میرے دل و دماغ میں

جو جُھلانے سے رفع نہیں ہوتا

جُھلانے سے ٹھنڈا نہیں ہوتا

اس نے ماتم کیا اور مولانغ کے لیے سیغ (سوگ) کر کے بیٹھ گئی۔ اس نے ہارین کو یوں پیغام بھیجا:

نوذاں منی دروتاں بریں

ہارینہ تیغا سرکنیں

ہچ جہ تئی ھکل نہ ایں

میہی نریں روڑ بشغئے

پوڑی مس آفا کپتغئے

زالاں کہ شاروئے کئے

بستیں شلی آ جابھے

گیدی پہ یہ روش اے کئے

مئیں دست ہے کارا رسی

سیغی کثوں بھوف ریٹویں

نوزاں منی دروتاں بریں

ہارینہ تیغا سر کنیں

مولانغئے براث کستریں

تہ لوغا وروفسہ کنئے

ترامولا نغے گیر ہ نہ ئیئے ؟

ترجمہ:

بادلو میرے درود (سلام و پیام) لے جاؤ

ہارین کی تلوار کو پہنچاؤ

کہیں بھی تمہاری آواز، تمہارے نعرے نہیں؟

بھینس کے نر بچے ثابت ہوئے ہو

مٹی کا ڈھیلا بن کر پانی میں گر گئے ہو

عورتوں کو اگر جنگ کرنے کی اجازت ہوتی

تو شلی سنبھالتی تیر کمان

اور ساری دنیا کا صفایا کرتی

میرے بس میں تو یہی کچھ ہے

کہ خوبصورت گدیلا سوگ میں لپیٹ کر رکھا ہے

بادلو میرے درود لے جاؤ

ہارین کی تلوار تک پہنچاؤ

مولانغ کے چھوٹے بھائی

تم گھر میں کھاتے سوتے ہو

تمہیں مولانغ کی یاد نہیں آتی ؟

اللہ کی پناہ، خدا کی امان۔ یہ الفاظ تو نہیں ہیں یہ تو زہر میں بجھے تیر ہیں جو ایک مقتول بھائی کے دل میں پیوست ہو کر انتقام کی آگ کو آکسیجن دیتے ہیں۔ ہارین پہلے بھی کیا کمی کر رہا ہوگا اپنے بھائی کے خون کا انتقام لینے میں؟ مگر اب شلی نے آگ پر تیل چھڑک دیا۔ اس طعن و تشنیع کا جواب ہارین یوں دیتا ہے:

نوزاں منی دروتاں بریں

زریں شلی آ سر کنیں

گوش دار مہیری ئے جنک

مولانغئے سیغا شموش

لال بمبویں جیغا بہ دوش

چتر ئے دہیں روش ماں گزنت

بورچندنیں زینا سہنت

گڈّا منی حال بی ترا

ترجمہ:

بادلو میرے درود لے جاؤ

لے جا کر شلی کو پہنچاؤ

سنو، اے مہیر کی لڑکی

مولانغ کا سوگ بھول جاؤ

بہت ہی خوب صورت کشیدہ کاری کا لباس سی لو
چتر کے دس دن گزرنے دو
چندن گھوڑے زین سہہ لینے کے قابل ہو جائیں
تب تمہیں میری خبر پہنچ جائے گی

اور یہی ہوا۔ ہارین ساون کے غصیلے بادلوں کی بجلی بن کر دشمن کے نشیمن پہ جاٹکرایا اور اپنے دونوں بھائیوں، حسن مولانغ اور محمد کے انتقام میں سو آدمی مارڈالے اور شلی کو پیغام بھیجا (کہانی کا حسن تو شاعری پڑھ کر آپ محسوس کریں گے):

نوذاں منی دروتاں بریں
زریں شلی آ سر کنیں
شاریں سری آ کس سرا
لال بمبوے کس مس گرا
مولانغئے سیغا پروش
مس پہ حسن مولانغا
موڑ دانغئے مڑدم کشہ
گیست پہ کسائیں محمدا
جنگاں جہاں جہینتہ نیئے
گیذی پہ یک روشہ نہ وی
ہیراں ہماں مڑدہ کناں
کہ مولانغے وہاوا نہ بیث
مولانغئے ترکی بروت
گیرنت مناں ماں نیم شفاں

ترجمہ:

بادلو، میرے درود لے جاؤ
لے جا کر شلی کو پہنچا دو
کشیدہ کی ہوئی شال پہنو
خوب صورت پوشاک زیبِ تن کر لو
مولانغ کا سوگ ختم کر لو
میں نے حسن مولانغ کے لیے
ایک انگلی کا ایک آدمی مار دیا
بیس چھوٹے محمد کے انتقام میں
جنگوں سے پوری دنیا تو ختم نہیں کی جا سکتی
ساری دنیا ایک دن میں قتل نہیں کی جا سکتی
(البتہ) صُلح وہی لوگ کر سکتے ہیں
جنہیں خواب میں مولانغ نہ آتا ہو
مولانغ کی تاؤ دار مونچھ
مجھے آدھی رات کو بھی یاد آتی ہیں

دل مَلخ

Dilmalikh

بلوچ کلاسیک میں دل مَلخ کا ذکر پشیمانی کے ساتھ، افسوس کے ساتھ، احساس زِیاں کے ساتھ آتا ہے۔ وہ ایک مجسم بلوچ تھے، شکار و عشق و جنگ و شاعری کے دلدادہ۔ وجاہت میں کوئی ثانی نہیں۔ یہ لاجواب رند نوجوان جوئے بازی کی بری لت میں پڑ گیا۔ اور آہستہ آہستہ بہت ہی دولت مند دل مَلخ کنگال ہو جاتا ہے۔ اپنی مال املاک ہارتا رہا۔ اُس کی زندگانی کا صرف مندرجہ ذیل حصہ وقت کی تباہ کاریوں سے بچ سکا۔ اس کے لیے ہم انسانی یادداشت اور اس یادداشت کو دوسروں تک منتقل کرنے کی جبلت کے شکر گزار ہیں۔ درج ذیل شاعری میں تین چار مصرے اب بھی عام محفلوں میں ضرب المثل کے بطور استعمال ہوتے ہیں:

شرطاں ملُوکیں دل ملخ
پچھ آرغ ءِ رہنا بڑتہ
براتی پیانی میڑواں
دیما او رِندی دیرواں
رندی جن اِش ناخو کناں

داس ءَ مس دستان ءَ دیاں
ریما ملوکیں دل ملخ
بُرّی پہ ریش ایں ڈڈواں
نیں بلّاں منی پاذ موژغیں
تاسیں رخیف و دورواں
ماں پیش ایں سواسال زوم گرینت
مناں قدروں کمیتانی نہ اث
ماں داشہ پہ سُنیں پیشغاں
اے نگلیں بھیڈی بیاں
رنداں ھذا لاشار نہ خاں

ترجمہ:

جوئے بازی نے بہت ہی اچھے دل ملخ کو
پہچاننے کے قابل نہ چھوڑا
قبیلوی اجتماعات میں شرکت کے قابل نہ چھوڑا
رندوں کی بستیوں کے اجتماعات کے قابل نہ چھوڑا
رند عورتیں اسے چاچا کہتی ہیں
اس کے ہاتھ میں درانتی پکڑا دیتی ہیں
شہزادہ جیسا دل ملخ
گھاس کاٹے ریش شدہ گھوڑیوں کے لیے
اب رہنے دو کہ میرے موزوں والے پیر
بھول جائیں کانسی کے بنے رکاب کو
اور مضری کے بنے معمولی پاپوشوں میں گھسٹتے رہیں
میں نے تازی گھوڑوں کی قدر نہ کی

میں نے انہیں ویران حرکتوں میں گنوا دیا
میرا سارا مال و متاع پانسے کی نذر ہو گیا
(مصمم توبہ کے بطور) رندوں کو خدا کبھی لاشار نہیں کرتا

....

قول، اور جاڑو کا قول

چاکرا روشے بیر ! وتی گپتہ
(کہ) ماں پڑا جنگی بیں ملوک کُشتہ
ہانسکار گُلانی گرا گوئستہ
اِنھو براھند غ !تئ کُشائیتیں
مائیا سوبانی مُباہ داتیں
اغ منی براھند غ اَت تئ برات اَت
کم اَنت ژا زڑدا تئ امیر ینا
بانسکہ بھورینی وثی راستیں
مائیا میشے کُشتہ مہمانی !!
وھڑد گوں راضی بیں دلا داشئے !
نچ گوں میریں چاکرا نیا ستئے !
گِند نواں میر کہ خاطرا کوئی
ماں دلا بیاری حاجتے دروہیں
گوئستگ انت جُگ او بیثغنت فانی
دانکو داں زندغیں نام بلوچانی
جنّتا باشئے نیک زنیں نیا نڑیں
خوش اَنت مہمان و سوب کلانی
سیریّا جواناں لاف نر ازانی
نوخیا جانئے جرّ گنوخانی

ترجمہ:
چاکر نے ایک روز اپنا بدلہ لے لیا
میدان میں جنگباز ملوک کو قتل کیا
جان بوجھ کر گھروں کے نزدیک سے گزرا
ارے نہیں ساتھی تمہارا مروا دیا
خاتوں کو فتح کی خوشخبری سنائی
اگر وہ میرا ساتھی تھا تو تمہارا بھائی تھا
تمہارے امیری.......سے کم ہے
اپنا ہی دایاں بازو توڑ ڈالا
خاتون نے مہمانی میں ایک دنبہ کاٹا
خوش دلی کے ساتھ کھانا کھلایا
بیٹا میر چاکر کے ساتھ بٹھا دیا
دیکھنا کہیں میر خاطر تواضع سے گریز کرے
اپنے دل میں دھوکے کی حاجت لائے
زمانے بیت کر فانی ہوئے
جب تک بلوچوں کا نام زندہ رہے گا
جنت میں جاؤ اے نیک زن عزیزہ
مہمان خوش ہے اور فتح سب کی
جوان مردوں کے پیٹ بھرے ہونے بہتر ہیں
منچلوں کے جسم کی پوشاک نئی اچھی ہوتی ہے

نوذبندغ

Nozbandagh

ہم جنگ وجدل وجہد وجہندم سے ذرا ساہٹ کرآیئے بلوچ کے اُس Shivelrous دور کے ایک اور کردار کا ذکر بھی کرلیں: سخی نوذبندغ کا۔ چاکر کا بھانجا تھا، اس لیے شاعری میں اس کی ماں کا نام ملے گا، باپ کا تذکرہ نہیں۔ چاکر کی اِس بہن کا نام مذی تھا۔

نوذبندغ نے سخاوت کو اپنی وجہ شہرت بنالیا تھا؛ مہمان نواز، مددگار۔ ایک بار جب وہ چاکر سے ملنے سبی آیا تو چاکر نے اس کی گھوڑی کا خورجین اشرفیوں سے بھر دیا۔ نوذبندغ نے شہر سے نکل کر خودجین کے ہر ''تنگ'' میں چھوٹا سا سوراخ کر دیا۔ اشرفیاں فاصلے فاصلے پہ گرتی گئیں۔ گنداواہ تک پہنچتے پہنچتے بھرا ہوا خورجین ''گھوسٹ خورجین'' رہ گیا۔

اس کا ذکر ہم اس لیے بھی کر رہے ہیں کہ اس کے تذکرے کے ساتھ ایک لولی (لوری) بھی موجود ہے جو اس کی ماں سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ اُس نے اپنے بیٹے کے لیے کہی تھی۔

یہ ماسٹر پیس ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

لو لی لول کنا ں بچا را

زیری ہر ششیں ہتھیاراں
زہم وتو پک وکا ٹاراں
ڈھال و اسپر و امبا چاں
ماں جنگئے ساہتاں جوریناں
گوں زہماں تہ وثار سر ساکن
ناما بل پذی آوٗ ماں
لولی لول مئیں ساہارا

ہیل بنت پہ تئ شارو آں
سیالی گھسوو مارو آں
کاڈ پہ بر نگلیں قولی آ
لولی لول منی بچارا

اے مئیں گوئشتغیں دُر ماثی
جنگہ ساہتاں گرمیناں
روشے پکرئے چاکرا
لولی لول کنا بچارا

ریحان

Raihaan

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ چاکر سبی وشوران میں مستقل طور پر رہتا تھا، شان وشوکت میں، آرام وبادشاہی میں ۔مگراُس زمانے کی شاعری بتاتی ہے کہ حتمی طور پر ایسا نہ تھا۔اگر جنگ و جدل کی مسافرتیں نہ ہوتیں تو، وہ موسموں سے لطف اندوز ہونے آگ برساتی گرمیوں والے سبی سے کسی صحت افزا مقام کوضرور چلا جاتا تھا: مع پورا قبیلہ۔

اسی طرح کا ایک طویل شیئر ریحان کا ہے۔ایک خوب صورت تاثراتی شاعری جس میں وہ اِس طویل وکٹھن سفر میں شامل اپنی نازک محبوبہ کا حال بیان کرتا ہے۔پتھریلا راستہ ہے بولان کا، بلندیاں ہیں، ندی نالے ہیں اورمحبوبہ پیدل ہے۔محبوبہ نے کمر دوپٹے سے کس کر باندھ رکھی ہے، جب پسینہ بہنے لگتا ہے تو اُسے کشیدہ کیے دوپٹے کے کنارے سے خشک کرتی ہے۔لُو اور گرمی، سفر اور تھکان، محبوبہ کا چہرہ انار کی طرح سرخ ہوجاتا ہے۔

ریحان کے لیے گڑا گڑانے کا ایک اور سبب بھی ہے۔اور وہ ہے اُس کی محبوبہ کی دوری۔ بڑے بلوچستان میں ایک چھوٹے سے قافلے کو تلاش کرنا، اُس قافلے سے اپنی محبوبہ کو ڈھونڈنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔وصلِ یار مشکل سے مشکل تر بن جائے تو عاشق تو دُہائیاں دے گا ہی:

حال مناں نوخئے بیگھئے بیشہ
وث مناں دوستیں مڑدماں داشہ
(کہ) چاکرا نوخیں وسوسے گپتہ
چاکرا لڈّی وڑّ تے بیشہ
چاکرہ لڈّی روَ حراسانا
چاکرہ روَ ثو باڑت منی دوستا
باڑت منی زنزیر مہپریں لعلا
باڑ توپئے کوہ و کلشنڑاں رولی
کئے ترا کوہ و کنڈغاں پولی

ترجمہ:

مجھے چاند کی پہلی تاریخ کو خبر ملی
خود مجھے قریبی دوستوں نے دی
کہ چاکر کو ایک نئی خانہ بدوشی کی سوجھی ہے
چاکر کو نقل مکانی کی سوجھی ہے
چاکر یہاں سے خراسان جائے گا
چاکر جائے گا اور میری محبوبہ کو لے جائے گا
لے جائے گا میری زنجیر زلفوں والی لعل کو
لے جائے گا کوہ ودلدلوں میں سے
کون اُسے درّوں چوٹیوں میں تلاش کرے

اب ایک فرمائش، ایک ہدایت نامہ:

چبواں دوشی دیر وہ موچی
چبواں دوشئے ! بزکن اِش پیزاں

پاذمنی دوستئے نرم و ناز لکاں
گوں کھیوانی ٹلھغا دوربں

ترجمہ:

اس کے لیے جوتے تیار کر موچی
جوتے سی دے، تلّا موٹی کر دے
پیر میری محبوبہ کے نرم و نازک ہیں
بیابانوں میں چلتے رہنے سے زخمی ہوں گے

محبوبہ تو پھر یہ کرے گی:

(کہ) مس وثی دو ستئے مھذواں سئ آں
یکبرے روئثو بھیرواں کاری
دراژ کنت حتی رتکغیں دستاں
گریھہ کنت کونجی کجلیں چماں!!

ترجمہ:

میں تو اپنی محبوبہ سے واقف ہوں
جا جا کے پھر پھیری لگاتی ہے
مہندی لگے ہاتھ دراز کرتی ہے
کونج جیسی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آتے ہیں

اوراب قافلے کی روداد، مسافتوں کا بیانیہ:

کونجی قطارے بستہ شئے لوکاں
دیم پرے بولانا گیا بینا
کسے پہ مولا و کوہِ مارانا

کڑدے پہ جلالی کنڈغہ بُڑز بی
او منی ساثانی گلیں گودی !!
(چوکہ) پیادغہ بیث گوں اَمسراں جُزی
سرینہ گوں شارئے پلوا بندی
ھیذ کہ شنز نتی بمبویں بریخان
گیڑتش گوں پالوشئے کناریغا

ترجمہ:

کونج کی قطار بناتے ہیں قافلے کے اونٹ
وسیع بولان کی طرف رواں دواں
کچھ مُولا اور کوہِ ماران کی طرف
کچھ جلالی درے کی چڑھائی چڑھتے ہیں
اے زیوروں والی میری ملکہ
وہ پیدل ہم جولیوں کے ساتھ سفر کرتی ہے
کمر کے گرد دوپٹہ باندھ لیتی ہے
پسینہ جب دراز زلفوں سے بہنے لگتا ہے
وہ دوپٹے کے کنارے سے سکھاتی ہے

محبوب، محبوبہ اور وصال کا واحد وسیلہ گھوڑی:

پیاذغہ ریحا نہ نیئے پیذاں
گلشنڑو کوہانہ نہ گوازینی
عقل اِت گارباث او کیغیدیں قولی
(کہ) دل بغیر دوستیا نہ گوازینی
سر بہ گرِ سرواں گڑدنیں سیاھی !

مَلّ مڑتہ اے ، تہ مس گراں تی یے
نیں اے ہورا مانہ مناں نیلی
کہ سنج ژا گُلیں مرکباں دراژں
بُرغ و نوخیں ٹاھغہ لوٹاں!
بُرغاں جلدی جوڑ کنت وستاد!
(کہ) گورمے ریحانہ نہ چارینی
نَیں بزومیشی اٹکلے کیشے
نَیں لٹہ زیری پہ گرِڑ دوئیں بگےّ
اونَیں کہ لاغریں جوڑائے بہا اینیتے
بیااِت مئیں جیڈی و سہیلی آں
اے منی سنِگیں بانڈوئے ھندں
ماں ڈل و سہر اَت آ ملوکانی
میح اشنت دِر کوخیں بہا نانی
صد برا ریحانا نوا وینا
سیاہ پئے کشکیں کپچھا تاتکیں
ماں دژمنیں مڑدانی دلہ پُشتا

ترجمہ:

ریحان ان علاقوں میں پیدل نہیں آئے گا
ان دلدل اور چٹانوں میں
تمہاری عقل گم ہو جائے اے اچھے انسان
دل تو دوستی کے بغیر نہیں رہتا
اے ہرن گردن گھوڑی رواں ہو جا

یہ گھوڑی مرگئی تو ایک اور خریدوں گا

....

گھوڑی کے سنج زیادہ لمبے ہیں
کاٹ چھانٹ کے دوبارہ ناپ کے مطابق بنانے ہیں
اے استاد انہیں جلدی ناپ پہ بنا
(کہ) ریحان تو گایوں کی چرواہی نہیں کرے گا
نہ اسے بھیڑ بکریوں چرانا آتا ہے
نہ وہ لاٹھی پکڑ کر اونٹ چرائے گا
نہ ہی وہ لاغر بیلوں سے کاشت کاری کرے گا
آؤ میری ہم عمر سہیلیو!
یہ میری نقل مکانی کے خیمے کے آثار ہیں

....

یہاں بدمست جوان گھوڑوں کی کھونٹیاں تھیں
سو بار نواب جیسا ریحان
اپنی سیاہ (گھوڑی کا نام) یہاں دوڑاتا
دشمن آدمیوں کے سینے پر

شہذاذ ومہناز

Shahzaz o Mahnaz

یہ بہت ہی غور طلب اور دلچسپ بات ہے کہ بلوچ کلاسیکل شاعری میں جتنی بھی خواتین کا ذکر آیا ہے، مثبت انداز میں آیا ہے۔ ہانی لے لیں، گوہر لے لیں، گراناز لے لیں، حتیٰ کہ شلی کو لے لیں، سب کی سب آپ کو مثبت کردار ادا کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ بہت ہی ممتاز حقیقت ہے۔

بلوچ کلاسیکل شاعری میں ایک خاتون کا ذکر بہت ہی احترام اور توقیر سے ہوا ہے؛ وہ خاتون مہناز ہے۔ یہ محترمہ بلوچ تاریخ میں عورت کی طرف سے ناانصاف سماج سے ٹکر لینے اور قبائلی نظام کی ناروائیوں سے مزاحمت کرنے کی علامت اور سمبل ہے۔ وہ سولھویں صدی کے بلوچوں کی قراۃ العین طاہرہ جیسی تھی۔ اس کی لازوال جدوجہد کو خوب صورت شاعری کے ذریعے امر کر دیا گیا۔ بلا شبہ قدامت پرست قبائلی نظام کے رسوم ورواج کی اندھیری کھائیوں میں روشنی کا اتنا بڑا مینار، اتنی بڑی ہیروئن وہی مہناز ہو سکتی ہے جس نے عظیم جدوجہد کے تلخ گھونٹ پیے ہوں، جس نے ایک خاموش، مفعول اور خفتہ انسان بن کر خود کو ظلم کی چکی کے حوالے نہ کیا ہو بلکہ بلند آواز سے، برملا اور بلا واسطہ اپنا دفاع کیا ہو۔ بلوچی زبان کے ماتھے پر مہناز کے متعلق شاعری ایک انمول، قیمتی اور نایاب جھلملاتا ہوا زیور ہے۔ یہ شاعری نہ صرف بلوچ کلاسیکل زمانے کی

تاریخی، ثقافتی اور سماجی حالتوں کی شاہ کار ترجمان ہے بلکہ یہ عورت ذات کی بڑائی، ہمت اور بہادری کا انمول نمونہ بھی ہے۔

محترمہ مہناز اپنے چچا کے بیٹے شہذاذ کی بیوی تھی، جسے میر چاکر کا بیٹا بتایا جاتا ہے۔ مہناز اُس کی دوسری بیوی تھی۔ مطلوب یہ ہے کہ اُس زمانے میں دو شادیاں کرنا قابلِ قبول تو تھا مگر ہمیں اُس عہد کے کسی دوسرے شخص کی ایک سے زیادہ بیویوں کا تذکرہ نہیں ملتا۔ میاں بیوی کی آپس میں بہت محبت تھی اور زندگی بہت حسین اور خوشگوار گزر رہی تھی۔ شہداد کا ایک لنگوٹیا دوست اومر تھا۔ دونوں ہم عمر دوست سارا سارا دن کھیل، شکار اور زمانہ بھر کی گپ شپ میں مصروف رہتے تھے۔ آس پاس کے قبائلی ماحول میں فیوڈل دیہات کے اشراف والی زندگی کی ساری ممکنہ نعمتیں انہیں میسر تھیں۔ یہ دونوں لاابالی جوان تھے۔ بھرپور زندگانی گزارنے والے بھرپور لوگ۔

اسی پر سکون پس منظر میں اچانک غلط فہمی کی قہر آلود دھند شہذاذ کی آنکھوں کو ڈس دیتی ہے۔ اور اسے اپنی بیگم محترمہ مہناز کی پاک دامنی پر شک ہو جاتا ہے۔ یہ جلد باز خاوند اپنی بیوی پر شبہ کر جاتا ہے کہ خدانخواستہ اُس کے تعلقات اُس کے اپنے جگری یار اومر کے ساتھ ہیں۔ وہ بغیر وجہ بتائے محترمہ مہناز کو ڈانٹتا ہے، غصہ ہوتا ہے۔ اور اسے بری طرح پٹیتا رہتا ہے۔ ع:

چابک چو مستیں لیڑھی داشئے

(تم نے مجھے بدمست اونٹ کی طرح چابک مارے)

اس ڈنڈے ماری کا محترمہ مہناز نے بہت برا منایا۔ اُس زمانے میں شاید عورتوں کو مارنا پیٹنا اس قدر مستحسن عمل نہ ہوا ہوگا۔ اس لیے وہ احتجاج میں کہتی ہے:

لٹوں چو مستیں لیڑوا داثیں
چابک چو بارگاھئے تلیں بوراں
چابک پہ کم ذاتیں خطائی آں
گیشتر پہ ٹیھ و مولدی چکا ں
نہ کہ پہ مہنازہ گلیں جانا

ترجمہ:

تم نے مست اونٹ کی طرح مجھے پیٹا
جیسے شہسوار گھوڑوں کو چابکیں مارتے ہیں
چابک ہوتے ہیں کم ذات لوگوں کے لیے جو گناہ کرتے ہیں
چابک تو غلام اور لونڈیوں کی اولاد کے لیے ہوتے ہیں
نہ کہ مہناز کی پھول جیسی پیٹھ پر برسانے کے لیے

آخری شعر غلام داری سماج کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے۔ اُن سے نہ صرف گھریلو کام کاج کروانا دستور تھا بلکہ انہیں ڈنڈوں چابکوں سے مارنے کا رواج بھی موجود تھا۔

اپنی حتمی بے گناہی کے باوجود وہ اپنے محبوب خاوند کی بھسم کر دینے والی بے رخی کا شکار تھی۔ شہداذ کی نفرت بھری آنکھیں، اس کا روکھا رویہ، اپنی شریکِ حیات پہ بے اعتباری کا اظہار محترمہ کے لیے جیتے جی جہنم کے عمیق ترین گڑھے کا عذاب بن گئے تھے۔ جہاں محبت ہی ساری کتاب، سارا اظہار، ساری خدائی ہوا کرتی تھی، وہاں اب نفرت کے سیاہ جھنڈے لہرا رہے تھے۔ رویوں نے رویوں کی جگہ لے لی تھی۔..........رویے، کانٹوں بھرے رویے، زہر آلود رویے، نظرانداز کر دینے والے رویے۔ زبانی اظہار کا تو، نہ محبت کی سلطنت میں گزر ہو سکتا ہے اور نہ ہی نفرت کے بے آب دشت میں۔ سلگتی تڑپتی مہناز بالآخر بات کرنے، بات سننے اور بات کی حکمرانی کے قیام کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ گفت وشنید اور دلیل ہی شاید نفرت کی ابلیسی منحوس خصوصیت کو سات سمندر پار جلاوطن کر سکے اور اُس کی محبت کی دیوی اُسے واپس کر سکے۔..........اور اگر مذاکرات ممکن نہ ہوں تو ایک غیر مشروط معافی ہی دوستوں اور محبوبوں کا چارٹر ہوا کرتی ہے..........اور مہناز ہر دور کے لیے تیار۔

آیئے دونا برابر، غیر مساوی طرفین کے مذاکرات کی تفصیل اور ان کے نتائج کے بارے میں، شیریں سخن ماہناز ہی کی زبانی سنتے ہیں:

تہ دہ گوں سئے چیار کنگریں زوارا
ژہ شکارانی پلوہ کا تکئے
مس دہ گوں سے چیار دست گہار جیڈی
کاتک و تئ چیا رراھہ سرانشتاں
دستے ماں میری موژغی پینزاں
دستے مس ملیے سیمریں واغاں
''ہر گنا ہے کہ ژہ دستِ مئیں بیثہ
بشکی پہ شاہیں قادرہ ناما
ژہ وثی سلطانیں سرہ ھیئرا
(کہ) بشک ژہ جوائیں مڑدماں رُستہ
گیشترا بور بشکیں کھیری آں

ترجمہ:

تم بھی تین چار گھبرو گھڑ سواروں کے ساتھ
شکار سے واپس آ رہے تھے
میں بھی تین چار سہیلیوں، ہم جولیوں کے ساتھ
آ کر تمہارے راستے پر بیٹھ گئی
میں نے ایک ہاتھ سے تمہارے موزے چڑھے پیر (معافی کے لیے) پکڑ لیے
دوسرے ہاتھ سے مَل نامی تمہاری گھوڑی کی رنگین چمڑے والی لگام تھام لی
''مجھ سے جو بھی خطا سرزد ہوئی ہو
قادرِ مطلق کے نام پہ معاف کر دو
اپنے سلطانی سر کے صدقے معاف کر دو
(کہ) معاف کرنا بہت بڑے انسانوں کی صفت ہے
خصوصاً 'کھیریوں' کی جوتی' کہ سواری کی گھوڑی بھی بخشش میں دے دیتے ہیں

اب اس سے زیادہ جھکنا اور کیا ہوتا ہے؟۔ قادرِ مطلق کے نام پہ معافی مانگنا، پیروں پہ ہاتھ رکھ کر گڑگڑانا، آباؤ اجداد کے وقار کا واسطہ دے کر معافی مانگنا............ بھئی عشق کے یہی دلربا قوانین ہیں۔ اپنی ذات تو کیا اپنی انا تک کو نیست و نابود کرنا۔ ماہناز! تم پاس ہو چکی ہو۔ اب آگے ظرف شہداد کا!!

چو نہ زانتئے کہ مڑدمے جوائیں
تہ کافری تیلا نکے مناں داشہ
مس شتو نشتنگاں پڈا کپتاں
مھپروں دنزو بیث زواذانی

ترجمہ:

تم نے یہ نہ جانا کہ اچھی انسان ہے
تم نے ایک کافری دھکا مجھے دیا
کہ میں پشت کے بل جا گری
(اور) میری معطر زلفیں خاک آلود ہو گئیں

استغفراللہ! ہیروشیما ہو گیا۔ ایسا ردِعمل تو ہم فیوڈل اذہان کے دل و دماغ میں بھی نہ آئے۔ اور کس قدر بھاری پن بیانیہ ہے ماہناز کا۔ سر کے بال بلوچ خاتون کے تقدس کی علامت ہوتے ہیں، انہیں خاک آلود کر دیا گیا۔ یہی بس نہیں، سُورِ اسرافیل تو ابھی بجنا ہے:

تہ وثی بوریں چادرہ پاندا
سئے چیار سُہریں اشرفی بوتکئے
تہ سہ اِیں مارا لیکثو داثاں
تہ پہ ثی خوشحالیں دلہ داثاں
ماپرے ناکا میں دلہ زڑتاں
زڑتو ثی شارئے پلوا بستاں
کہ نواں کہیو و لڈغاں گارباں

ترجمہ:

تم نے اپنی گراں بہا چادر کے پلّو سے
سونے کے تین چار سکے نکالے
تم نے گن کر مجھے تین طلاق دیں
تم نے یہ اپنے مسرور دل سے دے دیں
میں نے یہ ناکام دل کے ساتھ لے لیں
انہیں لے کر میں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ لیا
(کہ کہیں) میری لاابالیوں میں گم نہ ہو جائیں

یہ تھا حتمی، منطقی اور دلخراش نتیجہ۔ سچ ہے کہ مذاکرات مساوی لوگوں کے درمیان ہی منصفانہ ہو سکتے ہیں۔ مقتدر شخص کے ساتھ مذاکرات کا نتیجہ اُسی کے فیصلے پر عمل کرنے کی واحد صورت میں نکلتا ہے۔ چنانچہ زورآور نے اپنا فیصلہ سنا دیا، بہت ہی کھردرے اور بہت ہی نازیبا انداز میں۔

محترمہ مہناز اپنی یہ تذلیل واقعی زندگی بھر بھول نہ پائی۔ ایک معزز، محبوب اور باوقار بلوچ بیوی، اپنے خون، عقیدے اور وقار کی قسم کھا کر اپنی وفا کا یقین دلاتی ہے۔ وفا جو کبھی مشروط نہیں ہوتی، وفا جس کے کبھی مول نہیں لگ سکتے اور وفا جسے کبھی ناپا کبھی تولا اور کبھی گنا نہیں جا سکتا۔ اور پھر بلوچ کی وفا؟ اس کا کوئی اَنت، کوئی حد، کوئی سرحد اور کوئی افق نہیں ہوتا۔ اور اس اشرف المخلوقاتی لطیف، اور واحد جائیداد کی رکھوالی کرنے بلوچ عورت جس طرح لمحہ بہ لمحہ قربان ہوتی رہتی ہے، یہ اُسی کا حصہ ہے۔

محترمہ ماہناز تمام دنیاوی روایتوں اور پابندیوں کو توڑ کر اپنی سنگی سہیلیوں کے ساتھ اپنے ناراض محبوب شوہر کا راستہ روک کر اس کے دوستوں ساتھیوں کے سامنے اس کے پاؤں پڑ کر، گڑگڑا کر، رب کا واسطہ دے کر، ناکردہ گناہ کی معافی مانگتی ہے۔ مگر گھمنڈ اور تکبر سے لبریز اس کا فیوڈل شوہر، بغیر تحقیق و تصدیق کیے اس پر اتنا بڑا الزام لگانے کے بعد، وہیں اس مجمعے میں سرِعام اس کو دھکے دے کر گرا دیتا ہے اور مستی کے ہوش اڑا دینے والے نشے میں بدمست، اُسے طلاق

دے دیتا ہے۔ایسے انسان کو بھول جانا یا اُس کو اُس کے کیے کی سزا نہ دینا یقیناً بڑی بزدلی ہوتی۔اور مہناز بزدل خاتون ہرگز نہ تھی۔اس نے مڑکر لڑنے کا اٹل فیصلہ اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ لیا۔

کچھ ہی عرصہ بعد، جلد باز شہذاذ پر سے جب نام نہاد غیرت کے بچگانہ فیوڈل جذبات کی دُھند چَھٹی اور محترمہ مہناز کے اوپر لگائے جانے والے الزامات جھوٹے لگے تو محبت کا استحقاق مجروح کرنے والا شہذاذ بہت پشیمان ہوا۔اس نے خود ہی اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک، اور پرکشش مہناز کو دھکیل کر خود سے علیحدہ کر دیا تھا۔محترمہ مہناز کی روح کی جڑیں تک خاکستر کر دی تھیں۔اب مہناز کے پاس کھونے کے لیے بچا ہی کیا تھا۔اُس نے اُسی اومر سے شادی کر لی جس کے ساتھ اسے بدنام کیا گیا تھا ۔(اس کا یہ مطلب ہے کہ اُس زمانے میں طلاق کا رواج موجود تھا جو آج کے قبائلی دور میں نایاب ہو جاتا۔اسی طرح عورت، یا طلاق یافتہ عورت کو دوبارہ شادی کا اختیار بھی حاصل تھا)۔

اس اقدام سے مہناز نے شہذاذ کی فرعونیت اور غرور کو گویا مٹی میں ملا دیا۔اور یہ عمل اُس وقت کے بلوچ سماج کی مروج منفی قدروں اور مرد کی بالادستی کے خلاف جوابی جنگ میں چلایا جانے والا عورت کا پہلا کارتوس تھا۔جس کے جواب میں لامحالہ سابقہ شوہر نے کھوکھلے سماجی متبرکات کو حرکت میں لانا تھا۔چنانچہ بپھری ہوئی انا کے مالک، شہذاذ نے مہناز اور اومر کی شادی کو اپنے سابقہ الزام کے جائز ہونے کا ثبوت بنا ڈالا۔اس نے کہنا شروع کر دیا کہ اومر سے شادی کر کے گویا مہناز نے خود ہی ثابت کر دیا کہ اومر کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات تھے۔پشیمانی اور فیوڈل انا میں لپٹا ہوا شہذاذ اپنے اندر کے زخمی انسان کو یوں بیان کرتا ہے:

ڈومب منی رِندی گوشتغیں گالاں
برجہاں گھولیں بانکا سرکاں
تہ ہزار رِندئے بانکیں مہناز
بنوی کنڈئے شکلیں نوخاف
کہ چل ہزار رندگوں بارغیں بوراں
سرتئ لنگیں اومرا بیشہ

ترجمہ:

اے مراثی، میری رندوں والی شاعری کو
اُس 'جہاں گرد' خاتون تک پہنچا
تم اے مہناز! اے رندوں کی ملکہ مہناز
کھیت کے ٹوٹے ہوئے بند کی دراڑ کے درمیان میں ٹھہرے بارش کا شیریں تازہ پانی
رند قبیلہ کے چالیس ہزار گھڑسواروں میں سے
تمہاری نگاہ لنگڑے اومر پر ہی ٹھہر گئی

انتقام دیکھیے، رقابت دیکھیے، نفرت دیکھیے:

تئ اغہ اومرمں چرغاں دیشیں
یکے مں بڑدستاں یلو داثیں
کر گزو ریشوآں جغر بواڑتیں
تولغ و روفاسکاں رخندیثیں

ترجمہ:

تمہارا اومرا گر مجھے کہیں ملتا
میں اُس کے شانے کی ہڈی توڑ دیتا
(تاکہ) کرگس اور ریشو (کرگس کی ایک قسم) اس کا جگر کھاتے
گیدڑ اور لومڑ اس کی لاش نوچتے

اومر ہے کون؟ وہ کیسا لگتا ہے؟ مندرجہ ذیل اشعار پڑھیے اور عالمی ادب کنگھال کر دیکھیے کہ رقیب کو اس تذلیل کے ساتھ کسی اور نے بیان کیا ہے کیا؟

اومر چوا پتارے تلارانی
کہ راھکے ریسین انت کشا رانی
دست چوڈوئَ انت ڈلغانی

پاذ چو گشکور انت جنکانی
چم چولوھی انت تلا نگانی
لاف چوہڑ جینے نریانانی
سغر چودلّی وش گھڑیں دیزے
''پہ کروتانی'' گراذغا جوانیں
بانگھاں روث گوں بزگلی ٹولے
بیگھاں کیث گوں گندغیں جولے
پرشتغیں پاذئے لتراں کشی
مہناز، تئ پیش دارہ سرا ٹنگی
لُوفر و بیث تئ حیمہا پیہی
دستاں تئ لوغاڑیں گُرا شیفی
جیغہ گوں گوجی چنگلاں پٹی
دیر شنکے مس پنگھراں پکّی
اے لغور لالہ بھانکراں سکّی
دستہ ژہ لوغاڑیں سراچکّی
سرتئ چوشیں دریغ اے کلّی
مانہ کیث کوھیں باڈوہ سنگاں
ھوں پرے گیوارہ بہاں زغریں

ترجمہ:

اومر پہاڑی دروں کے لگڑ بھگڑ جیسا ہے
جسے فصلوں والے کسان بھگا دیتے ہیں
اس کے ہاتھ دلیہ تیار کرنے والے لکڑی کے چمچ جیسے ہیں

پیر بچیوں کی تیار کردہ کھردری چٹائی جیسے
آنکھیں جیسے چٹان پہ پڑے گڑھے ہوں
پیٹ جیسے گھوڑے کی خرجین
سر جیسے دِلی کے ناتجربہ کار کمہاروں کی بنی ہوئی دیگ ہو
جس میں ''کروت'' ہی پکایا جاسکتا ہے
ہر صبح بکریوں کے رم کے ساتھ جاتا ہے
شاموں کو منحوس چال چلتا ہوا لوٹتا ہے
آکر اپنے لنگڑے پاؤں سے پھٹی پرانی چپلیں اتارتا ہے
اور انہیں، تمہارے خیمے کی آگے والی لکڑی سے ٹانگ دیتا ہے
رینگ کر تمہارے خیمے میں داخل ہوتا ہے
ہاتھ تمہارے حسین گریبان میں ڈالتا ہے
گوح جیسے اپنے پنجوں سے تمہاری قمیص کے کشیدہ کیے ہوئے حصے کو پھاڑتا ہے
اور جب کوئی لیلا کہیں دور ممیاتا ہے
تو یہ بزدل تمہاری بانہوں سے خود کو محروم کر دیتا ہے
اپنا ہاتھ تمہاری زلفوں والے سر کے نیچے سے کھینچ دیتا ہے
اور تیرا سر لڑھک کر بڑی آواز کے ساتھ
خیمے کے پتھروں کے فرش سے لگ جاتا ہے
(اور) خون کی دھاریں تیرے گیسوؤں کی مانگ سے بہنے لگتی ہیں

بلوچی میں اس خوبصورت صنف کے بارے میں زیادہ تفصیلی بات کرنے سے کہانی گدلی ہو جائے گی۔ لہٰذا آیئے اِس شاعری کا اثر دیکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں وہ بہادر بلوچ خاتون کیا کرتی؟ خاموش رہتی؟۔ اسی پتھر دل، ناقدرے اور جلد باز شہذاذ کے پاس اس کا منہ بند رکھنے کی دوبارہ درخواست لے جاتی، یا پھر پیروں فقیروں کے پاس شہذاذ کی زباں بندی کے تعویز

لینے کے لیے چکر کاٹتی پھرتی ؟!!

محترمہ ماہناز نے ان میں سے ایک راہ کو بھی نہیں اپنایا۔ اس نے نام نہاد دانش وری کا جواب دانش سے دینے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے جلی بُھنی شاعری کا جواب شاعری سے دینے کا فیصلہ کرلیا۔ شاعری بھی ایسی جو دل کی گہرائیوں سے نکلے، پکے اور صاف جذبات میں لپٹی ہوئی آئے......، بپھرتی ہوئی شیرنی کی گرج اور زخمی شدہ بھیڑیے کے غصے سے بھری اور کھری شاعری۔

اس نے اس کے الزامات کا بہت خوب صورتی سے جواب دیا۔ اُس نے شہذاذ کی عقل، تدبر اور فراست پہ طنز کے تیر برسائے۔ یہ موخر الذکر انداز بلوچی شاعری میں باقاعدہ ایک صنف بن گئی ہے جسے ''سٹغ'' کہتے ہیں۔ اور اس صنف میں محترمہ ماہناز شاید بلوچی کی سب سے ممتاز، مہذب اور مدلّل شاعرہ ہے۔ شہذاذ سے لاکھ درجہ مہذب جواب:

راہ گذاریاں ریث ہواں لوغا
مئیں سلاماں دیت میڑہ ورنایاں
دیت اش شواش ھذاذا ملوکینا
چاکرئے بھنگی قاہریں بچا
ناخزا شہذاذ خاں مڑایانی
تہ ژہ ثی کا رو پشغاں کپتئے
عیو کنئے نندئے تہ جن و جوذا
نشتغ و ٹوھوئے گراغانی

ترجمہ:

اے راہ گیرو! جب تم اس بستی میں سے گزرو
تو میرا سلام وہاں کے جوانوں کو پہنچاؤ
میرا سلام نازک شہداد کو پہنچاؤ
جو چاکر کا لاابالی اور ناترس بیٹا ہے

اے شہداد، اے میرے موتی جیسے کزن
تم اپنے کام دھندے سے رہ گئے ہو
بس بیٹھ کر عورتوں کی غیبت کرتے رہتے ہو
بس بیٹھے کوّوں کی چوکیداری کرتے رہتے ہو

اب ذرا عزت وتوقیر کا موازنہ کرتے دیکھیے:

مس تئی لو غاچترہ گوپتاں
نیں منی کلیے آسنیں میھاں
ہتغا ہر ذاتیں گذاں دوشاں
گُل منی بچی گوانزغاں پریں
یا جنکانی بمبویں جاداں
اغ ترا ما لیے نیستہا گپتہ
تہ رند ترا مال لوٹی دینت مالاں
مس ترا ہیڑتیں نوشگہ بشکاں
یابا نڑیا گوں بمبویں جاداں
مس ترا بشکا ں اغہ اومراش داثاں

ترجمہ:

جب میں تمہارے گھر میں تھی تو چٹائیاں بُنتی تھی
اب میرے خیمے کی مینخیں لوہے کی ہیں
میں اب ہر ہفتہ نیا لباس سلاتی ہوں
میرا گھر نرینہ اولاد کے پنگھوڑوں سے بھرا ہوا ہے
اور بچیوں کے گھنے بالوں کی جھالروں سے
اگر تمہیں دولت کی کمی لاحق ہے

تو رند تمہیں مانگنے سے مویشی دیں گے

میں تمہیں اپنا ننھا بیٹا ''نوشک'' بخش دوں گی

یا لمبی سیاہ بالوں والی بیٹی بانڑی

میں انہیں تمہیں بخشوں گی، اگر اومر اجازت دے

اب آگے دیکھیئے کہ عصمت پہ داغداری کا لزام لگائی ہوئی عورت کس طرح React کرتی ہے۔تہذیب کا دامن تھامے محترمہ ماہناز، شہداد کی زیادتیوں کا نقشہ خوبصورت انداز میں یوں کھینچتی ہے:

عقل چوکّلی اے چلکو خیں

مس شفا نکانی کوفغا دولیں

ھرمس وختا پاذغ اش ھشکیں

ترجمہ:

تمہاری عقل اس ادھ بھرے مشکیزے کی طرح ہے

جو چرواہوں کے کندھے سے لٹکتا ہے

پھر بھی اس کا ایک کنارا ہمیشہ خشک رہتا ہے

اب ذرا شہداد کی جانب سے اومر کی، کی ہوئی برائیوں کا جواب پڑھیے۔مہناز کس انداز میں اومر کی توصیف کرتی ہے، ملاحظہ ہو:

بذمہ گوئش دریں اومرائیں آ

اومرتہ سانڈی لیڑواں یکے

آنکو کپتہ ماذغی جھوکا

ژہ چوکاّں کڑکئی مہناز

موژشہ گوئزمی بارغیں سرینا

ترجمہ:

(شہداد) میرے ہیرے جیسے اومر کو برا نہ کہو

اومر تو اونٹوں میں ایک سانڈ ہے

جو اونٹنیوں کے گلے میں گھس آیا

اور (اس نے) نوخیز عورتوں میں سے مہناز کو چن کر الگ کیا

(اس کی) بھڑ جیسی پتلی کمر کو گلے لگا فرحت پائی

صرف یہیں بس نہیں کرتی مہناز۔ اُس کی تو سب سے بڑی پونجی یعنی عصمت کے بارے میں انگلی اٹھائی گئی تھی۔ اُس کی تو روح ہل کر رہ گئی تھی۔اس نے ایسا جواب دیا کہ آج تک ہر بلوچ دوشیزہ عملاً اسے اپنا ایمان سمجھتی ہے۔وہ شہداد کو چیلنج کرتے ہوئے کہتی ہے:

گُل نہ چنڈیت کہ سک اِنی پیشردار

دف مہ کندیث، درنہ ونت دتاں

ترجمہ:

خیمہ ہلے گا بھی نہیں اگر اس کا اہم ستون مضبوط ہو

منہ جب تک قہقہہ نہ لگائے تو دانت ظاہر نہیں ہوتے

اس عورت کا عزم دیکھنے کے قابل ہے۔ دنیا میں جس بھی عورت پر ناجائز شک کیا جائے گا، اُس کا جواب وہی ہوگا جو مہناز کا تھا:

مس ہماں ہنجیراں مزن تا خیں

کہ رستغاں جے ھین ایں گروگتاں

تنک تڑیں کُمبانی سرہ رستاں

ڈکھنڑیں گواث کہ ہرگرے کشی

اکثرا درشکانی سرہ چنڈی

سرمنی ہچ گواثا نہ چنڈینتہ

بیخ منی ہچ ہورا نہ میسیں تہ

ترجمہ:

میں بڑے پتوں والی انجیر کا وہ درخت ہوں
جو دشوار گزار چٹانوں کی گہری گھائیوں میں اگا ہوا ہے
تنگ دروں میں، جھیلوں کے کنارے
جنوبی ہوائیں جب ہر طرف سے چلتی ہیں
تو اکثر درختوں کی شاخوں کو ہلا ڈالتی ہیں
مگر میرا سر کوئی بھی ہوا نہ ہلا سکی
میرا تنا کوئی بھی بارش نہ بھگو سکی

اور اب اس کا عہد، اس کا قول اور اس کا ارادہ دیکھیے، اُس کا عزمِ صمیم دیکھیے:

جنغ اوں پہ جامیں اومرا بستہ
گورے گندی یا اومرے بوڑی

ترجمہ:

میں نے اپنا گریبان صرف عزت مآب اومر کے لیے باندھ لیا ہے
اس جسم کو صرف قبر دیکھ سکے گی یا پھر اومر

یہ ہے سولھویں صدی کی اس بلوچ شاعرہ کی سرگزشت جس نے سنگین الزامات اور رسوائی کا سامنا کیا، مخالفتوں اور سماجی بندشوں سے نمٹی اور جس کے قدم ما قبل جاگیرداری بنیاد پرست زندگانی اور رسم ورواج کے خوف ناک سماج سے نہ ڈگمگائے۔ محترمہ مہناز عورتوں کی جدوجہد کا روشن ستارہ ہے۔ وہ تن تنہا پورے سماج سے لڑی اور محبت کی قوت سے فتح پائی۔ کہیں مصلحت، مصالحت اور موقع پرستی نہ دکھائی اور مستقبل کی لڑنے والیوں کو جدوجہد کا راستہ دکھایا۔

اور ہم نے دیکھا کہ اُس کی شاعری بڑی خوب صورت ہے۔ تشبیہات، ضرب الامثال اور ادبی رنگینی و چاشنیوں سے بھری شاعری۔

رندو لاشار برادر کُشی

اس مقام پر خوش حال، متمدن اور ترقی یافتہ بلوچ عوام کے ساتھ تقدیر ایک اور ناروا کھیل کھیلتی ہے۔ یہاں چاکر و گہرام کی خون آشام جنگیں شروع ہوئیں، جن کی سنت کی پیروی آج تک ہم بلوچ بڑے خشوع وخضوع سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ دانش وروں نے چاکر و گہرام کی اس تیس سالہ جنگ کے بارے میں بہت سی بحثیں کی ہیں اور بہت کچھ لکھا ہے۔ میری نظر میں اس تباہ کن جنگ کی تین چار بڑی معاشی وجوہات تھیں، باقی تو سب قصے کہانیاں ہیں:

1۔ لاشار اور رند قبائل میں سبی اور گنداواہ کی زرخیز زمینوں کی تقسیم پر ابتدا میں پُرخلوص اعتماد پیدا ہوا تھا مگر جلد ہی اس مساوات اور ہم سری میں باہمی کشمکش اور ہنگامہ خیزی نے اختلافات کی صورت اختیار کرلی۔

2-ایک اور بڑی وجہ چراگاہوں کی کمی تھی۔ رند اور لاشار فیوڈلوں کے اونٹوں کی بہتات کے ذکر سے تو چاکری دور کی پوری شاعری بھری پڑی ہے۔ گوہر جتنڑیں کے اونٹوں کا قصہ بھی ہماری تاریخ کا اہم حصہ تشکیل کرتا ہے۔ بھیڑ بکریوں کا تو حساب وشمار نہیں تھا۔ گھوڑے تو بلوچوں کی شخصیت کا مظہر ہوا کرتے تھے۔

3۔ علاوہ ازیں چاکر کی بھینسوں کا تذکرہ اور نشانی شاعری اور روایتوں کے علاوہ ''چاکرہ

میھاگ'' نامی علاقے میں بہتات سے موجود ہیں ۔ یہ مبالغہ بھرے کرامت والے پتھر تعداد میں سیکڑوں ہیں جن کے بیچ سے ماوند، سبی کا راستہ گزرتا ہے ۔ بلوچی داستانوں میں بھی چاکر کی بھینسیں بڑی تعداد میں بتائی گئی ہیں ۔ اب اگر ذرا سا غور کیا جائے تو بھینسیں تو آباد زراعتی طریق پیداوار کی علامت ہوتی ہیں ۔ پانی، زمین، کسان اور فیوڈل پر مشتمل اس بلوچ طبقاتی سماج پہ ابھی تک سرقبیلوی نفسیات اور اقدار حاوی تھیں ۔ ویسے بھی خود کلاسیکل ادب کی موجودگی ہی کسی سماج میں طبقاتی تقسیم کی نشاندہی کرتی ہے ۔

4- ایک فروعی بات گوہر جتنڑیں کی بھی کی جاتی ہے ۔ گوہر جتنڑیں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ایرانی بلوچستان سے ترک مکانی کر کے گنداواہ آ گئی تھی اور گاجان کے قریب ہی آباد تھی ۔ وہ وہاں کچھ عرصہ کے لیے مقیم رہی ۔ بعد ازاں سبی منتقل ہوگئی اور میر چاکر کے تحفظ میں رہنے لگی ۔ لاشاریوں نے اسے اپنی توہین سمجھا اور گویا اسی پر لڑائی شروع کر دی ۔ چنانچہ ان نعمتوں کے حصول اور توسیع کی تگ و دو میں سیوی کی سرزمین پر دو فیوڈل قبائلی گروہوں کے مابین تیس سالہ جنگ لڑی گئی ۔

5۔ ان جنگوں کی ایک اور بڑی وجہ بھی تھی ؛ وہ تھی بلوچستان کی دو ہمسایہ طاقتوں (یعنی قندھار کے ارغون اور سندھ کے سمہ) کی حریصانہ مداخلت ۔ سبی و ڈھاڈر کی زرخیز زمین نے نہ صرف ہمارے اپنے فیوڈل حکمرانوں کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں بلکہ بیرونی حاکموں کی اشتہا کو بھی بڑھاوا دیا ۔ اور پھر ہماری برادرکشی تو خود بیرونی حملہ آوروں کو دعوت دینے کے لیے کافی تھی ۔

ارغون نے چاکر کی پیٹھ تھپکی اور سمہ حکمرانوں نے گوہرام کو اکسایا ۔ چاکر نے سلطان حسین حمایت یوں بتائی:

قندہار پوژاں مس سرازیراں
اژ پڈا چک چین و مغل روخ باں
تئ گوانزغی پلانا نہ پردا چاں

ترجمہ:

میں قندہار سے لشکر لاؤں گا
مغلوں کی طرح تمہاری نسل کشی کراؤں گا
اور پنگھوڑوں میں موجود تمہارے بچوں تک کو معاف نہیں کروں گا

یہ ہے چاکر کی حالت ۔ یہی حال گوہرام کا ہے ۔ وہ سمہ حکمران سے امداد لے کر چاکر کے خلاف کیا کچھ کرنا چاہتا ہے، ذرا عزائم تو ملاحظہ ہوں:

شاہ مناں باری اے بہ داث روشے
(مس) سمہ و بھٹی آنی چاری آں
ٹھٹھہ ءِ پوژاں مس سرا ریشاں
آساپہ چاپواں ماں داراں
ھنگراں گرانیں لوغ موغیمانیں
تو سغادلی ترک دلیخی باں

ترجمہ:

خدا مجھے کسی روز موقع دے
میں سمہ اور بھٹی افواج کا منتظر ہوں
ٹھٹھہ کی فوجوں کو اُن پر گرادوں
خطرناک آگ لگادوں
اپنے بہادر دشمنوں کے گھر جلا کر راکھ کردوں گا
اس آگ کو دہلی کے ترک (چاکر کے دوست مغل) بھی نہ بجھا پائیں گے [1]

چنانچہ چاکر نے لاشاری کو زیر کرنے کے لیے سلطان حسین سے مدد کی درخواست کر ڈالی ۔ سلطان حسین تو خدا سے یہی مانگتا تھا ۔ اس کا گورنر ذوالنون بیگ ارغون تھا ۔ مدد کی درخواست حسین شاہ کے لیے تو من و سلویٰ تھا ۔ اس کی تو رال ٹپکنے لگی ۔ مگر اس نے فیوڈل ڈرامہ تو بہرحال کرنا تھا ۔ اس نے فوجی امداد کے لیے چاکر پر تین شرائط رکھیں ۔ یہ شرائط ہماری کلاسیکل

شاعری کی تخلیق ہیں۔ اورل پوئٹری نہ ہوتی تو تاریخ تو الجبرا جیسا مشکل مضمون بن کر رہ جاتی۔ آئیے یہ شرائط دیکھیں:

پہلی شرط:

چاکر کو ایک خونیں اور اکھڑ گھوڑی دی گئی کہ وہ اس پر سوار ہو جائے اور اسے مقررہ مقام تک صحیح سلامت دوڑاتا ہوا آ جائے۔ البتہ اسے یہ بتا دیا گیا کہ بظاہر ہموار راستے میں سات ایسے کنوئیں کھدے ہوئے ہیں جن کے دھانے پتلی مواد سے اِس طرح بند کیے گئے ہیں کہ گھڑ سوار کو میدان ہموار نظر آئے۔ اگر سلامت آئے تو شرط پوری، اور اگر کنوئیں میں گرے تو گئے۔ چاکر نے یہ شرط پوری کرنے کی حامی بھر لی:

گوئشتہ چاکرا میر ینا
درو ہی داشئی مُشکی آ
مس کہ چاکرے شہیکاّں
تہ دہ دُلدلیے پائی ئے
پڑ تو زور ینو پر مس ظلم
کورچاتے کلہ پیذاغیں
گاماں پہ حسابے زیرئے
واغوں گپتغاں مشکی ئے
کُوہاں رپتغاں درکاّناں
کُوہاں ژہ بہ سٹ پار بیشہ
تُرکا بوروثی بشکاشہ
رندانہ گلے بہر بیشہ
میریں چاکرا سوب دیشہ

ترجمہ:

میر چاکر نے کہا
اُس نے مُشکی (گھوڑا) کو واسطہ دیا
میں اگر شیہک کا بیٹا چاکر ہوں
تو تم دلدل کی نسل میں سے ہو
تم پہ جبر ہو رہا ہے اور مجھ پر ظلم
اندھا کنواں سامنے ہے
ناپ تول کر قدم رکھو
میں نے مُشکی کی لگا میں تھامیں
کنویں پھلانگتا رہا
وہ بہ سلامت کنوؤں سے پار چلا گیا
ترک نے اپنا یہ گھوڑا اسے بخش دیا
رندوں میں مسرت پھیل گئی
میر چاکر کو فتح نصیب ہوئی

دوسری شرط:

تنگ بازار کے ایک سرے پر جنگی ہاتھی چھوڑا گیا اور دوسرے سرے سے چاکر کو پیدل آنا ہوگا۔ نہتے، غیر مسلح۔ اُسے الٹے پاؤں واپس کرنا تھا مگر شرط یہ تھی کہ کوئی ہتھیار استعمال نہ ہوگا:

ترکا گِرکشہ غوغائی
آں مڑکہ ایوک و دست ہورگنت
آنہی ئے تقاخ چوں چونیں
سردارا جواو گڑدینتہ

آں مڑکہ ایوک و دست ہورگ ایں
دستے گوں دلا ہمراہیں
آنہی ئے کمک اللہ ایں
ہتھیار گپتغنتش میر ئے
دیم پہ بازارا داشئی
شنگو چاکر و شانگو پیل
گپتئی پشی ئے پاذارا
زڑ تو کہ جثئی پیلا را
پیل چو کم تتی آ گڑتہ
بھت و کوٹواں دراہانا
رنداناں گلے بہر بیثہ
میریں چاکرا سوب بیثہ

ترجمہ:

ترکوں نے نخرے سے کہا
جوشخص تنہا ہواور نہتا ہو
اُس کے ساتھ کیا کیا ہوسکتا ہے
سردار نے جواب دیا
جوشخص تنہا ہواور نہتا ہو
جس کا ہاتھ دل کے ہمراہ رہے
اُس کی کمک تو اللہ کرتا ہے
انہوں نے میر کے ہتھیار لے لیے
اسے بازار لے گئے

ایک طرف سے چاکر اور دوسری طرف سے ہاتھی
اس نے ایک بلی کو پاؤں سے پکڑا
اٹھا کر ہاتھی کو دے ماری
ہاتھی گھبراہٹ میں واپس مڑا
دیواریں کمرے گراتا ہوا
رندوں میں مسرت پھیل گئی
میر چاکر کو فتح نصیب ہوئی

تیسری شرط:

ارغون حکمران کے پاس ایک شیر تھا۔ چاکر کو تلوار لے کر اُس سے لڑنا تھا:

ایذا لادھڑیں شیرے ناں
آزمائیں وثی ہندی آ
شنگو چاکر و شانگو شیر
ہر دوں قمبراں ڈاورتہ
نیاما دکھوی مانا تکاں
سردار وسغار شیرازی
زڑ تو درنز ثئی میانئے تیغ
شیر چواُوند ھوئی کپتہ
رنداں راگلے بہر بیثہ
میریں چاکرا سوب بیثہ

ترجمہ:

یہاں ایک طاقتور شیر ہے
تم اس پہ اپنی تلوار آزمالو

ایک طرف سے چاکر اور دوسری طرف سے شیر
دونوں بہادر تن گئے
باہم گتھم گتھا ہوئے
سردار اور شیرازی شیر
اس نے میان کی تلوار کا وار کیا
شیر اوندھا گر گیا
رندوں میں مسرت پھیل گئی
میر چاکر کو فتح نصیب ہوئی

تینوں شرائط پوری ہو گئیں۔ متکبر ترک کے پاس اب چاکر کی درخواست کو رد کرنے کا کوئی اخلاقی جواز نہ رہا۔ چنانچہ:

زنوں ءَ قہاریں فوجاں
فوجے بشکشہ زنوں آ

ترجمہ:

زنوں کی قہار فوجیں ہیں
اس نے فوج دے دی

چنانچہ چاکر بدبختی کا لشکر لے کر سبی کی طرف رواں ہوا۔ منزلیں طے کرتا ہوا تھکا ہارا لشکر سبی کے قریب پہنچا تو ذوالنوں نے جنگ سے انکار کر دیا۔ بہر حال رات پڑ گئی۔ چاکر نے کمال چالاکی سے اپنے آدمیوں کے ذریعے ذوالنوں کے بیٹے حیدر خان کو پہاڑ کے شکار کے لیے آمادہ کرا لیا۔ رندوں نے راستے میں اسے قتل کر دیا اور خود کو زخمی کر کے واپس آئے اور الزام لاشاریوں پر لگا دیا۔ یوں بپھرا ہوا ذوالنوں لاشاریوں پر ٹوٹ پڑا:

جیذے ڈھاڈر ءَ ناز ینتئی
سّنی یہ شفے گوازینتئی
صحوی رتلغنت گاجانا
چُک چین اے کشئی لاشاری
چُکے کُشتغنت لافی ایں
کوٹہ گوں کو پریاں بستئی
کوٹہ کرغا میر نشتہ
میراں تئ لحمیں غماں
یہ کترئے سوداشگاں
لاشاری کشئی ہڈ ہ ڈھیر
سالے کر گزاں زڑتہ سیر

ترجمہ:

ڈھاڈر کے علاقے کو شرف بخشا
سّنی میں ایک رات قیام کیا
اور صبح گاجان پر ٹوٹ پڑے
لاشاریوں کا قتل عام کر دیا
ماؤں کے پیٹ کے بچے قتل کر دیے
کھوپڑیوں سے ایک مینار بنا دیا
مینار کی چوٹی پر میر بیٹھ گیا
میران تمہارے جلانے والے غم
ذرا سا کم ہو جائیں
اس نے لاشاری کو ہڈیوں کا ڈھیر بنا دیا
ایک سال تک کرگس کھاتے رہے

چنانچہ ان نعمتوں کے حصول اور توسیع کی تگ ودو میں سیوی کی سرزمین پر دو فیوڈل قبائلی گروہوں کے مابین تیس سالہ جنگ لڑی گئی۔ ان کے درمیان کل پچیس لڑائیاں ہوئیں جن میں دس بار لاشاری کو اور پندرہ بار رندوں کو فتح ہوئی (2)۔ (مگر فتح کیا ہونی تھی، ایک دوسرے کی جڑیں کھود کھود کر دونوں برباد ہوگئے)۔

مگر دیکھیے تقدیر۔ لاشاری کو تباہ کر کے اس کی جگہ بلوچستان پر اکیلے حکمرانی کرنے کی چاکر کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ اس لیے کہ ذوالنوں کو معلوم ہوگیا کہ اُس کا بیٹا لاشاریوں نے نہیں، چاکر نے قتل کردیا۔ اب چاکر کو اندازہ ہوا کہ ایک سپر پاور سے ناراضگی لینا کتنا خطرناک ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وطن چھوڑ دے گا۔ چاکر نے اپنی قوم کے بڑوں کو حکم دیا کہ شام ہوتے ہی وطن سے نکل جاؤ، البتہ کتے، گدھے، اور مرغے یہیں چھوڑ دو۔ میں جا کر ذوالنوں کی محفل میں بیٹھوں گا اور جس وقت وہ سب کو گھر جانے کی اجازت دے دے گا تو میں اپنی گھوڑی پر نکل آؤں گا۔ چنانچہ چاکر اپنے تین سالہ بیٹے کو ساتھ لے کر ذوالنوں کی محفل میں چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد جب اسے اندازہ ہوگیا کہ اُس کے لوگ گھربار چھوڑ کر جا چکے ہونگے تو اس نے بیٹے کی چونڈی کاٹی۔ بیٹا رونے لگا۔ ذوالنوں نے پوچھا،"بیٹا کیوں رو رہا ہے؟" چاکر نے جواب دیا کہ دودھ مانگ رہا ہے۔ ذوالنوں کے حکم سے بچے کو دودھ لا کر دیا گیا۔ چاکر نے پھر بچے کی چونڈی کاٹی۔ ذوالنوں نے پوچھا اب کیوں رو رہا ہے۔ تو چاکر نے کہا،"کہتا ہے کہ دودھ میں پانی ملادو"۔ ذوالنوں کے حکم سے دودھ اور پانی ملا کر بچے کو دیا گیا۔ تیسری بار بچہ پھر رو دیا۔ ذوالنوں نے پوچھا، اب کیوں رو رہا ہے، تو چاکر نے کہا،"کہتا ہے کہ یہ دودھ اور پانی الگ الگ کردو"۔ ذوالنوں نے کہا،"یہ کام تو ماں ہی کرسکتی ہے، اسے گھر لے جاؤ"۔

چاکر روانہ ہوا اور گھوڑی پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔

ذوالنوں مطمئن تھا کہ کتے بھونک رہے ہیں، مرغے اذانیں دے رہے ہیں، گدھے ڈھینچو ڈھینچو کر رہے ہیں...... چنانچہ اُس نے آرام آرام سے صبح صادق کے وقت حملہ کردیا۔ مگر وہاں تو صرف مرغے تھے، گدھے تھے اور کتے تھے...........(بلوچ کی لاجواب جنگی حکمتِ عملی!)۔

دشمن نے پیچھا کیا۔ چاکر نے سبی سے مشرق کی جانب آج کے چاکر تنک نامی درے میں مورچے سنبھال لیے۔ چاکر تنک کے نیچے ذرا سی کھلی جگہ ہے جسے "ترک ءِ کنڈ" اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں ارغونوں نے صف بندی کی۔(3) دشمن کی فوج میں ہاتھی تھے جبکہ چاکر خان بے تیغ لڑنے والا مومن تھا۔ مومن کی شکست یقینی تھی۔ مگر دغا اور دھوکہ سے حاصل کردہ اس کی بنائی ہوئی بیوی محترمہ ہانی نے اسے ایک بار پھر شکست سے بچالیا۔ ہانی نے اپنی محبت کے اس سنگ دل قاتل اور مجازی خدا کو مشورہ دیا کہ وہ اونٹنی کے جوان بچوں پر پیش اور لکڑیاں لادے اور رات گئے ان کا رخ ترک افواج کی طرف کر کے اس لکڑی کو آگ لگادے۔ اس طرح دشمن کے ہاتھی بھگدڑ میں آکر خود اپنے ہی لشکر کو پیروں تلے روند ڈالیں گے۔ چنانچہ دو کام ہوئے؛ ایک تو رندوں کی جو بھینسیں پہلے نکال دی گئی تھیں اور اب اُن کے دشمن کے قبضے میں آنا یقینی ہوگیا تھا تو چاکر نے کرامت کے ذریعے انہیں پتھر بنا دیا۔ یہ بھینس جتنے بڑے بڑے پتھر آج بھی وہاں موجود ہیں جنہیں 'چاکرءِ میہاگ'، 'چاکر کی بھینسوں کا ریوڑ' کہتے ہیں۔ (ہماری مائیتھالوجی!!)۔

دوسرا یہ ہوا کہ چاکر نے محترمہ ہانی کی جنگی حکمت عملی پر عمل کرتے ہوئے ترکوں کو عظیم نقصان پہنچا کر واپس کرادیا اور خود پنجاب کی طرف نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہانی اپنے محبوب، شہ مرید کی اتھاہ محبت کی جلن اپنے سینے میں لیے بے وطنی کی ٹھوکریں کھانے کے لیے بے انت مسافتوں کی مسافر بن گئی۔

چاکر تباہ، گوئہرام تباہ۔ وطن چھن گیا اور پوری قوم دربدر ہوگئی۔ بلوچ شاعروں نے وطن بدر ہونے کی کیفیات اس قدر دل ہلا دینے والے انداز میں بیان کی ہیں کہ ان کے سامنے اعلیٰ ترین عالمی مرثیے بھی ہیچ ہیں۔

چاکر کی مستیوں کا خمیازہ بھگتنے والے اس کے 'فکری باڈی گارڈوں' نے یوں سینہ کوبی کی:

گوئہراما تئی گنداوا مڑیں
پرینتہ زرا مس سنگے
لنجائیت لواشت آں مچھی

سی سالا وث و اشارا
جانا جابواں جنگی ایں
تیغ چو ملگواھونی ایں
چوٹاں چو کوندرے بوغا
بُجّتاں نہ رو انت لھڑیناں
ورنایاں دو مند لیناں
پاغ اش پہ کہیوے بستاں
مسک مس بروتاں مشتاں
بورگوں بے لغاما تاتکاں
وھڑ دِاش ،دمبغاں میشانی
آہاں ژہ نشاں یکے نے
تیغا چڑتغاں ہندی آں
زھمانی رہاں زہر یناں
شرؔ طاں داثغاں شومیناں
چُکی لیو و بازیاں
بگ اش گرّو خیں بے شوناں
یاغی ایں کلات بے روناں
سیوی گھوڑوی گرڈاں با
شومیں گوہرہ ہر جاں با
گوئہرام شہ دوجہاں بے جاہ با
ئیں گورباث، ئیں مُژیں گنداواہ
ژہ ہپت صذ بنگویں ورنایاں

کہ بور اِش بے لغا ماتا تکاں
شاہاں ژہ نشاں یکے نے
گُل ماں گوہر ئے مَرگاناں

ترجمہ:

گرد و غبار والے گنداواہ کے گوہرام نے
سمندر میں ایک ایسا پتھر پھینکا
کہ مچھلیاں باہر آ کر تڑپنے لگیں
پورے تیس سال تک ہم باہم دست و گریباں رہے
جنگی اسلحہ بدن پہ سجائے
تیغیں، خونی تیغیں
گنے کی ڈنٹھلوں کی طرح ٹیڑھی ہو گئیں
اب وہ میانوں میں جانے کے قابل نہ رہیں
دوہرے خود پہننے والے نوجوان
ٹیڑھی پگڑیاں پہنتے تھے
مونچھوں پہ مشک ملتے تھے
سبک رفتار گھوڑوں کو دوڑاتے تھے بے لگام
دنبہ کی چکی ان کی خوراک تھی
ان جوانوں میں سے ایک بھی تو زندہ نہ بچا
سب کو ہندی تلواریں (گھاس کی مانند) چَر گئیں
تلواروں کی زہریلی دھاروں نے
ہم انہیں بدقسمت جوئے میں ہار چکے ہیں
انہیں کھو چکے طفلی کھیل تماشوں میں

ان کے شور مچاتے اونٹوں کے گلوں کا اب کوئی رکھوالا نہیں
باغی قلعے ویران ہو گئے
سیوی شالا حملہ آوروں کے گھڑسواروں کی ٹاپوں کی گرد میں رہے
یہ، بد بخت گوہر کے تاوان کی نذر ہو جائے
گوہرام دونوں جگہوں سے بے گھر ہو جائے
نہ قبر ملے اُسے، اور نہ ہی نصیب ہو گند اواہ
سات سو بانکے نوجوانوں میں سے
جو بغیر لگام کے گھوڑے دوڑاتے تھے
ایک بھی نہ بچا
سب کے سب گوہر کی نحوست کا شکار ہو گئے

اسی طرح گوہرام کی طفلی سوچ کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے والے لاشاری اپنے سردار کو بچاتے ہوئے اِس جنگ کی تباہ کاری کا ماتم کرتے ہیں۔ اور اس ماتم کا انداز دیکھئے:

پہ سئے چیزاں تمام باڑایاں
یکے درنگئے ساسراں ساڑتیناں
او گوئز کی و مبغاں تہلیناں
بُنّ ایں ساڑتڑی ایں آفاں
کہ اڑما زنتغاں زورا خاں

ترجمہ:

میں تین چیزوں کے لیے بہت ترستا ہوں
ایک چٹانوں کی ٹھنڈی چھاؤں کے لیے
اور برّوں کی چکی کی نمکین چربی کے لیے

پہاڑی ندی کے ٹھنڈے پانی کے لیے
جو کہ طاقتوروں نے ہم سے چھین لیے

اس طرح سلطان حسین نے پہلے تو لاشاریوں کا قتل عام کر کے ان کی فوجی قوت ختم کر دی اور کچھی کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے فوراً بعد ہی اس نے سیوی پر قبضہ کر کے رندوں کے اقتدار کو بھی ختم کر ڈالا۔ سلطان حسین والی ہرات نے 1470ء میں بلوچستان پر قبضہ کر لیا۔

1480ء میں اس نے قندھار، شال، پشنگ، سیوی اور مستنگ وغیرہ کے علاقوں پر شجاع الدین ذوالنوں بیگ ارغون کو گورنر مقرر کیا۔ ذوالنوں کی موت کے بعد اس کا بیٹا شاہ بیگ ارغون اس علاقے کا حکمران بنا۔ ظہیر الدین بابر کے اس علاقے کے سیاسی میدان میں آتے ہی ارغونوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور یوں یہ علاقہ مغلوں کے قبضے میں آ گیا۔

میر چاکر اس تیس سالہ جنگ اور لاشاریوں کو تباہ کرنے کے بعد 1512ء کے آغاز میں سبی سے ملتان چلا گیا اور سبی کے مشرق کی طرف چاکرءِ کور، چاکرءِ میہاگ، چاکرءِ پوش نامی جگہیں اس کے سفر کے سنگ میل بن گئیں۔ بلوچوں میں سے گوہرام لاشاری گم ہو گیا اور گجرات کاٹھیاواڑ کی جانب ہجرت کر گیا۔

اور جب کافی عرصہ گزرنے کے بعد بکر اپنے پرانے وطن کو دیکھنے کے لیے بلوچستان کا دورہ کرتا ہے تو اُس کا تو دل بیٹھ جاتا ہے:

کچھی نہ پرّامئے مناں
زڑدہ کنئے تہ ہوشغاں
سوری دَہ گنجیں مٹھڑا
کلّاں منی سوزہ چڑی
راجے مگسّوئے کننت
موڑ دانغ اش مُنڈ بیٔغنت

مئے کاسغانی چٹغا
توڑا سلاح زیرنت منی
مُلکاں ہواں مڑد ہ وراں
کہ دوراں بلوچ دھلیتغاں
چاکر و گوئہرام پہ وثاں
ہوتاں پہ لافئے سیر ہا
پیل گوں ہروناں تاتکغاں
تُرکاں منی برات بنگویں
ژہ بامی سراں ایر گیژ تغاں
لہمیں دریا درکیں تغاں
نز آتکغت کُوم و قہار
چندھی صد و چندھی ہزار
صحوی بلوچ ڈاورتغاں
صحوی دہ دنزیں دیغرا
بُوت و مزں گواثیں سغر
تیغاں کرُبی رُشغاں (4)

ترجمہ:

کبھی اب تم مجھے ورغلا نہیں سکتے
خوشوں کو سنہرا (پختہ) کر کے
سوری نامی جگہ سے لے کر مٹھڑی نامی علاقے تک
سب میری گھوڑی کی چراگاہیں ہیں
ایک قبیلہ ہے جسے مگسو کہتے ہیں

اس کی انگلیاں فربہ ہو چکی ہیں
ہمارے برتن چاٹ چاٹ کر
ہمیشہ سے ہمارا اسلحہ اٹھاتے تھے
اب ملک کے مزے وہ لیتے ہیں
(اس لیے کہ) دولت نے بلوچوں کو بدمست بنا لیا تھا
چاکر و گوہرام باہم
انہوں نے شکم سیری میں
ہاتھیوں اور ہرنوں کی دوڑ کا مقابلہ کرایا
ترکوں نے میرے پیارے بھائیوں کو
بلندیوں سے اتار دیا
منہ زور دریاؤں پر سے پھلانگنے پر مجبور کر دیا
اژدھام کی تعداد میں جمع ہو گئے
کئی صد اور کئی ہزار
صبح دم بلوچ تن گئے
صبح سے لے کر گرد آلود شام تک
رخسار اور متکبر سر
تلواروں نے کھڑب کی طرح کاٹ ڈالے

حوالہ جات

1۔بگٹی، عزیز محمد، 1996، بلوچی مزاحمتی شاعری، قاسم بک ڈپو، صفحہ 30
2۔عطائی، محمد ابراہیم، د بلوچ ملی آزادی بخشونکو جنبشونو تہ یوہ کتنہ، اکیڈمی آف سائنسز کابل، صفحہ 14
3۔عثمان حسن، بریگیڈیئر، بلوچستان ریوتاژ، 1987، گوشۂ ادب کوئٹہ، صفحہ 426
4۔مری، محمد اکبر، بکر لاشاری، ماہنامہ کراچی، جولائی 1956، صفحہ 38

چاکر، مشرق کا مسافر

سولھویں صدی کی پہلی چوتھائی میں مری بگٹی علاقے کے بڑے حصے میں بلیدی قبیلہ آباد تھا۔ بلیدیوں اور بجار کے مابین جنگ میں بلیدی سردار ہیوتان مارا گیا اور بلیدی علاقہ بدر ہوگئے۔تب بجار، دودائی علاقہ کی طرف لپکا جو کہ سہراب اوراس کی اولاد کا ڈیرہ تھا۔(1) میر بجار نے سہراب دودائی اوراس کے خاندان کے ساتھ جنگوں کا ایک سلسلہ جاری رکھا۔ وہ ان لڑائیوں کے بعد پنجاب سے واپس بلوچستان آیا۔ وہ سبی پہ تو دوبارہ قبضہ نہ کرسکا البتہ کاہان اس نے بلیدیوں سے چھین لیا۔

بعد میں ماوند سمیت پورے مری علاقے سے شادیھان سومرانڑیں نے حسنی قبیلہ کو دھکیل باہر کر کے قبضہ کرلیا۔ بلیدی نیچے دریائے سندھ کی جانب آئے، جہاں پہ وہ آج آباد ہیں۔ڈیرہ غازی خان کے دودائی خاندان کے ساتھ جنگوں کے دوران بجار نے خودکو پڑرندوں کا بادشاہ تو کہلوایا مگر کبھی خودکو مری نہ کہا۔مری کا لفظ بہت بعد میں تشکیل پایا۔اسی لیے قدیم بلوچی شاعری میں مری کا ذکر نہیں ہے۔دودائی اور بجار کے مابین لڑائیوں میں چاکر نے دودائیوں کی طرف داری کی تھی۔ یہ لڑائیاں 1520 سے 1550 تک چلتی رہیں۔جس کے نتیجے میں یہ علاقہ رند اور دودائی کے درمیان تقسیم ہوا۔مگر بجار اوراس کے ساتھی سیوی کو کبھی نہ بھولے تھے۔

محمد خان پیڑ داذانڑیں یوں خلاصہ کرتا ہے:

بجارا گوئشتہ مری
بیشہ ژہ چاکرا بری
سیوی دڑدنی چری
وطن و الکہاں گھولی
وتی ماھیں جناں رولی
مڑوخیں سنگتاں پولی

ترجمہ:

بجار نے کہا کہ، مری
چاکر سے الگ ہوگئے
انہیں سبی کی یاد ستاتی ہے
وہ نئے اوراچھے علاقے کی تلاش میں ہیں
اس طرح وہ اپنی خوب صورت
خواتین کوسفر کی صعوبتوں میں مبتلا رکھتے ہیں
اورلڑاکا ساتھی تلاش کرتے ہیں

وہ ڈیرہ غازی خان میں کچھ لوگ بٹھا کر واپس ہوا۔مقبوضہ علاقوں میں لوگ آباد ہوتے رہے۔اس کے کچھ لوگ جیکب آباد میں آباد ہیں جوڈیرہ بگٹی سے گزرتے ہوئے وہاں بس گئے۔وہ ابھی تک بجارانڑیں کہلاتے ہیں۔(2) محمد خان پیڑ دادانڑیں کی تحقیق کے مطابق مری علاقے میں بجار کے لوگ چاکر، منڈاھی، ماوند، کاہان اور سفید نامی مقامات میں بس گئے، مگر ان کی اولین آبادکاری شاید ماوند کے آس پاس ہوئی تھی۔ یہ روایت بھی ہے کہ مری قبیلے کا اپنا نام کوٹ منڈاھی کے پہاڑی سلسلے کے نام سے لیا گیا۔

کتابیات

1۔ بلوچ، سردار خان، ''اے لٹریری ہسٹری......''، جلد 1 صفحہ نمبر 333

2۔ مری، خدا بخش، ''دی بلوچ تھرو سنچریز''، 1964، اسلامیہ پریس کوئٹہ صفحہ نمبر 53

میر چاکر کا دورِ ابتلا

بہر حال میر چاکر نے سبی سے مری علاقے کو اپنی جلا وطنی کا راہ گزر بنالیا۔ بجار اور اس کا گروہ بجار وڈھ نامی مقام پہ چاکر سے جدا ہو گیا تھا۔ چاکر باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ کاہان کے قریب بار بوژ نامی درے سے ہوتا ہوا مری بگٹی علاقے سے میدانی پنجاب کی جانب نکل گیا۔(1)

اُس کے زمانے میں مری کے علاقے میں آبادی بہت کم تھی۔ ماوند، کاہان اور بابر کچھ کے ارد گرد ہی آبادی تھی جسے بجار نے یکجا کیا۔ اسی دوران ہی اس آبادی کا نام اور کام کی وجہ سے مری پڑ گیا۔ بجار کی سربراہی میں رند کے کچھ گھرانے بھی دریائے لہڑی کے کنارے سے لے کر ماوند کی وسعتوں میں آباد ہو گئے۔(2)

بلوچستان کا سابقہ فیوڈل چاکر، ایک بار مہاجر چاکر بنا، اور پھر مستحکم فیوڈل بنا۔ پہلے سیوی کی پانی والی زمین تھی، اب ملتان کی زرخیز زمین تھی۔ افرادی قوت رکھنے والا سردار جہاں جائے اسے جاگیر اور زمین ملنی یقینی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں قبیلہ سردار کے لیے بذاتِ خود کرنسی کا کام دیتا ہے۔ یہ ایک ٹریولنگ چیک ہے، جسے سردار نے جب چاہا کیش کرالیا۔

یوں میر چاکر کا متحرک عہد اس طرح ختم ہوا کہ برادر کشی اس عہد کا علامت بن گئی...... اور بربادی اس کا نتیجہ۔

مجھے کچھ پتہ نہیں کہ شاعری کس کی ہے مگر میں نے معمر مری، محمد خان پیر دادانی (جواب مرحوم ہیں) سے ریکارڈ کی تھی۔ ذرا تاریخ نویسی تو دیکھیے:

دلّی شاہ جہان ایغا سیوی ہندہ رندانی
قویہیں چاکرہ ماڑی یہ نشکائے بلوچانی
سنّی کوردفیں شوراں مئے ڈا چی جھوکاں بگّانی
دَ گٹیں میلھہ کوہا خراساں جیذہ میشانی
شتو ستہ گھرا گوئستہ میریں چاکر وہانی
حسن گوں چل ہزار مڑدا گروخیں کمیثانی
ہواں رندیں جناں سیغا پذا پہ الکھہ نامی
گپتہ زہرنیں ترکاں گہیں سیوی سوادھانی

حوالہ جات

1۔گشکوری، سردار خان، چاکرِ اعظم، 1988، صفحہ 139
2۔ایضاً، صفحہ 129

بلوچ اور مغل

سمرقند پر دوبارہ قبضہ کی کئی ناکام کوششوں کے بعد بابر نے اپنی توجہ جنوب کی طرف کر دی اور پانچویں کوشش پہ ابراہیم لودھی کی فوج کو پانی پت کے میدان میں شکست دے دی۔ اس طرح ابراہیم، لودھی سلطنت کا آخری، اور بابر، مغلیہ سلطنت کا پہلا حکمران بنا۔ جب وہ ابھی کابل میں تھا تو پنجاب کے صوبیدار دولت خان لودھی کی جانب سے ایک وفد نے اس سے ملاقات کر کے اسے پنجاب آنے کی دعوت دی۔ جب دہلی کے بادشاہ کو دولت خان کی وفاداری پر شک ہوا تو اس نے اُسے لاہور سے نکال دیا۔ اور وہ سابق حاکمِ لاہور بلوچوں کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ بابر پنجاب روانہ ہوا تو دیپالپور کے مقام پر دولت خان جو بلوچوں کی پناہ میں تھا، بابر کے ساتھ مل گیا۔ (1) بابر نے سیوی واپس بلوچوں کے حوالے کر دی۔ (بلوچوں کی حمایت لینے کی تگ ودو بابر سے لے کر آج تک کے ہر حکمران کی مجبوری رہی ہے)۔

ہر بادشاہ کی طرح بابر کی بھی بہت سی خواہشات اور بہت سے پروگرام تھے۔ اور ان ساری خواہشات کی تکمیل وہ ہندوستان فتح کرنے کے بعد کر سکتا تھا۔ مگر کہیں سے موت نے آ کر اسے ہمیشہ کے لیے فطرت کی بے کراں ہستی میں جذب کر لیا۔ اور اُس کی خالی کردہ چوکی پر ہمایوں کو 'ظلِ سبحانی' بنا دیا۔ اسی کرسی کے بطن سے شیر شاہ نامی ایک اور وارلارڈ نے ہمایوں کی دوڑ لگوا دی۔

چنانچہ ایک اور ظلِ الٰہی وجود میں آیا، ایک اور بادشاہ بنا اور استحصال کی ایک اور شکل سامنے آئی۔

اس سے قبل 1539 میں شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ہمایوں بھاگا بھاگا لاہور چلا گیا اور وہاں سے ملتان جا کر دم لیا۔ جب وہ اوکاڑہ کے قریب قصبہ سرگودھا پہنچا تو اس کی خوراک کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ اور اس نے چاکر کے امرا میں سے ایک، بخشو بلوچ سے مدد طلب کی۔ اس نے آٹے سے بھری ہوئی سو کشتیاں شکست خوردہ بادشاہ کو امداد کے بطور فراہم کیں۔ بعد ازاں انھی کشتیوں پر سوار ہو کر بادشاہ نے دریا عبور کیا۔ شہنشاہ کی بہن گلبدن بیگم، بخشو کی اس امداد و کمک کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتی ہے: ''اللہ تعالیٰ اپنا رحم و کرم بخشو پر نازل کرے جس نے سخت مشکل کی گھڑی میں شہنشاہ کی خدمت کی'' (2)۔ ہمایوں وہاں سے ڈیرہ غازی خان آ کر بلوچوں کی بجی اور کاک سے لطف اندوز ہوا۔ تنزلی کے اس سفر میں اس نے اپنے دو چار شناساؤں کے دروازے ضرور کھٹکھٹائے مگر جب انسان کی آنکھیں بدل جاتی ہیں تو اس کی روایتیں اور ثقافتی اقدار بھی بدل جاتی ہیں۔ بالآخر شال و مستنگ کے بلوچ سردار لونگ خان نے اسے باہوٹ بنالیا۔ یہ واقعہ 1545 کا ہے۔ بلوچستان سے گزرتے ہوئے وہ نوشکی میں رکا، جہاں سردار ملک خطی نے اس کی مدد کی۔ جسے ابوالفضل نے ''صحرا کے رہزنوں کے سرخیل'' کا نام دیا تھا۔ وہاں سے اُسے بلوچوں نے گرم سیل کے راستے سیستان ایران تک پہنچایا۔ ایران کی مدد سے اس نے قندھار فتح کر لیا اور آگے کی فتوحات کے لیے پھر بلوچوں سے مدد کی اپیل کی۔ غیور بلوچ جوق در جوق مری علاقے سے روانہ ہوئے اور ڈیرہ غازی خان میں خود کو منظّم کرنے لگے۔ لاہور کے مقام پر بلوچ لشکر اُس سے آن ملا۔ 155 میں سرہند کے میدان میں میر چاکر کی ہمشیرہ بانڑی کے اکسانے اور جوش دلانے کی حکمت عملی نے بلوچوں کو فیصلہ کن جنگ پر ابھارا۔ اور اُن کی بہادری اور بے لوث جنگ کے نتیجے میں ان کے اتحادی ہمایوں کو تخت نصیب ہوا۔ بلوچ سرداروں میں شہزاد، نوہک اور الن چاکر خان کے ساتھ تھے۔ رندوں کے تین سو جوان مارے گئے مگر بلیدی بہت قتل ہوئے۔ ہمایوں نے کچھ بلوچوں کو پنجاب کے علاقہ دوآبہ میں جاگیریں دیں اور ٹالپروں کو کوہِ سلیمان کے دامن میں۔ (یہ ٹالپر بعد میں وہاں نہ ٹکے اور سندھ میں بس گئے)۔

بلوچ ہمایوں کی فتح سے قبل اور بعد میں مکمل طور پر فیوڈل سماج میں زندگی بسر کرتے تھے مگر یہاں ان بلوچی اشعار کو نقل کرنا بھی دلچسپ ہوگا، جو سوریوں کے خلاف جنگ و فتح کے شاہد ہیں۔ اس سے ہم اس عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کو باریکی سے دیکھ سکیں گے۔ (کہتے ہیں کہ یہ میر شہداد کی شاعری ہے)۔

شے بری لنگا ہاں دو زہمیناں
ناھڑ و کُنگاں سیر تمائیناں
در کفاں دو دائی پرے زھماں
تیغ ماں سوزیں آمنا رختہ
سر ملوکی مس کوفغاں شپتہ
بخمل و بلگاراں ھریوی آں
شے بری یک جاہا جنوں شرطاں
شرط کنوں تنگو دروشمیں بچاں
ہے وثی ھیسی چوٹواں باہوں

ترجمہ:

اس بار دو دستی تلوار چلانے والے لنگاہ
ناھڑ، خوشحال کنگ
اور دو دائی' تلوار کے جوہر دکھانے نکلے ہیں
وہ تلواریں جو سبز میانوں میں رکھی جاتی ہیں
اپنے امیر گلے اور کندھوں پر ڈالے چلے آتے ہیں
ہرات کے مخمل اور ریشم کا لباس پہنے نکلے
اس مرتبہ اکٹھے جوا کھیلتے ہیں
اپنے سونے جیسے بیٹے ہار دیں گے
یا خود اپنے سر گنوا دیں گے

شے بری زوراخاں ھمو راجاں
چل ھزار رند دہ سرا گوناں
اڑد ھما یوئنۓ باز و بے گانجاں
روش در آتکہ او پوڑہ آمد بی
جیغ بلوچانی لیلویں جاناں
یا مغلانی ہُول و مندیلاں
مس ڈغارا ھند نہ یٹ پاذاں
مرگ ماں ھُلّانی سرانشتاں
آھو مس اڑدے نیا مغہ گپتاں

ترجمہ:

اس دفعہ (بلوچ) کے تمام طاقت ورلوگ یک جا ہیں
چالیس ہزار رند آ گئے ہیں
خود ہمایوں کی فوج لاتعداد ہے
سورج نکلا اور فوجیں ظاہر ہوئیں
بلوچوں کے خوب صورت جسموں پہ زرہ بکتر ہیں
یا پھر مغلوں کے نیزے اور بکتر ہیں
زمین پر پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ہے
پرندے نیزوں پر بیٹھتے ہیں
فوج کے درمیان میں سے ہرن پکڑے جاتے ہیں

در کفی روش شہ تنگویں برجاں
گوانک جثہ وہ روذیں دھامایاں

پوتریں رند پہ ڈپغا کاتکاں
مس حیالانا دل نہ چنڈینتہ
مس ھذا آمانیں شوئے بالاذ
گوں جن و تنگو دروشمیں بچاں
شرّط آھور ھیسی چوٹواں بیثہ
تاں گور آتکاں گوں کابلی ترکاں
مچثہ جنگ گوں توپکی تیراں
پہ سغاران و سارویٔں لیلاں
دیر نہ ویثیہ داں دمایکے
نغاہ کثہ ماگوں ریذغیں پچماں
پلوے میرا لشکرے پرشتہ
دنزے ژہ میرئے بیرکا گوستہ
زور کثہ دلّی پوترویں ترکاں
اڑد شہ چپیں پلوا پرشتہ
چنڈے شہ میر ئے نیمغا کڑتہ
رند نہ کنزاں ژہ موژغی پینزا
شیھکہ جتکیں بانڑی آتکہ
چَک جثہ باہی آں شذا بڑزا
پُرشتغاں اچی نہ تلیں باہی
اوئے ھوئے لجانی سرا آتکہ
گھور کثہ رنداں پہلوا نیناں
زھم جثہ رند و بارغیں بوراں

جی بلوچانی لیلویں جاناں
یا مغولانی ھل و مندیلاں
زھم ما جامیں کوفغاں داشتاں
مس وثی مندیلاں بلوچی آں
پرشتغاں دلی ترک حرام خوریں
پوژگرانیں ما ھپت سری پروشتہ
ھپت ھزار نر شیری گڑاکیں تیَں
جھل جندراہا ملاں نا درشتیں
بیڑثیں دلی کوٹ ھزار گنجیں
اوذا ما ھشت پہری دیروے داشہ
مڑ قرار بنت و بور بہ ساسارنت
گوش نما ساسارنت دمے نوخیں
سوم شہ سیمیں ھکماں دیر باں

ترجمہ:

سورج جب طلائی برجوں سے طلوع ہوا
تو جنگ کے طبل بج اٹھے
رند سپوت دوڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگے
جنگ کے تصور سے ان کے دلوں میں کچھ خوف نہ تھا
آج تمہارے وجود خدا کی امان میں ہیں
اپنی بیویوں اور حسین بیٹوں کے ساتھ
اب سر دھڑ کی بازی لگی ہے
تا آنکہ وہ کابلی ترکوں (سوریوں) سے ٹکرا گئے

بندوقوں کی گولیوں کے ساتھ لڑائی چھڑ گئی
تلواریں سروں اور دھڑوں کو چیرتی تھیں
زیادہ دیر نہیں گزری
ہم نے جو سرخ آنکھیں اٹھا کر نگاہ دوڑائی
تو دیکھا کہ میر کے لشکر کا ایک حصہ ٹوٹ کر بھاگ رہا ہے
ان کی اڑائی ہوئی گرد امیر کے جھنڈے سے گزر گئی
دہلی کے ترک سپوتوں نے دباؤ ڈالا
لشکر کے بائیں بازو کا ایک حصہ ٹوٹ گیا
اس کا ایک حصہ میر کی جانب سے ہٹ گیا
رند تو جنگ میں اپنی ایڑھی بھی پیچھے نہیں سرکاتے
شیھک کی بیٹی بانڑی خود میدان جنگ میں کود پڑی
اپنے دونوں بازوؤں کو چوڑیوں کے ساتھ اوپر اٹھایا
ہاتھوں میں پہنی ہوئی اچ میں بنی ہوئی نو خوبصورت چوڑیاں توڑ ڈالیں
عزت و عصمت تک بات آ گئی
تو بہادر رند واپس پلٹے
تلواریں چلائیں، رندوں اور اصیل گھوڑوں نے
شاباش ہو بلوچوں کے خوب صورت جسموں کو
یا مغلوں کی فولادی ٹوپیوں اور زرہ بکتروں کو
دشمن کی تلواروں کو ہم نے اپنے مضبوط کندھوں پر روکا
اور اپنے بلوچی ٹولیوں پر
دِلی کے حرام کھانے والے ترک (سوری) شکست کھا گئے
ان کے مضبوط فوج کو ہم نے سات ٹکڑیوں میں کاٹ ڈالا

ہم نے شیروں کی طرح سات ہزار دشمنوں کو کاٹ پھاڑا
دشمنوں کو ہم نے چکی کی طرح پیس ڈالا
ہم نے دِلی کے مال و دولت سے بھرے قلعے پر قبضہ کرلیا
اور ادھر آٹھ پہر تک پڑاؤ کیا
تاکہ ہمارے جواں مرد آرام کریں اور گھوڑے ستالیں
کھڑے کانوں والی گھوڑیاں دم لیں
ان کے جسموں سے زخم اور سوجن دور ہو (3)

اس طرح ہزار گنج والے دلی پر اتحادیوں نے قبضہ کرلیا۔ دِلی کی فتح کے بعد رندوں کے ہزاروں خاندان دارالسلطنت کے مضافات میں آباد ہوگئے۔ بعدازاں ان میں سے کئی آگرہ کی جانب منتقل ہوگئے اور ''بلوچ پورہ'' بسائی۔(4) ہمایوں نے شال اور مستنگ لونگ خان بلوچ کو دے دیے۔(5)

بلوچوں کی پیدا کردہ بدامنی نے شہنشاہ شاہ جہاں کو مجبور کردیا کہ وہ صوبہ ملتان کے انتظامی معاملات کی نگرانی اپنے بیٹے شہزادہ اورنگ زیب کے سپرد کردے۔ 1106 ہجری میں اورنگ زیب نے بلوچوں پر حملہ کردیا۔

میر چاکر نے ایک مختصر وقت کے لیے بلوچستان پر مغلوں کے اقتدار کو متزلزل کردیا جو کہ Tamerlane کے تحت چودھویں صدی میں بحیرہ عرب میں پھیل چکی تھی۔(6)

میر چاکر نے ایک سلطنت قائم کی جو جنوب مشرقی پارس (مکران)، موجودہ بلوچستان، جنوبی افغانستان، سندھ اور پنجاب کے جنوب میں ملتان تک ہوتی تھی............ البتہ میر چاکر کی موت کے فوراً بعد یہ اولین اور واحد بلوچ سلطنت ختم ہوگئی۔ بعدازاں آج کا بلوچستان صفویوں کے تحت چلا گیا۔(7)

حوالہ جات

1۔ لطیف، تاریخ پنجاب، صفحہ 273
2۔ گلبدن بیگم / پروفیسر سید حسن، ہمایوں نامہ، صفحہ نمبر 56
3۔ ڈیمز، ل۔ و، پاپولر پوئٹری آف بلوچیز، صفحہ نمبر 33
4۔ گشکوری، چاکرِ اعظم، صفحہ 183
5۔ گزیٹیئر کوئٹہ پشین، 1986، گوشۂ ادب کوئٹہ، صفحہ نمبر 33
6۔ شلز، فریڈ، نومیڈزم اینڈ کالونیلزم، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2002، صفحہ 21
7۔ شلز، فریڈ، نومیڈزم اینڈ کالونیلزم، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2002، صفحہ 22

ہمّل رند

Hammal Rind

وقت: سترہویں صدی کی ابتدا

مقام: نرمک

قبیلہ: رند

اس تکون پہ تو آرٹ وکلچر گویا فریفتہ رہا۔ ٹائمنگ اس قدر ہم آہنگ کہ وہاں سے عشق و شعر ہی اگتا رہا۔ بلوچ کلاسیک اسی تکونی زمان ومکان میں تو اپنے تمام پڑوسیوں کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ وسیع وعمیق ٹھہرا۔

زیرِ نظر داستان میں ہمّل رند ہیرو ہے۔ ہیرو، کسی خطے میں عوامی شباہت و وجاہت اور اُن کے شعور کا ترجمان ہوتا ہے۔ یہ بتانا برمحل ہوگا کہ ہمّل کا زمانہ وہاں جوانی وجواں مردی، رقص و سرود، بہادری وشمشیر زنی، گھڑسواری وشکار اور دلبر باؤں محبوباؤں سے وابستگی کا دور تھا۔ ہمّل رند بھی محبت میں دھنسا ہوا نوجوان تھا۔ اُس کا محبت نامہ بلوچ کلاسیکل ادب میں ایک ایسا دلکش ٹکڑا ہے جو آپ کو بہت دیر تک اپنی گرویدگی کے رسے سے باندھے رکھتا ہے۔

میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا ۔ صرف اپنے راوی وڈیرہ سہراب خان سومرانڑیں (مرحوم) کی ٹیپ شدہ گفتگو کو من وعن شائع کرتا ہوں ۔ (کاش میں ہر قاری کو وہی ٹیپ سنا سکتا تا کہ اندازہ ہوسکتا کہ ہمارے بزرگوں بوڑھوں میں موجود ادبی کمان کسے کہتے ہیں ۔ اور تاریخ کے ہمارے ریکارڈ کیپر کس قدر دلچسپ اور رواں انداز میں چاشنی بھر بھر کر اور میٹھے ادبی طرز میں نسلوں کو متاثر کیے جاتے ہیں)۔ مضمون میں بریکٹ کی وضاحتیں میری ہیں ۔ میرے بنیادی راوی کے علاوہ دیگر ماہرین نے اِس داستان سے متعلق مجھے جس طرح بتایا، یا لکھایا، اُن کا بہت ہی محتاط موازنہ اور چھان پھٹک میں نے کردی۔

محبوبہ کے ساتھ وصل وملاقات ہوئی۔ جب اجازت کا وقت آیا، تو محبوبہ نے حمّل سے پوچھا، اب جا رہے ہو تو پھر کب آ ؤ گے؟۔ اس نے کہا ساتویں دن پھر آؤں گا۔ سات دن سے مدت جب بڑھنے لگی اور ہمّل کے آنے کے آثار نہ دیکھے تو محبوبہ بے چین ہوگئی۔ بے قرار گھڑیاں کم بخت گزرتی کہاں ہیں؟۔ ہر پل بے کراں پہاڑ بن گیا، ہر لمحہ ابدیت ہر منظر ہر رنگ وحشت بن گیا اور ہر گُل منہ چڑانے والا ویری بن گیا۔ وہ دز ِگند (دست ِگند) یعنی پامسٹ بڑھیا کے پاس گئی، اس سے کہا:

”مس پہتمی روشا وہدہے کایاں“
پہتمی روش گوں چاڑ دہا گوئستہ
نَیں وشہ کیث و نَیں مَحرمے ششتی
نَیں دفئے ہمبوئیں سلام کیثی
بروں دِہ گو بَر دز گندا جنانیا
کہ ”زیث کنو دائی گندمنی دستا
(کہ) گندمنی دستا دئے مناں حالا
دیر کشہ ہوتیں حمّلی فوجاں“

ترجمہ:

(وہ کہہ گیا تھا کہ)

''میں ساتویں دن آ جاؤں گا''

مگر سات، کیا چودہ دن گزر گئے

نہ خود آیا نہ کوئی راز دان بھیجا

نہ ہی اس کے سر سبز سلام آئے

جاؤں گی دست شناس بڑھیا کے پاس

اے دائی! جلدی جلدی میرا ہاتھ دیکھ

دیکھ میرا ہاتھ اور بتا

حمل نے آمد میں دیر کیوں کر دی؟''

بڑھیا نے اس کا ہاتھ دیکھا۔ ارے ہاتھ تو ایسا بے برگ و ویراں جیسے قحط سالی میں کوہ لپور کا دشتِ بے دولت ہو۔ اب وہ کیا کہتی؟ ظاہر ہے اُس نے اپنے علم کے مطابق چلنا تھا۔ مگر وہاں تو حتمی طور پر صرف "No" لکھا تھا............ اور ایک ناامید انسان کی ناامیدی مزید بڑھانا کتنا اذیت ناک فعل ہوتا ہے؟۔ لہٰذا پامسٹ خاتون نے بغیر کسی اگر مگر کے کہہ ہی دیا:

نَیں تئ یارا ماتنہ گنداں

نَیں تئ یارا آتکنہ گنداں

(البہ) دیروا دوستی اے کشئ نوخیں

(یا) دستے ماں مالی لیکوے بنداں

اڑ گرانڈانی سٹ و سوذایاں

یازِ ڑدے مس براثی میڑواں وہشا

یالا غرو کنگالیں کمیث گوشیں

ترجمہ:

(تمہارے ہاتھ پہ) نہ تو تمہارا محبوب نظر آ رہا ہے

اور نہ ہی اُس کی آمد نظر آ رہی ہے

ممکن ہے اُس نے بستی میں کسی دوسری سے دوستی کر لی ہو

(یا) وہ پیسے کے معاملات میں الجھ گیا ہوگا

(یا) مویشی کی تجارت میں مصروف ہو گیا ہوگا

یا اُس کا دل خاندانی معاملات میں لگ گیا ہوگا

یا پھر اُس کی پیاری گھوڑی لاغر اور کمزور ہو گئی ہوگی

محبوب کا مقررہ وقت (درائی) پر نہ آنا تو بہت تشویش ناک ہوتا ہے۔ ہمّل کا طے کردہ روز موجود نہ ہونا حادثہ سے خالی نہ تھا۔ خدشات نے خدشات میں اضافہ کر دیا۔ بے بسی بددعاؤں تک گھسیٹ لائی اور محبوبہ نے بددعا دے ہی ڈالی:

دیر وہ دوستیا ورامارے

دستے ژہ مالی لیکواں بندبا

زِڑدے ژہ براثی میڑواں رنج با

لاغرو کنگالیں کمیث گونش با

ترجمہ:

اس سے دوستی کرنے والی عورت کو خدا کرے ناگ ڈس لے

خدا کرے اس کا ہاتھ سوداگری والے مویشی کے لین دین کے قابل نہ رہے

اس کا دل شالا خاندانی معاملات سے اچاٹ ہو جائے

اس کی لاغر اور کمزور گھوڑی خدا کرے مردار ہو جائے

مگر یہ سب وسوسے صحیح نہ تھے۔ محبوبہ کے سارے خدشات غلط تھے۔ پامسٹ کی ساری تعلیم و معلومات غلط تھیں۔ بھلا عاشق کبھی گھریلو بن سکتا ہے؟ مینڈھوں کی تجارت میں مصروف ہو سکتا ہے؟۔ ناممکن! ہمّل کو تو ایک اور مسئلہ درپیش ہوا، جس نے اُسے کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔ وہ جکڑ چکا تھا:

وث خذا سئی ایں کہ داشتغاں زوراں
گیشرا بشّامی جڑو ہوراں
گور مزارنت او نیا مغا گُرّاں
نَیں گوئنڈ سریں چُڑّے کہ مس سرا چڑّاں
نَیں کور تغارے کہ مس درکّہ گوازیناں
اے ہوا ںسوری ایں مزں مرّیں
کہ جھاگنتی بور پہ تیرغہ زورا
یا عاشقیں ورنا پہ دلا واری

ترجمہ:

خدا خود جانتا ہے مشکلات نے مجھے روکا
زیادہ ترمون سونی بادلوں بارشوں نے
سیلابی دریا تو شیر ہیں (محبت بھرے دلوں کے) بیچ میں غرّاتے ہوئے
معمولی نالے نہیں کہ ان کا چکر کاٹ کر آ ؤں
مختصر ندی تو ہے نہیں کہ اسے پھلانگ کر گزروں
یہ وہ عظیم الشان سوری دریا ہے
جسے گھوڑے غلہ کے زور سے پار کرسکیں
یا عاشق، نوجوانی والی دلاوری سے

محبوبہ سے ملنے کو بے تاب یہ نوجوان عاشق عجیب ترکیبیں کرتا ہے۔ وہ اپنی گھوڑی سے یوں کہتا ہے:

چَر کمیث قندہاری جَواں نوش کاں
بانکہ پیغاماں دلا گوش کاں

ترجمہ:

چَر لے، اے میری گھوڑی قندہاری جَو نوش کر
محبوبہ کے پیغام خوب ذہن نشین کر لے

دنیا میں ہر حمل اپنی محبوبہ سے ملنے کی تیاری کرتا ہے۔ ذرا اِس عاشق کی تیاری تو دیکھیے، پڑھ کر ایمانداری سے بتائیے کہ پیا سے من کی ایسی باریک بیانی آپ نے پہلے کہیں پڑھی؟:

گوں سلاحاں سنج کناں ملّا
پُشتہ گوں بوریں چادرا چَنڈاں
زینا ماں فیلی موروان شیفاں
تنگا پہ دوستئے نہمتاں بنداں
مالغام داشہ ماں شینہڑیں نیشاں

ترجمہ:

اسلحہ سے مسلح ہو کر میں مل (نامی اپنی گھوڑی) کو تیار کرتا ہوں
چادر سے اُس کی پشت صاف کرتا ہوں
اس کی ہاتھی جیسی پشت پر زین رکھتا ہوں
پھر زین کے بیلٹ کو محبوب کے ارادے سے باندھتا ہوں
(میں نے) اس کے شیر جیسے نیشوں میں لگام ڈال دی

اور پھر وصلِ یار کے لیے سفر، مسافرت۔ حمل اور اُس کی گھوڑی، اور اُن دونوں کی وہی جانی پہچانی راہیں:

شَیر کناناں پئے مَوشریں ملکاں
جوان اثاں سڑ دار راج پرے ہُلکاں
پاذماں تاسیں دور واں داثاں
دستے مئیں ملّ ئے سِیر مغیں واغَیں
یکے مئیں ڈال شاہیں بروتانا

سیاہ ترّ پّا ناں ما نِگوشاناں
ہڑ دوں سرگُوڑیّا شمو شاناں

ترجمہ:

سبزہ زاروں میں سے گنگناتے ہوئے گزرتا ہوں
قبائل کے لیے سردار اچھے ہوتے ہیں
میرے پیر سفید رکابوں میں
میرا ایک ہاتھ مل کے سُرمگیں باگ پہ ہے
دوسرا ہاتھ اپنی بڑی بڑی مونچھوں پہ
گھوڑی ٹاپوں کی آوازیں پیدا کرتی جاتی ہے، میں سنتا جاتا ہوں
ہم دونوں دنیا کو بھولتے جاتے ہیں

کیا موسیقی ہے، ترپ ترپ کی آواز، محبوبہ کی جانب جاتی گھوڑی کے ٹاپوں کی آواز کتنی اچھی لگتی ہے۔ ساری دنیا فراموش ہو جائے۔

اب آیئے ہم ایک ایسے فیصلے تک پہنچ جاتے ہیں جو فیصلہ پوری دنیا کا ہر عاشق نوجوان کرتا ہے، مگر اِس قدر حسین پیرائے میں اِس کا بیان کرنا شاید ہم نے نہ دیکھا ہو:

مل و ماہ لینچ مار یہ دلا دوستاں
کمترا مل و گیشترا ماہ لینچ
ماہ لینچ پہ اوسیراں شفانیاّ
مل پہ شیمو شاں عقاویا ں
مل دِہ مئے ڈکّانی ستم زیرا
مل مِری ماہ لینجہ بلہ زیریں
مس مراں بے پولا بہشتی آں

ترجمہ:

مل اور محبوبہ مجھے ایک ہی دل سے پیارے ہیں
مل ذرا کم اور محبوبہ ذرا زیادہ
محبوبہ تو راتوں کے وصل کے لیے ہے
مل عقابی اڑان کے لیے
وہ (مل) تو میرے دکھوں کا ستم اٹھانے والی ہے
مل مر جائے تو محبوبہ کی بلائیں لے
میں مر جاؤں تو بن پوچھے بہشتی ہوں

محبت کی راہ میں مر جانے والے سے بھلا کیا سوال کیا جواب! ارے وہ تو بن پوچھے بہشتی!!............ چنانچہ یہ دونوں من موجی مست و رقصاں محوِ سفر ہیں۔ کوئی غم نہیں کوئی فکر نہیں۔ نظریں، سماعتیں، سوچیں سب وصلِ یار پہ مرکوز۔ اچانک:

نِیں کہ دَہ سنّی تنک دفاں کا تکاں
چم جشہ سرواں گڑدنیں سیاہا
دُمب گوں دُ مچی آں بُڑتیٔ جہلا
سُنٹ اے گوں سرواغاں ہر یوی آں
پُشتہ کنزیشو دیم نہ جنت گاماں
مس نذر گپتہ گوں رَتلغیں پچماں
اڑمن و دیما سیاہغے رُستہ
ماد لا گوئشتہ کہ بنّوی کنڈے
یا کشار جاہی گشتغیں مُنڈہے
یاہماں گوخ پولیں جمالی اے
گورمے گاریں ثی گو ر ماپولی
یادھنڑارے گوں دڑتغیں شالا

چو نہ زانتیں کہ لادھویں شیرے
آ تکہ مئے چیارراھے سراتشتہ
پرمن و لگھی آ طلب داریں

ترجمہ:

جب میں سنّی کے درے کے دہانے تک آیا
(تو) ہرن گردن گھوڑی بدک گئی
اُس کی دُم اور اس سے بندھی بیلٹ نیچے ہوئے
اس کا سر ہرات میں بنی لگام کے ساتھ
پیچھے ہٹتی جاتی ہے، آگے نہیں بڑھتی
میں نے اپنی سرخ آنکھوں کے ساتھ غور سے دیکھا
میرے سامنے کوئی کالی چیز ابھرنے لگی
میں نے سوچا کھیت کے ٹوٹے ہوئے منڈیر کی سیاہی ہے
یا کھیتوں میں سے کاٹے گئے درخت کا تنا ہوگا
یا پھر، وہ گایوں کو تلاش کرتا کوئی جمالی ہوگا
جو اپنی گمشدہ گائیاں تلاش کر رہا ہوگا
یا پھٹی چادر والا کوئی چرواہا ہوگا
یہ نہ جانا کہ یہ تو بدمست شیر ہے
(جو) آ کر میری راہ پہ کھڑا ہو گیا
اور ہمارے انتظار میں ہے

اب ذرا دیکھئے شیر اور انسان کا مکالمہ۔ جی ہاں، دیکھیے کہ شیر کیا کرتا ہے، یہ دیکھیے کہ شیر کے مقابل وہ جوانمرد کیا کرتا ہے:

ھکّلے ماخ و نعرہ اے شیرا
نعر ہاں سوزیں سولہ چنڈیتاں
چنڈغا درشکانی برہ سِستاں
"بیا لغور کُڑ زی ء پُلائینئے
گوں کِشو کلّی ء روئے ھندا
زال پہ بھونڈو کور کناں چماں
پاذ شفاذیا گوں آولہیں پاذاں
یا ترا پیشیں چترے نیاذاں"

ترجمہ:

چیلنج میں نے کیا، نعرہ شیر نے لگایا
اُس کی چنگھاڑ سبز درختوں کو جھنجوڑ ڈالتی تھی
اس زور سے کہ اُن پہ لگے میوے گر جاتے ہیں
"آ، بزدل، گھوڑی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے
تو برا اور اپنی مشکیزہ لیے واپس گھر جاؤ گے
(بھگوڑے پن کی سزا میں) عورتیں چپیت مار مار کر اندھا کر دیں
ننگے پیر، چھالوں بھرے
یا تمہیں بغیر گدے کی چٹائی پر بٹھا دیں گی"

ہمّل اب سمجھ جاتا ہے کہ وہ محبوبہ کے چوکیداروں سے مڈبھیڑ ہونے سے قبل ہی سر کی بازی لگانے کی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ ارے یہ تو شیر ہے جو اُسے ڈوئیل کا چیلنج بھی دے بیٹھا۔

ہمّل تو ہیرو ہے، وہ میرے تیرے جیسا جواب تو نہ دے گا۔ اس نے تو غیر معمولی بات کرنی تھی، سو وہ غیر معمولی انداز میں جواب دیتا ہے:

اِنہو شیر ئے چُک نہ سر ھیالیں
مں نیاں کلّی و کِشی مڑدے
نَیں زالے پہ بھونڈو کور کناں پچماں
نَیں پاذ شفا ذیا گوں آوٗھیں پاذاں
نیں مناں پیشیں چترے نیاذاں
مں ھواں ھوتئے کستریں براثاں
زہم مں در یپانہ جِثاں سوزیں
گڈثاں شیر پہ دو دوئی جاڑیں
نشک ماں کلچاشہ شما ایراں

ترجمہ:

''ارے نہیں، اے شیر کے نادان بچے نہیں
میں توبروں اور مشکیزہ لے کر بھاگنے والا شخص نہیں ہوں
نہ ہی عورتیں چیپت مار کر اندھا کر دیں'
نہ چھالوں بھرے ننگے پیروں کے ساتھ'
وہ مجھے بغیر گدے کے چٹائی پر بٹھالیں گی
میں تو اُس ہوت کا چھوٹا بھائی ہوں
جو نیلگوں تلواریں دھپ سے چلاتا ہے
اور جس نے ایک ہی وار میں دو دو شیر کاٹ ڈالے تھے

اس واقعے کے نشاں کلچاث (ڈیرہ غازی خان میں گورشانڑیوں کا علاقہ) کے درے میں موجود ہیں۔

اور پھر ہمّل حملہ کرتا ہے۔ وہ تو اشرف المخلوقات ہے، اس کے پاس دماغ ہے، ہاتھ ہیں۔ اوزاروں میں گھوڑی ہے، تلوار ہے، تیر کمان ہے۔ شیر بے چارہ تو محض درندہ ہے، بقیہ بالا چیزیں اس کے نصیب میں کہاں؟!

او چنڑے پتارتَیں مزں پاندیں
جا بھے اری رتکیں تنک پرّیں
گونڈلو گیوارتاں جغر بُرّیں
آں کہ مئیں سیاہ ماری جُغہ بوتکاں
حملی چونڈی آں گرا کیناں
گُل مزارا ماں سینغہ داشتاں
شیر نہ جکاّناں کئے کِٹپاّناں
نِیں شیرژہ اولی ہلمھاں کپتہ
الّنڑہ وڈّھو داثغیں زہے
براث وبرازاتکی دِہیرواں داثی
دست مہ لڑز یثودل مہ چنڈینی
''ییّریں (مناں) زنزیریں رہاں ژل دَے
گرّ دنا گاڈیری مہ ترّیں ییناں
مں پُلاٹانی بندغہ جاہا
تہ نہ جثہ تہ تہ میاری ئے
مں نہ گشتہ تہ مں شِغانی آں

ترجمہ:

ہم نے وسیع چادر بچھادی
پتلا کمر بند اُس پہ خالی کر دیا
جگر بُر خنجر نکالا، اُس پہ رکھا
جو بھی سانپ جیسی میری کمان سے ہو سکا
حمل کی ماہر نشانہ بازی والے تیر

سب کے سب شیر نے سینے پہ سہے
شیر رُکا نہیں اور گرتا پڑتا آتا ہے
مگر وہ پہلے کی طرح چست نہیں رہا
النڑ لوہار کی آبدار بنائی ہوئی تلوار مجھے
بھائیوں، بھتیجوں جیسی تسلیاں دیتی ہے
''گھبراہٹ میں ہاتھ نہ کانپیں، دل نہ گھبرا جائے
ایک بار مجھے زنجیر جیسی چیز پر چلا دے
اُس کی گردن ایک ٹوٹی ہوئی بید کے سرے کی طرح دور پھینک دوں گی
لیلے باندھنے کی جگہ تک جا گرے گی
تم نہ چلاؤ تو تم طعنے سہو
میں نے نہ اڑا دی تو میں طعنے سہوں''

خدا کی قدرت ہمل اور شیر کی اِس جاری خونریز جنگ کی خبر محبوبہ کی بستی تک پہنچتی ہے اور نادان خبر رساں نے محبوبہ کو بتا دیا کہ ہمل اور شیر کے بیچ جنگ جاری ہے:

حال بُڑتہ ڈُسّی ایں کُنر چیکاں
گوخی گو آل و میشی پھوالاں
ناسئی آں مس دیروے داشاں
کہ حمّلا شیرا جھیڑوے مانیں
کس نیا تکہ کہ سوب کئی بیشہ
حمّلا سیاہ پئے سرشماں چیکا
واغ پئے بڑدستاں لڑنگو آ

ترجمہ:

بیر کھانے والے غریبوں نے خبر پہنچا دی
گایوں اور بھیڑ بکریوں کے چرواہوں نے
(محبوبہ کی) بستی کے بے خبروں کو
کہ ہمل اور شیر کے بیچ جنگ چھڑی ہوئی ہے
یہ معلوم نہیں کہ فتح کس کی ہوئی
ہمل کی سیاہ گھوڑی، لاوارث، چراگاہوں میں ہے
اس کی باگ پیٹھ پہ یونھی لٹک رہی ہے

گھوڑی بن مالک کے' ڈھیلی لگام کے ساتھ گھومتی ہو تو صاف ظاہر ہے کہ مالک زندہ نہیں ہے۔ ماتم کروانے والا منظر۔ اب تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ خبر سن کر حمل کی محبوبہ کی کیا حالت ہوئی ہوگی:

دیرو ہ کرامی کنت ، جنے جوائیں
بڑ ز ہ کاں ہنّی رتگغیں دستاں
جنتش ثی سرزاناں ملوکیناں
''اوہے مس باثواوہے مئیں زالی
ہمّل مس شوہازے شفی گیتکوں

ترجمہ:

بستی کی خوش خراموں میں سے، ایک اچھی عورت کُرلاتی ہے (ماتم کرتی ہے)
اپنے مہندی والے ہاتھ بلند کرتی ہے
اور اپنی نازک رانوں پہ مارتی جاتی ہے
''ہائے مجھ پہ، ہائے میرے عورت پن پہ
حمل کو میں نے مہلک مصیبت میں ڈال دیا ہے''

لیکن راز داں چھوٹی بہن منظر نامہ میں نمودار ہوتی ہے ۔ وہ اسے دلاسہ دیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ:

کستریں گہارے دھیرواں داتی
کہ ’’عاشقیں مڑد و شیر شکارانی
دائما ہونی ءَ گُرا کاتکاں
حمّلہ کیث و وث خذاکاری

ترجمہ:

اس کی چھوٹی بہن اسے تسلی دیتی ہے
کہ ’’عاشق نوجوان اور شکار کرنے والے شیر
دونوں ایک دوسرے کے دائمی دشمن ہیں
حمل آئے گا، اُسے خدا لائے گا‘‘

ہمّل بالآخر شیر کو مار دیتا ہے اور اس خدشے سے‘ کہ کوئی اور بزدل اسے مارنے کا دعویٰ نہ کر بیٹھے‘ وہ اس کا داہنا پنجہ کاٹتا ہے اور گھوڑی کی زین سے باندھ کر ساتھ لیتا ہے:

گُڈثَیں شیر ءَ چمبو ے راستی
چکّتو مل ءَ کنجکاں بستوں
نواں کنگرے دوہمی ثی دفاریزدا
مس بروتانی تاثغاں کندی
کہ در بڑ تہ سیاھئِے زیادہیں دِرِکّاں
رُمبغاں گُڑواریں بہانئے غاں
گڈثوں شیرئے چمبوے راستیں
کاراں تئ بچئِے گوانزغہ ٹنگاں

ترجمہ:

میں نے شیر کا دایاں پنجہ کاٹ لیا
اُسے مل کی زین کے ساتھ مضبوط باندھ لیا
ایسا نہ ہو کہ کوئی اور جواں مرد اپنا منہ ٹیڑھا کر دے

اور مونچھوں کے نیچے سے مسکرا کر کہہ دے
’’کہ حمل کو تو گھوڑی کی سبک رفتاری نے شیر سے بچالیا
گُڑخور کم سن گھوڑی کی تیز رفتاری نے‘‘
میں کاٹ کر لایا شیر کا داہنا پنجہ
لا کر تمہارے بیٹے کے پنگھوڑے پہ ٹانگ دیا

شیر سے مقابلہ کرنا، خنجر و تلوار سے اسے مار ڈالنا اور نشانی کے بطور پنجہ کاٹ کر محبوبہ کے بچے کے پنگھوڑے پر ٹانگ دینا بہادری، جواں مردی اور محبت کی انتہا ہوتی ہے۔ بلوچی ادب بہت غنی ہے!۔

............اور پھر سروں کی بازی لگانے والا محبوب اپنی محبوبہ کے پاس۔ کیا شان دار استقبال ہوا ہوگا۔ کیا بے مثال وصل ہوگا!............اور پھر واپسی کا سفر۔

گڑتغوں ماژہ سجلیں رَنداں
اوندھوئی شیر مس کلشنڑ ے اریں
موراں بنگانی دفامُچّاں
شیر نواڑت سوری ءَ دفئے گوراں
سندھڑی پل ڈمبیں گہا نچوآں
بمبوی سرواناں سغاریناں

ترجمہ:

ہم جلدی واپس ہوئے، میرے پیروں کے حالیہ نشان موجود تھے
(میں نے دیکھا) مردہ شیر کیچڑ میں اوندھا پڑا تھا
ہونٹوں پہ چیونٹیاں جمع ہیں
شیر اب مزید سوری نامی ندی کے بارہ سنگھے نہیں کھائے گا
نہ ہی سندھ کی سفید دموں والی گائیوں کو
اور نہ ہی خوب صورت ہرنیاں

بالاچ

Balaach

یہ سترہویں صدی کے اواخر، اور اٹھارویں صدی کے اوائل کا زمانہ تھا۔ بلیدی قبیلہ کے لوگ آج کے مری بگٹی علاقے سیاہ آف، جنتلّی اور نیساؤ میں آباد تھے۔ گورگیژ قبیلہ کے ذیلی طائفے نوہانی کے کچھ گھرانے بھی یہاں کی غیر آبادیوں کو انسانی شرف عطا کر رہے تھے۔ بلیدی قبیلے کی سمی ایک مالدار مگر لاوارث خاتون تھی۔ خاوند مرا تو کم سن بچوں کے لیے بہت مال و دولت چھوڑ گیا۔ سمّی عزیزوں رشتے داروں سے خوفزدہ تھی کہ وہ اس کے یتیم بچوں کا مال ہڑپ کر جائیں گے۔ چنانچہ وہ گورگیژ قبیلے کے کم سن بالاچ کے بڑے بھائی ''دودا'' کے ہاں پناہ لیتی ہے (باہوٹ بنتی ہے)۔ دودا اُن دنوں آج کے بگٹی قبیلے کے علاقے سنگسیلا میں رہتا تھا۔ زندگی بدقسمت آزمائشوں کے گرد رہ کر اپنی حفاظت کرتی ہے، جس طرح زبان بتیس دانتوں کے بیچ اپنی بقا کا بندوبست کرتی ہے۔ مگر دانت اور زبان کے رشتے کے برعکس زندگی آزمائشوں سے دوستی نہیں، دشمنی کے رشتوں میں منسلک ہے۔ ایسی ایک آزمائش دودا کے اوپر منڈلاتی رہی تھی۔ ....اور ایک روز دودا سویا ہوتا ہے کہ بلیدی حملہ کرتے ہیں اور سمی کی گایوں کو بھگا لے جاتے ہیں۔

گوخت نیخ زنیں سمّی ئے
باہوٹ انت گُرے دودایا
ڈاہے آڑتغہ گو آلاں
گورم دژمناں بوہارتہ
دودا وپتغو وہا وبیثہ
سیر ہ منہا ساڑتینا

ترجمہ:

نیک عورت سمّی' کی گائیں ہیں
دودا کی پناہ میں
چرواہے ہنگامی خبر لے آئے
گائیں دشمن بھگا کر لے گئے
دودا محوِ خواب تھا
عروسی ٹھنڈے جھونپڑے میں

اور ماں جا کر اسے جگاتی ہے۔ ذرا بلوچی کلاسیک کی مٹھاس تو دیکھیے، اِس کی امارت تو دیکھیے:

ماثا موئثہ نیخینا
نہہ ماہ اوں ترالا فاکث
سے سالوں ترا میشینتہ
لولی مس نیم شفی ایں پاساں
شِیرانہ ہذیں بشکانے
گوخاں سرجمیا بیار ئے
ناہیں حَیسی چوٹو ازیاں دار ئے

ترجمہ:

محترمہ ماں نے اسے جگایا

میں نے نو ماہ تک تجھے رحم میں پالا

تین سال تک تجھے دودھ پلایا

آدھی راتوں کو تجھے لوریاں دیں

یہ سب کچھ تجھے اُس وقت بخشوں گی

(کہ) آج گایوں کو سالم لے آ

ورنہ اپنا انمول سر قربان کردے

اب ذرا ساس کی آمد دیکھیے۔اس کا ضرب المثل ہونے والا شعر بھی دیکھیے:

وسّیا مزن شانینا

دُشکیشا گراں نازینا

''آں مڑکہ کناں باہوتاں

نیم روشاں نہ ریشاں وہاواں''

ترجمہ:

بڑی شان والی ساس نے (کہا)

''جو لوگ قاتلوں کو اپنے پاس باہوٹ (پناہ گزیں) رکھتے ہیں

وہ قیلولہ نہیں کیا کرتے ہیں''

تو؟۔تو اب تو ایک ہی ذات کے مرّے ہونے والے تھے۔ایک ہی فرشتے کا جشن ہونا تھا، موت کے فرشتے کا۔سب معروض اُسی طرف تو بٹتے بُٹتے جاتے تھے۔بلوچ چہار اطراف سے اپنے بیٹے کو متحرک و مہلک بناتا رہتا ہے۔اب دودا کی اہلیہ جا کر دودا کی گھوڑی کی منتیں کرتی ہے:

دروہی داثغاں ملّا را

''گیرار تہ منی تیماراں

بانگی سری ساڑتیں آف

میثی دُمغ و ماہیلو

داشتوں جہازی سرکاں

داں ماں تیرغاں لعلیناں

آف مس پچھی کو ڈی آں

داثاں پہ دلیے راضیاؔ

تہ یہ یکہ کثو شنگیثاں

بوئر تو فربہ اوپہ زور بۓ

کہ روشے پکّر ۓ دودایا

مس سیالی شدت و شاروآں

آں روش مروشی آتکہ

جاہے گوں کفئے گوخاں را''

ترجمہ:

گھوڑی کو واسطے دیے

''میری خدمات یاد کرو

وہ ٹھنڈا پانی جو میں سر پر ڈھو کر تمہیں پلاتی رہی

تم بیمار ہوتی تو تمہیں دبنے کی چکی اور چرب شوربہ بطور دوا پلاتی تھی

بڑے بڑے برتنوں میں

بہت خوب صورت توبروں میں تجھے دانہ کھلاتی رہی

چمکتے صاف برتنوں میں پانی پلاتی رہی

دل کی گہرائی سے تمہیں کھلاتی تھی

تم ایک ایک کر کے بکھیر دیتی تھی

مقصد تو یہی تھا کہ تم فربہ اور طاقت ور بنو

اور کسی دن دودا کے کام آؤ

اس کی دشمنیوں میں، مصیبت کی گھڑیوں میں

وہ دن آج آ گیا

بس کسی طرح دودا کو سمی کی گائیوں تک پہنچا دو

اس مختصر عرصے کا بیانیہ تو آپ نے پڑھا۔ اب ذرا دودا کا ردعمل بھی دیکھیے:

دودا زہرینی پاذ اتکہ
شیمو شے کشئی شکرائی
سنج اے زڑتغاں سُرخی ئے
واغے گپتغاں سُرخی ئے
جلدی تہ مناں پُجینئے
گوں گوخ و کمبریں کاریراں

ترجمہ:

طیش بھرا دودا اٹھ کھڑا ہوا

شاہین کی طرح جھپٹا

سرخی نامی اپنی گھوڑی کی زین اٹھا لی

اس کی باگ تھام لی

''جلدی تم مجھے پہنچاؤ

گائیوں تک، دھاری دار بیلوں تک''

اب آپ بلوچی کلاسیک کی مکالمہ بازی بھی ملاحظہ فرمائیں۔ انسانوں کے بیچ تو مکالمہ ہوتا رہتا ہے، ہمارا ادبی ورثہ تو جانوروں بے جانوں کے مکالموں سے بھرا ہے:

ایذا گال کشہ سرخیاّ
واژہ تہ منی میربی نند
مئیں جھٹ و جھمبغ و پنڈہاں گند

ترجمہ:

یہاں سرخی بول پڑی

''اے مالک، تم بس نوابوں کی طرح مجھ پر بیٹھ جاؤ

اور پھر میرا لپکنا، جھپٹنا اور رفتار دیکھو

تخلیق کار تو اپنی فن کاری کرتا جاتا ہے۔ ادب سوکھا امتحانی جوابی مضمون نہیں ہوتا۔ اور ادب کے ممتحن بھی زنگ آلود ذہنوں والے ناترس ناقد نہیں ہوتے۔ یہ خالق وخلق ومخلوق کا سہ طرفی رشتہ ہوتا ہے۔ ہر مصرع اپنے عہد کے سماجی شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ دودا گھوڑی پر سوار ہوا، تو اس کی بیوی آئی، اس نے گھوڑی کی لگام پکڑ لی اور کہا:

دُر گوشیں جنک پاذ آتکہ
شار ئے پلوا چَنڈا ناں
پاذ ئے موژغاں منڈاناں
واغے گپتغاں سُرخی ئے
دروہی داشئی دودایا
''تاہر پہ پذی امراہاں
ہلکانی گہیں مڑبیایاں
اگھ روغ ترازیاں داری
پذ کنزغ تراعیوہ بیٔ''

ترجمہ:

بالیاں پہنی خاتون اٹھی

اپنا دوپٹہ جھٹکتی ہوئی

پیروں کے موزے ٹھیک کرتی ہوئی

اس نے سرخی کی باگیں تھام لیں

اس نے دودا کو واسطے دیے

''ٹھہر جاؤ تاکہ باقی ہمراہ بھی آجائیں

گھروں سے اچھے آدمی آجائیں

آگے جانے میں نقصان کا اندیشہ ہے

اور پیچھے ہٹنا عیب کی بات ہوگی

دودا کے لیے یہ الفاظ ناقابلِ برداشت تھے۔ وہ جل بھن اٹھا۔ اس نے اسے جواب دیا:

تیرانوں مجس کجل چم

پذ گوانکاں مخن مَوثارا

نیں گڈی موکلیں میخ و تئ

ترجمہ:

مجھے تیر نہ مارا ے کاجل بھری آنکھوں والی

موت کو پیچھے سے آواز نہ دو (یہ ایک براشگون ہوتا ہے)

اب یہ تیری میری آخری ملاقات ہے

اس کی اہلیہ اسے پھر سمجھاتی ہے:

''تہ کہ چورو ئے تاشاناں

اوذا گوں کفئے حونی آں

دودا گوخاں چوں پذا گرڑدیئے

ترجمہ:

تم جو یوں (اکیلا) سرپٹ وہاں جاؤ گے

اور وہاں خونی دشمنوں تک پہنچ جاؤ گے

تو کیسے (تنہا) گائیاں واپس لاؤ گے'

اللہ اکبر! قبائل میں کون سا ایسا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام ہے، جو ایک مقررہ کوڈ کے مطابق نہیں ہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ دودا پہلے باقی قبیلے والوں کی تشریف آوری کا انتظار کرتا۔ بھئی حملہ آور کا، استحصالی کا، لٹیرے کا ہاتھ پکڑنے کے لیے لپکنا ہے، ہر کسی کو، دودا کو بھی، اور باقی برادری کو بھی۔ جس کو جونہی خبر ہوئی نکل پڑا۔ استری شدہ کپڑے بدلنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اسی لیے دودا آگ بگولہ ہو گیا:

جان و سومری ماہیں دوست

منی زیندھا راجشئے چاپولے

دیم کنزا سروں زیاں داریں

پذ کنزغ مناں گراں بوشتی

یا گوخاں سرجمی ءَ کاراں

یا ہَیسی ایں سرہ زیاں داراں

نشکے بیث پذی آوَ خاں

ترجمہ:

میری جان اور ماہ جیسی حسیں دوست

تم نے میری زندگی کو ایک تھپڑ رسید کیا

(کہ) آگے بڑھنے سے میرا سر جائے گا

پیچھے ہٹنا مجھے گراں لگتا ہے

یا گائیں سلامت لاؤں گا

یا اپنا انمول سر تج دوں گا

جو بعد میں آنے والوں کے لیے نشان رہے گا

بہرحال دودا دشمنوں کا پیچھا کرتا ہے۔ اُس کی گھوڑی اپنے عہد پر پورا اترتی ہے اور ''گرم آف'' نامی مقام تک سرپٹ دوڑتی اُسے دشمن تک جا پہنچاتی ہے:

گڑدیں گمبذاں جاڑ یناں
گرمافہ دفئے پاذ یناں
سیاہ آفئے تنگّیں گرّاں
آڑ تو دڑمنا گوں داشئی
گوانکیں لنڈراں شومیناں
دودا آڑتغ و لہڑ یناں
سرخیا سبک گامینا
دودا ننگریں گوں کپتہ
ہالوئے جشئی ورنائی
تیغاں چاپ جثہ سوزیناں
ہندی آں طلا مُشتیناں
دودا ژہ پرنگئے زینا
زڑتہ گونڈلاں زِور یناں
ہِندی آں جُثو پرّینتہ
گوں شلّیں نیز غوکا ٹاراں
رتکنت روذن ورنگیں تیر
سوہر نگئے کش و پہناذا
دودا گوں شہیذی ہوناں
کپتو ماں پڑا شمبیا

ترجمہ:

جڑواں گول گنبدوں تک
جوگرم آف کے دہانے پر ہیں

سیاہ آف کی تنگ گھاٹیوں میں
گھوڑی نے لاکر مجھے پہنچادیا
بدقسمت لٹیروں نے ایک دوسرے کو بتادیا
بچھرے ہوئے دودا کو
سبک گام سرخی نے لاکر پہنچادیا ہے
بہادر دودا آن پہنچا
اُس نے نوجوانی کا طربیہ گیت گایا
تیغوں نے باہم رقص کیا
طلائی دستوں والی تلواروں نے
دودا کو گھوڑی کی زین پر سے
تیز نوک دار تیروں نے آلیا
تلواروں نے اسے کاٹ ڈالا
نیزوں اور خنجروں نے
اس پہ رنگ برنگے تیر برسے
سرخ رنگ گھوڑی کے آس پاس
دودا شہیدی خون میں لت پت
گر پڑا جنگ کے میدان میں کٹی شاخ کی مانند

دودا کے چھ بھائی تھے۔ بالاچ سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ وہ اُس وقت بہت کم سن تھا۔ اسی لیے وہ اس لڑائی میں شامل نہ ہوسکا تھا۔ بلوچ کلاسیک میں ہر واقعہ کا شعری ثبوت ضرور منسلک ہوتا ہے ۔ایک ایک Move ‘ایک ایک منظر نامہ شعر کے تصدیق نامے سے مزین ہوتا ہے۔ جنگ میں دودا اور دوسرے سب بھائی قتل ہو جاتے ہیں۔ وہ بچ جاتا ہے، اس لیے کہ کم سن ہوتا ہے۔ کم سن پر ہاتھ اٹھانا تک بلوچ اخلاقی ضابطہ میں گناہِ عظیم ہوتا ہے، اُس پر تلوار اٹھانا تو بہت بے غیرتی میں آتا ہے۔

آں روشا کہ تہ کہ کشتغئے
اوذا مس گرم آفہ ڈلا
سمّی ئے گوخانی سرا
مس وث کسانغ بیثغاں
تئ ملھئے پذا گوں کپتغاں
گوئشتہ تہ بالاچ برو پذا

ترجمہ:

اُس روز جب تم مارے گئے
وہاں گرم آف کی چٹانوں کے بیچ
سمی کی گائیوں پہ
میں بہت چھوٹا تھا
جب تم تک پہنچا
تم نے کہا، بالاچ گھر لوٹ جاؤ

چند سال بعد بالاچ جوان ہوا تو جا کر سخی سرور کے دربار میں بیٹھ گیا کہ انارکی اور نراجیت میں کمزوروں کا مددگار اور کون ہوگا؟ اللہ کا آسرا ہوتا ہے یا پھر اُس کے کسی برگزیدہ ولی کا۔ بس ڈھارس ہی چاہیے ہوتی ہے۔ اپنی توانائیوں کو مجتمع کرنے کا جواز چاہیے ہوتا ہے۔ بالاچ صبح شام دربار میں سوالی رہا کہ اسے اس طرح کی طاقت ملے کہ وہ اپنے بھائیوں کا انتقام لے سکے۔

کہتے ہیں کہ وہ تین سال تک مسلسل وہاں رہا اور اپنی داڑھی سے دربار میں جھاڑو دیتا رہا۔

میں نے شاہ کے دربار میں پناہ لی
اور اس کے آستانے میں امان پائی
زائرین کے لیے پانی ڈھونڈتا رہا
بکری کے لیلوں کو چراتا رہا

خیرات کے ٹکڑوں پر پلتا رہا
کھردرے کپڑے پہنتا رہا
اور رسی گلے میں ڈال کر دعائیں مانگتا رہا

تا آنکہ ایک رات خواب میں سخی سرور نے اسے بشارت دی کہ وہ جائے اور دشمن سے بدلہ لے۔ اس کو تیز دوڑ سکنے کی کرامت ملی۔ دوڑ میں اُس کا کوئی ثانی نہ ہوگا نہ ہرن، نہ چیتا۔ البتہ اسے یہ تنبیہہ ضرور ہوئی کہ وہ دن کے اجالے میں جنگ نہ کرے۔

بالاچ بہت خوب صورت منظر کشی کرتا ہے۔ جب وہ اپنے علاقے اور گھر سے دور سخی سرور کے مزار پر دشمن کے خلاف غیبی طاقت کے حصول کے لیے پڑا رہتا تھا اور بڑے عرصے کے بعد اپنے علاقے کو لوٹ آیا اور جنگ و جدل کے لیے تیار ہوگیا۔ تو اُسی کے الفاظ میں دیکھیے کہ اس کے گھر کی حالت کیا تھی!!:

مس کہ دراژہ آتکغاں
شش گلّہ گنداں دفسرا
شش کاڈہ گنداں سردرا
بچان اوں گندان شینگلا
وہاو ہ رونت روشہ سرا
(تئ) زالیے ضعیفیں گریویغاں
دوستہ نہ رندی مہپراں
ژنگہ نہ نخت کوفغ سراں
بوراں مس گنداں بستغا
آ نھیزغاں روشہ سرا
جوائیں جناں مونگاڑویں
تفسی منی ڈیل ملغی

مس کورو کہیریں ہنگراں
مومی حلہ بیث و رِشی
دودا تئ لوہیں کماں
لوہیں کماں گوں جا بہا
دڑدانت مس بالاچہ دلا
تئ ہول دُمبیاّں بڑتاں
مس دیروا دست دست کثاں
کاڈاں پہ رشیف دیثغاں
انڑزی ئے ہونیں گریثغاں

ترجمہ:

میں جب باہر سے آ گیا
چھ خیموں کو بے مالک دیکھتا ہوں
چھ عورتوں کو ننگے سر (بیوہ) دیکھتا ہوں
بیٹے خستہ حال ہیں
دھوپ میں سوئے ہوئے
(تمہاری) بیوی کے رونے کی ضعیف شدہ صدائیں سنتا ہوں
وہ اپنی زلفوں کو سنوارتی نہیں
انہیں اپنے شانوں پہ بکھیرتی نہیں
تیری گھوڑیوں کو دیکھتا ہوں بغیر چارہ فاقہ زدہ
دھوپ میں بندھی
اچھی عورتوں کو ماتمی دیکھتا ہوں
(تب) میرا سورمائی بدن آگ بگولا ہوتا ہے

یہ کوراور کہیر کے آتشیں انگاروں میں
موم کی طرح حل ہو ہو کر گرنے لگتا ہے
یہ سب کچھ درد ہے بالاچ کے دل میں
تمہارے ہتھیار دشمن لے گئے
وہ انہیں اپنی بستی میں ایک ایک کر کے دیکھتے ہیں
دوشیزاؤں نے نزاکت سے اُن کا معائنہ کیا
اور خونی آنسو بہائے

بالاچ کی شاعری، تخیل کی گہرائی کا لاثانی شاہ کار ہے۔ ایک ایک منظر، ایک ایک مصرع گہری آہ نکالنے پر مجبور کرتا ہے۔ جذبات کی اس قدر لطافت کے ساتھ ادائیگی؟ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ذرا تفصیل بیانی دیکھئے، کس طرح بالاچ بھائی کی قتل کردہ لاش کی حالت کو تصور کرتا ہے:

دودا تئ کونڈی کفغ
ایر مالغ و دستئے ملغ
دودا تئ کوری کُشغ
ہثم انت مس بالاچہ دلا
پیڑ وں فراموشہ نہ ونت
مس گوں بذاں چونہ کناں
دودا تئ جوریں دژمناں
مس گوں بذاں ہنچو کناں
دودا تئ جوریں دژمناں
بانز گوں کفوتی ولہراں
بزگوں کہیری ڈھنگراں
گرم گوں تنکّیں چلہراں

میذاں گوں ماہی آں کشہ
ہوکاں کشہ گوں اُرزُناں
گرک گوں مزں چیڑیں جڑاں

ترجمہ:

دودا تیرا گھٹنوں کے بل گر جانا
بے بس، ہاتھ ملتے ہوئے
دودا تیرا بے دردی سے قتل
دائمی درد ہیں بالاچ کے دل میں
کسی صورت فراموش نہیں ہوتے
میں دشمن کے ساتھ کیسا کروں گا؟
دودا تمہارے دشمنوں کے ساتھ
میں دشمن کے ساتھ ویسا ہی کروں گا
دودا تیرے دشمنوں کے ساتھ
(جیسے کہ) شاہین کبوتروں کے جھنڈ کے ساتھ کرتا ہے
جیسے بکریاں کہیر کی نازک کونپلوں کو چٹ کر جاتی ہیں
جیسے گرمی پتلی چادروں کے ساتھ کرتی ہے
جیسے ماہی گیر، مچھلیوں کے ساتھ کرتا ہے
جس طرح سؤر فصلوں کے ساتھ کرتا ہے
جیسے بھیڑیا، بڑی چکیوں والے برّے سے کرتا ہے
میں دشمن کے ساتھ ایسا ہی کروں گا
دودا تیرے زہریلے دشمن کے ساتھ

اب عمل کا وقت ہے ۔ ساری تیاریاں معمولی باریکیوں تک مکمل ہو جاتی ہیں۔ بالاچ جسمانی جذباتی ہر لحاظ سے ڈین بن پھُو سجانے کو فیصلے کی آستینیں چڑھا دیتا ہے۔ وہ انتقام کا ارادہ کس طرح کرتا ہے، وہ سارے نتائج خدا پر چھوڑ کر خود ہمت کی کمر کس لیتا ہے۔ اُس کا پیغامِ عام ہے دشمنوں کے لیے:

نوذاں شوا کہ رئیں گواراناں
پیغاماں بریں جوریناں
لڈو لڈ کنو نزی بیا
نزی بیا پرے دعویٰ یاں
کہ مٹ گیژوں یلیں ورنایاں
باریں کہ ھذا چونہ کنت؟
جنگاں کئی دفہ حونہ کنت؟
مال و ملک کئی بہرہ باں؟
سوبا گوں کئیا گونہ کاں؟
کئی زال گوں غماں سیغہ کاں
کئی زال گوں گلاں لیو ہ کاں؟
شو اکہ ہمے مڑ کُشتغنت
زاناں بلوچ بے واژہ انت؟

ترجمہ:

بادلو! تم جو برستے جاتے ہو
(دشمن تک) میرے زہریلے پیغام لے جاؤ
(کہ) پڑاؤ ڈالتے قریب آجاؤ
قریب آجاؤ جنگ کے لیے

کہ ہم بہادر جوانوں کو باہم گتھم گتھا کر دیں

دیکھیں کہ خدا کیا کرتا ہے؟

جنگوں میں کس کا منہ خون سے بھر جاتا ہے؟

مال جائیداد کس کی تقسیم ہوتی ہے؟

فتح سے کس کو ہمکنار کرتا ہے؟

کس کی بیوی کو غم سے سوگ کراتا ہے

اور کس کی بیوی پھولوں سے کھیلتی ہے؟

تم نے جو آدمی مارے

تمہارا کیا خیال ہے بلوچ بے وارث ہیں؟

ایک دفعہ حالات ایسے ہوئے کہ اس نے دن دہاڑے ایک بلیدی کو قتل کر دیا۔ سخی سرور کی روحانی بالادستی مجروح کرے گا تو بالاچ عبرت کدہ نہ بنے گا کیا؟ بلیدیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ بہت مشکل سے اس کی جان بچ گئی۔ تبھی تو اس نے یہ ضرب المثالی بات کہی تھی:

شاہی توبہ ایں بالاچا

روشہ ریملاسیں جنگا

ترجمہ:

شاہی توبہ ہے بالاچ کو

دن دہاڑے کی جنگ سے

بالاچ نے سائرا مائسترا سنبھال لیا۔ وہ اور نخیفو ملک الموت کا تختہ الٹ کر اُس کا چارج سنبھال چکے تھے۔ وہ بلیدیوں پر شب خون مارتا رہا، ٹارگٹ کلنگ کے انداز میں۔ اس پوری جنگ میں نخیفو اس کا ساتھی و برامدغ رہا۔ وہ دن بھر اُن کی جاسوسی کرتا اور رات کو جا کر تلوار سے اپنے نشانے کا کام تمام کر دیتا۔

کہتے ہیں کہ ایسف بالاچ کے بچپن کا دوست تھا جو خود تو بلیدی نہ تھا مگر رشتہ داری کے

سب وہیں بلیدیوں کی بستی میں رہتا تھا۔ بالاچ اور نخیفو عصر کے وقت گھروں کی جاسوسی کے لیے نکلے تو ایسف سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ایسف کو نہ مارنے کا معاہدہ ہوا۔ نشانی یہ ہو گی کہ ایسف اپنی ڈھال خیمے کے سامنے لٹکا دے گا تا کہ اُس کے خیمے کی شناخت ہو سکے۔ مگر ایسف یہ راز کی بات بیوی کو بتا دیتا ہے۔ اور جب سب سو جاتے ہیں تو وہ بیوی اپنے خیمے کے سامنے لٹکائی ہوئی ڈھال نکال کر اپنے بھائی بیورغ (جو کہ بالاچ کے دشمنوں کا بڑا ہے) کے خیمے کے سامنے لٹکا دیتی ہے۔ موت بانٹنے والا بالاچ آتا ہے تو نشانی کے عین مطابق ڈھال والے خیمے کو کچھ نہیں کہتا، دوسرے خیمے کے مکین کی روح قبض کر لیتا ہے جو ایسف ہوتا ہے۔ یوں ایسف مارا جاتا ہے اور اس کی بیوی کا بھائی بچ جاتا ہے:

بیا نخیف بیگھا حلمہ اے بیاروں

مادِہ گوں جنگانی نخیفو آ

کا تکوں پہ ہادی بارغئے لٹا

ایسف گوں زڑدیں دیغرے دیشیں

نشتغہ سر سایا کلیر یغا

حلمہے ما گوئر ایسفا آڑتہ

نہیشتغاں جنگانی نخیفو آ

مہل کس مرشی مڑکشیں بالاچ

اے تئ جندہ بنگویں براتے

گوئشتہ ماجنگانی نخیفو آ

ایسفا کلّوں ایش رَو دراہا

روث وثی حلقا دامنی حالا

گپتہ ما قول و ایسفئے اقرار

اسپر ءِ درائیں کشہ گُلّ ءَ

شف میغ اِن وروش بذوآنی
نشتغوں ما کہ ایرِ بروں روشا
ایرِ کفی روش و درکفاں اِستار
آتکو ہلکئے گواث گریں گپتہ
یک دمے مُرگ وہاوے کشیں اوذا
مارموئشہ جنگانی نخیفو آ
شف زمستانی جینہراں بندی
لدّویں بینگ شہ ہلمہ وجھٹاں
گوں لحیفانی دامنا کر شکنت
پالوے پیلو شنت کرغ شوشیں
ما نخیف جنگانی درا اِشتہ
کاتکوں ما گور دیرو ے میری
کاتکوں ما گوئرگورغیں گُلّے
گڈثیں گُل ئے بانزری چپیں
گوں کانٹکا لیٹیں تَیں لحیف لالیے
زال و مڑدانی چھروے گپتیں
جابھا تیرے پہ گشیں کشتیں
کاسغ کیلاتیں کماں سانڈیں
زنڈگوں پیڑداریں بناداثیں
بڑزِہ جیغا ماں ڈوبراداشتیں
پاندے گوں گوئر پاندا اڑائینتیں
ٹیکغے سیوانڑیں جغا اشتہ

کہ آسنا ششکانیں تغڑ دگپتہ
ایش ژہ مسکیفاں رہائینتہ
اے جنا مڑدے تی بہا ئینتہ
سہ چیار ٹِپ چو آسکی داثیں
کاتکاں گورجنگانی نخیفو آ
رپتغوں جوانیا نگوشانا
اومرا پہناذی جثہ گوانکے
او مڑایانی مڑکشیں بالاچ
ایسفا کُشتو تہ روغایئے
اے پثی راجی بنگویں ہوتے
نشتغ و گوئرماپہ جنی سانگے
نا گمانیا گونڈلاں بستئے
ماجوا وے چو عمر ا داثہ
ایسفا قولانی بلہ زڑتہ
حال گوں لوغئے مڑدماں داثہ
کئے وثی موڑانی دلہ حالا
داث وثی سیاہ مار واڑتغیں زالا
مڑدکُشائینتو در بڑتئ براثی

ترجمہ:

آؤنخیف ایک حملے کی منصوبہ بندی کریں
میں اور جنگجو نخیفو
پہاڑ کی بلندی پر آ گئے

عصر کے وقت ہم نے ایسف کو دیکھا
وہ کلیر کے درخت کے سائے میں بیٹھا تھا
میں ایسف پر حملہ کے لیے جھپٹا
مگر جنگ جوخیفو نے مجھے روک دیا
آج رک جاؤ مرد کش بالاچ
یہ تو تمہارا اپنا بھائی بند ہے
میں نے جنگ جوخیفو سے کہا
ایسف کو اگر چھوڑ دیا
تو وہ جا کر اپنی بستی میں خبر کر دے گا
ہم نے ایسف سے قول لے لیا
نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے خیمے کے سامنے ڈھال لٹکا دے گا
(تا کہ تاریکی میں وہ نہ مارا جائے)
رات ہماری ہے اور دن، دشمنوں کا
ہم انتظار کرتے رہے غروبِ آفتاب کا
سورج غرب ہو جاتا ہے اور ستارے نکل آتے ہیں
ہم آ کر بستی کے قریب بیٹھ گئے
چڑیا جیسی معمولی نیند کر دی
مجھے جنگ جوخیفو نے جگا دیا
زمستانی رات طوالت لیتی ہے
لپکنے اور حملہ کرنے والے فربہ کتے
لحافوں کے قریب ترچھے آڑے پڑے سو رہے ہیں
اس قدر سردی کہ اک کے درخت جل جاتے ہیں

میں نے جنگ جوخیف کو باہر چھوڑ دیا
میں بستی میں چلا گیا
ایک خیمے کے پاس
میں نے اس کے بائیں طرف کی رسی کاٹ دی
احتیاط سے رضائی کا کونہ اٹھا لیا
مرد اور عورت کا چہرہ دیکھا
میں نے چُن کر ایک تیر نکالا
میں نے اپنی کمان سونت لی
میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا
کمان میں نے اوپر سینے کے ساتھ لگا لی
اچھی طرح شست باندھ لی
کمان سے ہلکی سے آواز آئی
تیر کا آہنی سرا اپنے نشانے پر لگ گیا
اس کو تو میں نے خوش خبریوں سے نجات دلا دی
اس عورت کو تو اب نیا شوہر کرنا ہو گا
میں نے ہرن کی طرح تین چار چھلانگیں لگائیں
میں جنگ جوخیفو کے پاس جا پہنچا
ہم چلتے رہے اور غور سے سنتے رہے
عمر نے طنزیہ پکارا
''اے بہادر مرد کُش بالاچ
تم تو ایسف کو مار کے جا رہے ہو
یہ تو رشتے میں تمہارے اپنے قبیلے کا ہے

ہم میں تو اس نے محض شادی کر لی
تم نے نا گمان اُسی کو تیر مار دیے''
میں نے عمر کو جواب دیا
''ایسف نے قول کی بلائیں لیں (قول توڑ دیا)
اس نے گھر کے افراد کو خبر کر دی
کون اپنے موجی دل کی باتیں
اپنی سانپ کاٹے بیوی کو بتائے گا
اُس (عورت) نے شوہر مروا کر بھائی بچالیا''

ایک رات حملے کے وقت بیورغ جاگ گیا۔ اس نے بالاچ کو دیکھ لیا اور قبل اس کے کہ بالاچ موت آور حملہ کرتا، بیورغ نے تیر کمان سے بالاچ کو نشانہ بنایا۔ تیر بالاچ کی ٹانگ پر لگا۔ حاضر دماغی دیکھیے کہ بالاچ کتے کی آوازیں نکالتا ہوا چوپائیوں کی طرح بھاگ گیا اور نخیفو تک پہنچا جس نے اسے اٹھا لیا اور محفوظ ٹھکانے تک پہنچایا۔ صبح بستی کی عورتوں نے بیورغ کو طعنے دیے کہ تم لوگ اس قدر خوفزدہ ہو گئے ہو کہ اب کتوں کو بالاچ سمجھ کر مارنے لگے ہو۔

یہ تو بعد میں عقدہ کھلا کہ وہ کتا نہ تھا بلکہ وہ تو بالاچ تھا جس نے کتے کی آوازیں نکال کر اپنی جان بچالی۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ بالاچ تھا تو بیورغ نے بالاچ کو طعن بھرا ایک ادبی شاہ کار پیغام بھیجا۔ اس قدر خوب صورت، اس قدر رواں، اس قدر جاذب و دلکش اور اس قدر بلوچیت میں لپٹی پُر معنی شاعری صرف بلوچی کو نصیب ہونا تھی:

پیغام کہ بیورغا کشہ
نوذاں منی دروتاں بریں
مسکیں سلاماں گوں درزاں
بالاچہ تیغاں سرکنیں
''تہ کاتکئے تہار ماہیں شفاں
ترا تیرے نکشتیا جثوں
بینگی کلوں زاٹے کشئے
پر ساہ تئی نخیفا در بڑتہ
بالاچ مزار استیز غئے
کائیے چو دُزیں تولغئے
براہندغاں وہاوٗ کُشئے
مڑدی مڑغ ہنچو نہ وی
تہ ہکّل و دئے بیا پہ مڑغ
ورنا تئی اکّھا در کفاں
دستاں جغر بُراں جناں

ترجمہ:

بیورغ نے پیغام بھیجا
اے بادلو، میرے درود لے جاؤ
اپنی تیز برسات کے ساتھ میرے سلام لے جاؤ
بالاچ کی تلوار تک پہنچاؤ
تم اندھیری راتوں کو آ جاتے ہو
میں نے تمہیں اندازے سے تیر مار دیا
تم نے کتے کی آواز میں فریاد کی
مگر تمہاری جان نخیف نے بچالی
اے شیر بالاچ، تم لومڑی ہو
چور گیدڑ کی طرح آتے ہو
اچھے ساتھیوں کو سوتے میں قتل کرتے ہو

بہادروں کی لڑائی ایسی تو نہیں ہوتی
تم خبردار کر کے لڑنے آؤ
(تو) نوجوان تمہارے سامنے نکل آئیں
اپنے ہاتھوں میں جگر بُر لے کر

اس پیغام کے جواب میں بالاچ خود ایک پیغام بھیجتا ہے، رواج سے کج روی کرنے کے الزام میں اپنی صفائی پیش کرتا ہے۔ ذرا وکیل کے دلائل تو دیکھیے، ذرا دوستوئفسکی کا ادبی لہجہ تو پڑھیے، ذرا بالاچ جیسی بلوچیت تو دیکھیے:

پیغام بالاچا کشہ
نوذاں منی درو تاں بریں
مسکیں سلاماں گوں درزاں
بیورغہ زحما سرکنیں
بے عقّلی شیراں جنئے
ہنچو دفا چوٹہ کنئے
نَیں بورگوناں دَہ صذی
نَیں لشکر ے گران و بزیں
مس گوں وثی ہَیسی سرا
ہر شف چو بشامی جُڑا
بندان و کایاں پہ مڑا
جنگے نہ داثوں تولغی
شیری او بھور نیتوں بذی
مڑداں شغاناں چی مہ جن
دو پہ دو اوں ماخ و نخیف
ہوں گیر وثی ہونہ گرنت
دڑ د گوں وثی دستاں مراں

دودا ئے زر مُشتیں لُڑا
بیورغہ سانڈی گرڑدنا
شش مڑد بلوچی گھوڑوے
تہ کُشتہ پذی چندر انہ کُث
جنگھان و مسکیں کاوڑی
دودا گوں جامیں اومرا
تہ تورو منی چکّا کشئیں
شوادیشہ کہ دودا زہریئیں
گوں آشفتغی آ آتکغہ
تہ ملیے گَشا ورتی جثیں
ملّا بلاں ہوں گُل گل کشئیں
دودا گوں جامیں او مرا
تہ بِشتیں کہ بیا تکاں پیاذغا
گوں سہرو لعلیں موژغاں
تہ مادِہ گنزڑے دوہمی کشئیں
ماث پہ پُسغاں حیراناں
گہار پہ چوٹ بروتیں براثاں
وسی پہ وثی زاماثاں
کاڈ پہ سملیں قولی آں
مس پہ سوہرنگ ودودایا

ترجمہ:

بالاچ نے پیغام کیا
بادلو، میرے درود لے جاؤ
تیز برسات کے ساتھ میرے سلام لے جاؤ

بیورغ کی تلوار تک پہنچا دو
''تم بے عقلی کی باتیں کرتے ہو،
ایسے ہی منہ ٹیڑھا کر کے
نہ مرے پاس قیمتی گھوڑے ہیں
نہ میرے پاس بھاری لشکر ہے
میں تو اپنے تنہا انمول سر کے ساتھ
ہر رات ساون کے بادل کی طرح
بہادری سے ارادہ کر کے آتا ہوں
میں نے گیدڑوں والی جنگ نہ کی
میں نے شیر کی طرح دشمن کو توڑ ڈالا
بہادروں کو طعنے نہ دیا کرو
ہم صرف دو ہیں، میں اور نخیف
خون کا بدلہ لینے والے اپنا انتقام لیتے ہیں
انتقام کی آگ اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے بجھتی ہے
دودا کے روپہلے دستے والی تلوار سے
بیورغ کی سانڈ جیسی گردن (اڑا دوں)
چھ آدمی تو بلوچی لشکر ہوتے ہیں
تم نے چندرام کو مار دیا
جنگھان کو کاوڑی کو
دودا کو، وجیہہ اومر کو
تم نے مجھ پر احسان کیا ہوتا
جب تم نے دیکھا تھا کہ دودا نمودار ہو گیا

غصے سے بپھرا آیا ہے
تو تم اس کی گھوڑی پر نشانہ باندھتے
گھوڑی خون کے غرارے کرتی
دودا اور وجیہہ اومر کو
تم زندہ چھوڑ دیتے کہ پیدل آجاتے
اپنے سرخ موزوں کے ساتھ
تب تو میں بھی کوئی اور بات سوچ لیتا
(مگر یہاں تو) مائیں اپنے بیٹوں کی منتظر ہیں
بہنیں تاؤ دی ہوئی مونچھوں والے اپنے بھائیوں کے لیے
ساس اپنے داماد کے لیے
دوشیزائیں قول کے پکے اپنے محبوبوں کے لیے
اور میں سہرنگ اور دودا کے لیے

بالاچ انتقام گیری کا اب تک کا سب سے بڑا سپیشلسٹ ہے۔ وہ گوریلا جنگ کا سب سے بڑا ماہر ہے۔ وہ انتقام کے درد سہنے کا سب سے بڑا ماہر مریض ہے، اسے پتہ ہے کہ انتقام کتنی قربانیاں مانگتا ہے:

آں   مڑدکہ   گارانہ   گراں
سجیں   شفاں   آہاں   کناں
پہ   دژمناں   نیشاں   دُرشاں

ترجمہ:

وہ لوگ جو انتقام لینے کا ارادہ رکھتے ہیں
(تو) وہ ساری رات آہیں بھرتے ہیں
اپنے دشمنوں کے خلاف دانت پیستے رہتے ہیں

بالاچ بہت ہی عمدہ شاعری کرتا ہے۔ معنی سے بھری شاعری، گہری، رواں اور فلسفیانہ۔

یہی بالاچ کیا عمدہ بات کرتا ہے:

کوہنت بلوچانی کلات
انبارش بے راہیں گراں
بڑزیں اشی اِش گواث گراں
آفش بہوخیں چمغاں
قدّح پیشیں کنڈغاں
بور اش سفیشیں چبواں
بھوف اش ڈغاری تاثغاں
نشتیں جنی کر کاوغاں
سڑ جاہ کلیریں بنڈ اثاں
امبل منی سانڈھیں جُغاں
نچ اِش گشینی گونڈلاں
برازاتک شلیں خنجراں
براث اش تلا ریں اسپراں
عاریف مزں تاپیں لُڑاں

ترجمہ:

پہاڑ بلوچوں کے قلعہ ہیں
اُن کے انمول خزانے دشوار گزار چٹانیں ہیں
بلند چوٹیاں انہیں ہواؤں سے بچاتی ہیں
ان کا پانی بہتے چشمے ہیں
ان کا کٹورا (آبخورے) مزری کے پتے ہیں
سفید چپلیاں اُن کی سواریاں ہیں

ان کے گدّے زمین کا کنارہ ہیں
نیچے بچھی قالین کرکاوغ نامی جھاڑیاں ہیں
کلیر نامی درخت کے تنے ان کی بالشت ہیں
مضبوط تیر کمان، ان کے بیٹے ہیں
منتخب تیر اُن کے بیٹے ہیں
تیز دھار والے خنجر ان کے بھتیجے ہیں
چوڑی ڈھالیں اُن کے بھائی ہیں
چوڑے پھل والی تلواریں ان کے باپ ہیں

بالاچ قتل وقتال میں بوڑھا ہو جاتا ہے۔ بالآخر دو نوجوان اسے قتل کرنے آجاتے ہیں۔ اسے خبردار رہنے (ہگّل دیغ) کا چیلنج کرتے ہیں مگر بوڑھے بالاچ نے کہا، میں بہت بوڑھا ہوں، سُن نہیں سکتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہ اس کے قریب آ کر کان میں اسے کہنے لگتے ہیں، تب وہ استرا نکال کر اُن میں سے ایک کا گلا کاٹتا ہے اور دوسرے کو شدید زخمی اور خود بھی قتل ہو جاتا ہے۔

دیکھئے' کیا نتیجہ نکالتے ہیں بلوچ!

آں مڑ کہ شہذانہ وراں
جوراں ضرور بہرہ کناں

ترجمہ:

وہ لوگ جو شہد کھاتے رہتے ہیں
ایک روز انہیں زہر بھی ضرور پینا پڑے گا

اس طرح بالاچ، 61 آدمی مار کر مر جاتا ہے۔

اس کی قبر سنگسیلا میں ہے۔

سیمک و نتھا

Saimak O Naththaa

بلوچی قدیم ادب میں جن دو چار خواتین نے شاعری کی (یا جن سے منسوب کی گئی) اُن میں سیمک کا لہجہ بالکل جدا ہے۔ اس کا غم ہی جدا ہے۔ بلوچ شاعری میں محبت کی نوحہ گری بہت کم دیکھنے میں آتی ہے؛ ماسوائے سیمک کے۔ اسی لیے وہ بہت نازک احساسی کے ساتھ غم واندوہ بھری ایسی حسرت بھری شاعری کرتی ہے کہ یہ پڑھنے والے کو بہت عرصے تک اپنی کیفیت میں لپیٹے رکھتی ہے۔

بلاشبہ یہ شاعری حتمی طور پر داخلیت والی شاعری ہے مگر نئی اور انوکھی تشبیہات و استعارات نے اسے لَو لاکی بنا ڈالا۔ ایسی تشبیہیں، ایسے استعارے جو مکمل طور پر فطری ہیں، بلوچی ہیں، اور لہٰذا عالمگیر ہیں۔ بلوچ حیرت کے بے کراں سمندر میں ڈوب کر اُسے سنتے ہیں۔

سیمک کی شادی نتھا نامی ایک نوجوان سے ہوئی تھی۔ وہ اُس سے دل و جان سے پیار کرتی تھی۔ مرتی تھی اُس پہ۔ کچھ ہی عرصے میں نتھا ایک قبائلی جنگ میں شمشیروں کی خوراک بن گیا۔ سیمک کے لیے یہ ایک عظیم صدمہ تھا۔ سیمک کو اُس کی یادیں تڑپا دیتی ہیں۔ سیمک نے اُن

جلتی یادوں کو الفاظ میں ڈھال دیا۔ ایسے الفاظ جو محبت کی گہرائی و گیرائی کی لامحدودیت بتاتے ہیں، جو رومان کے اعلیٰ ترین احساسات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔

سیمک کی شاعری عشقیہ شاعری کا بے مثال نمونہ ہے۔ بالخصوص بادلوں کے موسم میں۔ بادل کے گاڑھے ایستادہ حصے (اِستین) کو دیکھ کر تو اسے بے ساختہ نتھا یاد آ جاتا ہے:

ژہ مُڑاں اِستینے سرہ کشی
بُڑزیں چو مارانہ محکمیں کوہا
کوکر تہ ''نتھا'' ئیئے سرہ پاغیں
درین تئ مّلیے سیمریں واغا
جیہرتئ ہُمبوئیں گلُا لکاں!
ترنپ تئ موڑتیں جا بہئے تیراں
شف گروخ میانئے گا نہوریں تیغاں
گرند تہ نتھا تو پکہ گوانکاں

ترجمہ:

دھند میں سے سفید بادل کا ایک ٹکڑا سر اٹھاتا ہے
بلند جیسے ماران کا محکم پہاڑ
یہ سفید کہکر، تو نتھا کے سر کی پگڑی ہے
قوسِ قزح اُس کی گھوڑی کی رنگین لگام ہے
موسلا دھار بارش، تمہارے گھنے لمبے بال ہیں
قطرے، جیسے تمہارے کمربند میں لگی گولیاں ہوں
چمکتی بجلیاں، میان میں تمہاری آبدار تلوار کی چمک ہیں
گرج، نتھا کی بندوق چلنے کی آواز ہے

کیا تشبیہات ہیں!! اور فطرت کے مظاہر کا کیا ماہرانہ جڑاؤ ہے۔ میں نے عشقیہ شاعری میں رزمیہ مظاہر کی اس قدر لطیف اور صناعانہ پیوندکاری اور کہیں نہیں دیکھی۔ سیمک کی شاعری کی

مثال خود بلوچی شاعری میں بھی نہ ملے گی۔ حالانکہ ہم نے بادل برسات کے موسم کو بہت سے بلوچ شعرا کی شعرگوئی کے لیے ایک مہمیز کی صورت دیکھا ہے۔ بالخصوص توکلی مست کی شاعری کے لیے۔ مگر جس نرالے انداز میں سیمک بادوباراں کی کیفیات بیان کرتی ہے، اُس سے تو انسان مبہوت ہو کے رہ جاتا ہے:

تاہی نوزاں گوں شوا عرضیں
''لُنڈوٗ' او شانکئے مینغت فرضیں
آں شہیذانی زیارتاں مینیں
یہ دمے مونگا ڑّوکن انت ترنمپاں
شوا زوا ذبوئیں جینہراں ہِلیں
اش سمینانی گلگل وھُلاّں

ترجمہ:

دور دراز کے بادلو، تم سے ایک عرض ہے
لُنڈ و اور شانک کو بھگونا تم پر فرض ہے
اُن شہیدوں کی زیارتوں کو بھگوڈالو
ایک بار بوچھاڑ کر دو قطروں کی
تم زبادخوش بُو پھوار برسادو
بادلوں کی رم جھم اور گرج چمک میں

ہم آپ کی توجہ ایک بار پھر اُس حسین عجوبے کی طرف موڑتے ہیں جہاں بلوچی شاعری میں آپ بھرپور ڈرامہ اور مکالمہ سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ مکالمے کے لیے اطراف کا انسان ہونا ضروری نہیں، نہ ہی جاندار ہونا۔ بلوچ ،فطرت کے ہر مظہر کو جاندار اور اپنے مقابل کا گردانتا ہے۔ یہاں آپ اس برستی بارش کے پس منظر کے بعد نتھا اور بادلوں کے بیچ مکالمہ کی طرف متوجہ ہوں۔ نتھا جو قبر میں پڑا ہے، بادلوں سے یوں گویا ہوتا ہے:

(اور یہ بلوچ مائتھالوجی کا ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ بے جان جاندار سے گفتگو کرتا ہے، بے جان بے جان سے باتیں کرتا ہے۔ غیرناطق جانور، غیرناطق جانور سے سوال جواب کرتا ہے)۔

گال و بولی بی گوں تاہی نوزاں
شوا کئی تُئی ایں دلہ کائیں
شوا کئی چمئے گریثغیں انڑسیں
پہ کئی منتاں مناں میثو

ترجمہ:

وہ دور دیس سے آئی بارش سے گویا ہوتا ہے:
''تم کس کے پیاسے دل سے آ رہی ہو
تم کس کی آنکھ کے روئے ہوئے آنسو ہو
تم نے کس کی طرف سے کی گئی مِنتیں کرنے پر مجھے بھگویا ہے''

کیسی خوب صورت مکالمہ بازی بلوچی کلاسیک کی امتیازی خصوصیت ہے؟۔ خوب صورت ڈرامہ۔ فلمایا جاسکنے والا ڈرامہ۔ مگر کوئی قلم ہو تو یہ ڈرامہ سٹیج ہو۔ ہم بلوچ تو غزل اور ہائیکو میں آ کر پھنس چکے ہیں۔

اب ذرا نتھا کو بارش کا جواب دیکھیے:

اے جوا و داشہ تاہی نوزاں
سیمکئے تُئی ایں دلہ کاؤں
'سیمکئے' چمہ گریثغیں انڑسوں
ماسیمکئے منّتاں ترامینتہ
ما جَنِ ویران گونغیں دِیثہ
پرتوّے 'نتھآیا' گنوخ بِیثہ
رنگِ چو آسانی پُرا بِیثہ

ترجمہ:

دور دیس سے آئی بارش نے جواب دیا؛
ہم سیمک کے پیاسے دل کی طرف سے آئے ہیں
ہم سیمک کی آنکھ کے روئے ہوئے آنسو ہیں
ہم نے سیمک کی طرف سے کی گئی منت سماجت پہ تمہیں بھگو دیا ہے
ہم نے اس عورت کو ویران دیکھا ہے
نتھا، وہ تم پر پاگل ہوگئی ہے
اُس کی رنگت راکھ کی سی ہوگئی ہے

اب ذرا اگلا منظر دیکھیے۔ آپ ہل کر رہ جائیں گے، جب آپ قبر سے باہر نکلتے ہوئے مردہ نتھا سے سیمک کا مکالمہ پڑھتے ہیں۔ شاید عالمی ادب میں بھی آپ کو یہ منظر کہیں اور نہ ملے:

درکفی سالوک دروشمیں نتھا
نہنکشی آ ژہ تنک دفیں گورا
''شَر نہ یئے براہندغ ہواں گیغاں
گپتغئے گور ئے کلّر وہیساں!
دنزمس ڈالشاہیں بروتاناں
من بروتان و برنگلیں ریشاں
چو ٹوّاِت دنزوایں زواذ بوئیں''

ترجمہ:

دولہا صورتِ نتھا، نکلتا ہے
بڑی مشکل سے تنگ دہنِ قبر سے
''اچھے نہیں ہو ساتھی پہلے کی طرح
قبر کی کلّر اور میل تمہیں لگ گئی

تمہاری بڑی بڑی مونچھیں گرد آلود ہیں
مونچھیں بھی اور گھنی داڑھی بھی
تمہارے زبادبُو گیسو بھی دھول آلود ہیں''

یہ ہے سیمک کی شاعری۔ وہ اٹھتے بیٹھے، سوتے جاگتے اپنے مرحوم محبوب شوہر کی یادوں کی چِتا اپنے پیروں تلے جلائے رکھتی ہے۔ اسے ہر مظہر اور ہر شئے میں نتھا دِکھتا ہے۔

آیئے ایک اور منظر نامہ بھی دیکھتے جاتے ہیں۔ ایک نوجوان وحسین بیوہ کب تک آزاد رہنے دی جاتی ہے۔ چنانچہ شادی کے طلب گار مرد مکھیوں کی طرح بھنبھناتے آتے ہیں۔ نوجوان لوگ طرح طرح کی ترغیبیں دیتے ہیں:

ورنا سینگھا رنت وثی بوراں
کاراں مئیں گُلا نی گوئرہ تاشاں
پر منہ کاراں چیٹ و چنّیاں
حُلو اں رنگیں پکغیں ونگاں

ترجمہ:

نوجوان اپنی گھوڑیاں سجاتے ہیں
لاکر میرے خیمے کے گرد دوڑاتے ہیں
(وہ) میرے لیے چھینٹ اور چنیاں لاتے ہیں
مجھے خوب صورت پکی بجی دیتے ہیں

سیمک کو بستی کی عورتیں، مرد اور بوڑھے دوسری شادی کی ترغیب دیتے ہیں۔ سیمک ایک شعر میں اس حالت کو یوں بیان کرتی ہے:

ہررغیں رانڈھو باز مناں ریفاں
کہ دیرو ئے ورنایاں گشیں یکّے

ترجمہ:

بڑھیاں مجھے بہت بہت ورغلاتی ہیں
کہ بستی کے جوانوں میں سے کسی ایک کو چن لو

جواب سننا ہے؟ یارا ہے؟ تو سنیئے عشق داسی کیا کہتی ہے۔ (اب اِس پہ فیوڈل محبت کا ٹھپہ نہ لگائیے، ادب پارہ، فن پارہ ہے، محظوظ ہوئیے!)۔ سیمک، عشق کی ماری انہیں کیسے بتائے، ننھا کی یہ باندی انہیں کیا کہے، کیسے انہیں سمجھائے کہ:

دیرو ئے ورنا تہ گُل منی براثاں
آنکہ مئیں عاریفیں پثی ہند اں
سرمنی چنیّاں نہ ویث باڑا
پاذوں پہ لہڑی رتکغیں کوشاں
بلاں کہ چموں پہ سیر مغا ں سکنّت

ترجمہ:

بستی کے جوان تو سب میرے بھائی ہیں
اور کچھ میرے محترم والد کی جگہ ہیں
میرا سر چُنی کے لیے نہیں ہے خواہش مند
نہ میرے پیر لہڑی کے سلے پاپوش کے لیے
میری آنکھیں بے سرمہ ہی بھلی

سو، ہر ترغیب پاؤں کی ٹھوکر پر۔ ہر دلیل بجیرہِ انکار میں۔ عشق انکار ہے، عشق استرداد ہے، عشق تردید ہے۔ عشق ضدِ تسلیم ہے، عشق خلافِ مسلّم ہے.........اور حتمی عشق دیکھئے:

ما وثی جیغ پہ نہمتے بستہ
موث بوژی یا سورہ ایں ننھا

ترجمہ:

میں نے اپنا جیغ (گریبان) ایک ارادہ کرکے مقفل کردیا ہے
کہ اسے یا تو موت کھولے گی یا سور ما ننھا

للّاہ وگراں ناز

Lallah O Granaz

للّاہ کلمتی سترہویں صدی کے وسط کا ایک جواں مرد، اور نمائندہ بلوچ تھا۔ باران کی بیٹی گراں ناز اپنے حسن وسلیقے میں یکتا تھی۔ یہ دونوں لڑکا لڑکی بچپن سے ساتھ کھیلتے ہوئے بڑے ہوگئے۔ باران کے لیے للّاہ جیسے مثالی نوجوان کو اپنا داماد بنانے میں کسی بھی جھجک کی کوئی وجہ موجود نہ تھی۔ چنانچہ رشتہ اور شادی ہوگئی۔ مکان کے زمان میں دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی رہنے لگے۔ للّاہ کی بہادری جواں مردی کی باتیں مقامی نہ رہیں۔

دوستی اور دشمنی دونوں ہی حادثاتی اور ماجراتی مظاہر ہوتے ہیں۔ ایک حادثاتی مظہر باران کا منتظر بھی تھا۔ باران کی لسبیلہ کے ایک خاندان سے دشمنی پیدا ہوئی۔ دشمن نے انہیں جنگ کی ضیافت دے ڈالی۔ باران کے پاس قبیلوی نظام میں اپنے بیٹوں کے ساتھ جا موجود ہونے کے علاوہ کوئی چارہ کہاں تھا۔ سر قبیلوی نظام تو اپنی روانی روانی میں، اپنے رو میں آپ کو بہادر بناتا جاتا ہے۔ اُس دریا میں بہادر بننے کی ہر ترکیب کو مزاحمت دینے والے کو بزدل کہا جاتا ہے اور دریا کا اچھال اُسے باہر پھینک دیتا ہے۔

باران موجود ہوا، اُس کا خاندان موجود ہوا۔لٔلاّ ہ بھی اپنے وفادار نوکر کے ساتھ مسلح ہو کر آمادۂِ جنگ سسر کے پہلو میں موجود تھا۔

دشمن کی تعداد زیادہ تھی۔تلخ مقام پر تلخ دن میں تلخ لڑائی کی تلخ تلواریں گردنوں سروں کی کٹائی کرتی رہیں۔ باران اوراس کے بیٹے موت سے ہم کنار ہوئے۔گراں ناز نے ایک آنسو تک گرنے نہ دیا کہ لٔلاّ ہ ابھی جنگ کے موت کدے میں موجود تھا۔گراں ناز جانتی تھی کہ وہ دشمن کو بے خراش قطعاً جانے نہ دے گا۔اور ہوا بھی ایسا ہی۔اس کی تلوار، ہواؤں کی بانسری بجاتی سروں کے سُر تال خلق کرتی اُس کے بہادر دل کی سنگت کرتی رہی۔مگر جنگ تو جنگ ہوتی ہے۔عمل کی شئے۔آرزوئے حیات وضع داری کا پیرہن پہنے دشمن کے ہلاکت خیز وجود کو نیست کرنے کے لیے توانائی اور دانائی کا ذرہ ذرہ استعمال کرواتی ہے۔بے شمار سرلڑھکانے والا لٔلاّ ہ خود بھی زخموں سے چور ہو گیا۔مگر، ہوش کی آخری سرحد تک وہ اپنی تلوار کی دھار سے دشمن کا خون نکالتا ہی رہا۔

وفادار نوکر نے بے ہوش گرے ہوئے بہادر مالک کو اُس کی گھوڑی پر لادا اور گھوڑی کا رخ گراں ناز کے گھر کی طرف کر کے اس پر چابک برسائے۔گراں ناز کا بخت اُڑ گیا۔وہ شجاعت کی عینکیں پہنے رہی اور زخم زخم لٔلاّ ہ کو سمجھ نہ پائی۔ بزدلی بہادری دو ہی تو الفاظ ہیں قبیلوی بلوچ لغت میں۔گراں ناز کے دماغ کے منصف نے مقدمہ سنے بغیر ’’بزدل‘‘ کہہ دیا۔ایک سخت گیر قبائلی معاشرے میں بزدل مرد سے میاں بیوی والا رشتہ خاک چلتا ہے؟۔یہاں بھی نابینا شدہ گراں ناز نے لٔلاّ ہ کو قیامت تک باپ اور بھائی کا درجہ دینے کا بے ہودہ اعلان کر دیا۔لٔلاّ ہ کو بزدلی کا تمغہ دے کر اُس نے تو اُس کا ہر لمحہ مجروح کر ڈالا تھا۔

گوش کن ولٔلاّ ہ بھنگ و مسکانی
کارنہ کپتہ چوشیں مناتانی
للّہ تئ ہُمبو چوٹویں بیلی
درست کماں میانیں سمہ انت قولی
پہر مس بستنت پیسری روشاں

گوں وثی جانی دز گہا رکاں
کیث تئ شیری کشتن ئے احوال
گوں سری و رنایاں شلا نگیناں
نیل کناں گُلیے ہر چیار سریگاں
در کناں پرہ کنڈیں کڈویگاں
گوش بنانی پارسگیں دُراں
مس ملک و نیلا فاں گراں سہراں
درستاں من زیانیں ھتھے شیفاں
سر مصیبتیں میڑھے ننداں
سیل کناں جامئے بیر میں کوٹاں
ئُہ تلیں باہینکاں بہ بھوریناں
لٔلاّ ہ تئ ہمراہاں مناں گوئشتہ
لٔلاّ ہ شہ جنگہ پارواں جِستہ
زور ے پہ ملّئے دورواں داشہ
آسے ژہ چابکئے سرارتکہ
گوں کُرڑیاں بورے شوریتہ
گوں کُرڑیان و موزغی پاذاں
دیم پرابارانئے رذیں کلاں
کل ترا بارانئے گہار کاں
ہورے گوں درگوشاں نہ گوائیتاں
گوں منی براثاں عو مرائیناں
براث منی شاہیگیں دو میٹگیں

پہ تئی دیماریسئو بیثاں
حون اڑ جانا گل گلے کاتکاں
اڑ بروتان و برنگلیں ریشاں
تل تلہ بیثنت چوواڑھی شاغاں
ہر بہ کہ جنگانی ہلا ہو شاں
دژمنیں مڑداں دست گلائیشاں
کیغدیں مہلینجاں فراموشاں
گیر ترا کاتنت نیاذ املاّنی
سارت وحونکیں کل بزرگانی
گنگل و دزبانزی جنکانی
گیشتر مئیں ماہیں دیم و درانی
للاّہ مئیں لا فا لیٹ جثہ ماری
شیر منی دکاّنیں گُراں متکہ
پر منی کوشیں زاں سراں رستے
للاّہ مئیں سُہرانی پٹ و براثئے
داں صلواتین و محشر ہ روشا

ترجمہ: (عطاشاد)

سُن اے للّہ، اے خواجہِ بھنگ وزعفران
اس تخاطب کی اور ہو کیا، وجہ بیان
بات ہی ایسی ہے کہ ہوں مجبورِ زبان
وہ معطر دستار، وہ ترے یارِ غار
سرفروشی پہ جن کی ہیں قرباں ناریاں

(کس قدر وہ خوش بخت ہیں، یہ خوش بخت ہیں)
اور ادھر اک میں کہ کبھی نازاں تجھ پہ تھی
دز گہاروں (1) سے فخر سے کہتی تھی یہی
جانِ جانبازاں! سرسیاہ سرافگناں
وہ مرا مردِ شیر، وہ للّہ کے جری
ہو شہادت امباز (2) اگر میداں میں کبھی
نیل کردوں فرطِ ناز سے اپنے گُلّ کو
درّ (3) مرے کانوں میں نہ لہرائیں پھر کبھی
پھر میری بانہوں میں نہ ہو، باہوبند (4) بھی
توڑ ڈالوں گی ہر کلائی کی مینگلی
پھر مرے پاؤں کو ترستے پادینک (5) ہوں
زینتِ زرجاہ زیاں ہوں زیور مرے
ہو مری چشم پر تصور میں یادگار
وہ تیری عظمت کا قلعہ ہمت کا حصار
ہائے یہ سب کچھ جیسے اک جھوٹا خواب تھا
عمر بھر جو دیکھا کیا جھوٹا خواب تھا
میں نے جو سوچا میں نے جو سمجھا خواب تھا
میں نے جو چاہا، میں نے جو پایا خواب تھا
ایک دن جب حربِ حق و باطل پیش تھا
تیرے ہی ہم راہی، مجھے یہ کہنے لگے
کہ یلیں (6) للّہ ہو گیا میداں سے فرار
سرفروشوں کو چھوڑ کے گرم کارزار

قوتِ باطل آزما تھی، صرفِ لگام
آتشیں چابک بن گیا تیغ بے نیام
موزگی (7) پاؤں میں رکابوں کی قید تھی
جانبِ باراں (8) برق کی صورت تھا کوئی
مردِ میداں ہو، اور کرے وہ جاں سے گریز
حق نہیں اس کو کہ اٹھائے وہ آنکھ بھی
دخترانِ کہسار کی جانب بھی کبھی
وہ دومٹی (9) بھائی مرے جانباز و جوان
سامنے تیرے کشتۂ تیغ و تیر تھے
جسم تھے ان کے واڑھی (10) شاگوں کی طرح
خونِ میں غلطاں برنگیں ریش (11) اور تھے بروت
رزم کی آتش گاہ میں مردانِ عمل
دامنِ دل کا غم نہیں کھاتے ایک پل
زندگی الجھی ہو جہاں خاک وخون میں
تابنا کانِ حُسن کی یاد آتی نہیں
جب مرے بھائی بسمل تھے غیر تھے
میں تجھے یاد آئی، مری صورت چاندسی
دُرّ میرے دزبازی (12) مری اور کل گورگیں
یہ لغوری یہ بزدلی، یہ بے ہمتی!
اہلِ غیرت کے واسطے ہے مرگ مدام
اب مری نظروں میں ہے تو اک سنپولیا
بن کے ''ماں'' پالا تھا جسے میں نے ایک دن

گود میں میری جو بڑھا، جو ورنا (13) ہوا
تُو نہیں وہ تو رشتۂ دل کیسے رہے
لُٹ گیا سرمایہ کو جو تھا جذبات کا
میں پہن کر زیور کبھی تیرے سامنے؟
آؤں گی سج دھج کر کبھی تیرے سامنے؟
یہ اگر ممکن ہے، تو ہے تُو بھائی مرا
یہ اگر ممکن ہے، تو ہے، تُو باوا مرا

ایسے مہلک ہتھیار کا جواب اُسی قدر زہر آلود نہ ہوتا تو آج ہم اُسے اِس دلچسپی سے کیوں پڑھتے؟۔

اب للاہ کے لیے بھی کوئی مخمصہ کوئی کنفیوژن کوئی غیر فیصلہ گیری نہ تھی۔ پرائی جنگ میں شجاعانہ کود کر اُس نے تیغِ جوہردار سے ایسی ایسی گردنیں کاٹ دیں کہ جراتِ دل اور قوتِ بازو رشک کرے۔ بزدلی تو کیا وہاں تو سوائے قتل کرنے کے کوئی اور تصور تک نہ تھا۔ پھر بھی؟۔ پھر بھی اُسے خاوند ماننے تک سے انکار ہو؟۔ پس ایک اعلان للاّہ کی طرف سے بھی، کہ اب گراں ناز بھی محبوبہ نہیں، بیوی نہیں بلکہ بہن رہے گی۔ کیا Degradation ہے!! خدا کی پناہ مانگیے اُس کیفیت سے جب بلوچ دوسرے کو Degrade کرتا ہو۔ دونوں محبت کرنے والوں نے باہمی توہین توہین میں بلوچی زبان کو ایسی عمدگی عطا کی جسے پڑھ پڑھ کر، سن سن کر چار صدیاں بعد بھی ہم آپ جھوم جانے پر مجبور ہیں۔ آیئے جھومتے ہیں کہ جھومنا مولانا کی سنت ہے:

گوش کن وڈُریں نوخ زواذانی
من نہ کرتگ سستی امل تانی
مرد و نامرد پیداور و دوستاں
مردانی جنگانی نشاں استاں
نامرد گوں شرمیغیں دفا سُستاں
شکلیں گین و جانش دوست داشتاں

گشتہ تئ درگوشاں بہ چڈایاں
گوئرمن اش نہیشتاں زیاد ہیں مڈّاں
سے وچیار چیزا نیست وفاداری
جن اگاں شر رنگ و چوحوریں
ہر باپہ مڑدے دست نوک سہریں
بورا غرقیمتے بہ بیت لکھے
ہر با پہ زینا زوار ہ بی یکے
کلمتانی رامگیں شاتو
گوں من و ہر دو لشکر ءِ مڑداں
چاڑ دہ جنگ دوستیں مگسیغاں
ہپت براماں پر یںنت من و بوراں
داں کمیث ءِ آبرشمیں بکشاں
داں ہے نریانئے چندنیں زینا
جھلت و ہوژ نا گت من و سیاہا
ہپت ساحاکہ سارمناں بیثہ
گوہریں تیغئے بنڈمنی دستیں
اسپروں چنڈ چنڈانت حراسانی
مس سراژندنت ہول سیثانی
چار دہ چروخیں تیر منی جانیں
بید سغارانی تازغیں ٹپاں
ناخنے گیگ نیستیں منی جانا
انگتوں پیسراتگ پہے زحما
مس دلا آڑتہ بیسروے بیاراں
گپتغاں سیاہ پوستیں غلامو آ

گپتہ گوں دوزواہی سروبانسکاں
براثاں پہ پتیل بڑ تغث لوغا
ماث گہاراں گوں سنگہی دستاں
بوف و با لشت و غالیاں شپتاں
ہون وریم ہوریگ واواریا
مثل تغارانی چمگ وجوآ
خانہ زاداں گوں محرمیں دستاں
ریتکنت من کرنا و براکاہاں
پہتمی بانگواہا نماشیا
ترھکغا گرّوخیں نریا نیغا
کافری اری رتکہ ابر درپکاں
دل منی آف بیث و جغر کوہیں
پہ وثی اولا کا قویہینا
اژ توے گراں ناز گہہ تریں گزی
ہارش چہ دِریں گُورسراں کاراں
شراش پہ وشیں مہپلاں زوراں
نیں گواث باڑتش و نے ہارش ٹیلیناں
براث پہ جامیں کو فغاں زیراں
گورمن ودرداں سچنت پاساں
چو چراغاں روخت ابرآساں
جام سماعیلیے کوفغا کگا
بنڈ ودارانی زیرغاریشیں
گراں ناز تو تنکیں چادر ءِ چنڈے
لسہ ایں ماث آسکی گڈ کاں بئے

بیایئے مئیں چپیں پلو ا نندئے
تواغر منی کیس ئے پلوازیر ئے
تازغیں ٹپانہ پذا گندئے
وث گشئے دیوانغ ترا چونیں
للّاہ ئے دیوانغ وثامفتا
پرچیا جنبوری جساں شپتہ
اغ نہ مڑتاں شے کل ئے پٹاں
مس پرے ہونیاّں آف نواں ساڑتیں
دیر بنیں چاثاں سنگ اغر ریزاں
کینغ چہ مردانی دلاں کِنزاں
نَیں سنگ ریزنت مس دیر بنیں چاثاں
نَیں کینغ ژہ مڑدانی دلاں کنزاں
بیر بلوچانی تاں دو صد سالاں
لسہ ایں سرواناں دو دتّانیں
داں دو شش ماہا کشور اندازی
گوں دژمنیں مڑدانیں منی بازی
پہ تئ زردو کٹغیں براثاں
رمبت و مُولائے گروں بستہ
مس تئ براثانی عوض کرتہ
عذروں چہ برفیں چادرا شُشتہ
گراں نازمئیں بھنگانی گھارکُئے
داں صلواتین و محشریں روشا

ترجمہ:

غور سے سنو، اے موتی، اے معطر

میں نے اپنے کام میں کوئی سستی نہیں کی
بہادر اور بزدل کی پہچان آسان ہے
(اس لیے کہ) بہادروں کی جنگوں کی نشانیاں ہوتی ہیں
بزدل شرمندہ گفتار کے ساتھ بے عزت رہتے ہیں
اس لیے کہ وہ اپنی جان بچاتے رہے ہیں
بالیاں پہنے تمہارے بھائیوں کو بچانا چاہا
مگر زیادہ طاقتوروں نے ایسا کرنے نہیں دیا
تین چار چیزوں میں وفا نہیں ہوتی؛
عورت، اگر حور کی طرح حسین ہو
کسی نہ کسی سے تو شادی کرے گی
گھوڑی، جس قدر بھی قیمتی ہو
کوئی نہ کوئی تو اُس کی زین پہ بیٹھے گا
اے کلمتوں کی فاختہ
مجھ سے دشمن کے لوگ
اور جنگ دوست مکسی لڑ پڑے
سات بار میں اور میرے گھوڑے نے حملہ کیا
جب تک کہ میں گھوڑے کے ریشمی غلاف سے پھسل گیا
اور گھوڑے کی زریں زین سے گر گیا
ایسا لگا جیسے میں اور سیاہ گھوڑا دشمن کی گھنی صفوں میں تیر رہے ہوں
جس وقت مجھے ہوش آیا
تلوار کا صرف دستہ میرے ہاتھ میں تھا
میری خراسانی ڈھال ٹکڑے ٹکڑے تھی

اسے تلواروں نے ریزہ ریزہ کر دیا
چودہ گھومنے والے تیر میرے جسم کو لگ چکے تھے
تلواروں کے تازہ زخم اُس کے علاوہ ہیں
میرے جسم پر ناخن جتنی جگہ بھی زخم کے بغیر نہیں ہے
اس حالت میں بھی میں نے تلوار تھامی
دل میں آیا کہ دشمن پر تازہ حملہ کر دوں
مگر سیاہ فام غلاموں نے مجھے پکڑا
میرے سر اور بازوؤں سے پکڑ کر
گھوڑے پہ ڈالا اور گھوڑے پر چابک برسائے
بھائی سٹریچر بنا کر مجھے گھر لے گئے
ماں اور بہنوں نے اپنے ہمدرد ہاتھوں سے
بالشت و گدّے اور قالینوں پر رکھا
خون اور پیپ دونوں
ندی کی طرح میرے زخموں سے جاری تھے
غلام اپنے ہمدرد ہاتھوں سے
میرے زخموں پر تیل ڈال رہے تھے
ساتویں دن صبح سویرے
کراہتے گھوڑے کے گرنے کی آواز آئی
اس کا بھیجا باہر نکلا
میرا پتھر جیسا دل اور جگر پانی ہو گئے
اپنے قوی گھوڑے کی موت پر
ارے گراناز تم سے تو لکڑی کے تنے اچھے

جنہیں سیلابی پانی دور دراز سے لاتا ہے
اچھی محفلوں میں جلانے کے کام تو آتے ہیں
نہ انہیں ہوا اڑا سکتی ہے اور نہ پانی
بھائی انہیں اپنے بڑے کندھوں پر اٹھا لائیں
میرے درد کے ساتھ پوری رات جلتے ہیں
وہ چراغوں کی طرح روشنی دیتے ہیں
جام اسماعیل کے کندھے
لکڑی کے تنے اٹھا اٹھا کر زخمی ہیں
گراں ناز، تم اگر باریک چادر اوڑھے
نوجوان ہرنی نظر آؤ
آ کر میرے بائیں پہلو میں بیٹھ جاؤ
اور میری اوڑھنی کا کونا اٹھا دو
اور جب میرے تازہ زخم دیکھو گی
تو خود بول پڑو گی کہ مجنوں تمہیں کیا ہو گیا
للّہ او دیوانے تم نے کیوں
خود کو آتشیں نیزوں کا نشانہ بنایا
اگر اس بار مہلک زخموں سے بچ جاؤں
(تو) میں دشمنوں کے لیے ٹھنڈا پانی نہ ہوں گا
اگر گہرے کنوؤں میں کنکر پگھل جاتے ہوں
تو بہادروں کے دلوں سے بھی انتقام ختم ہو جائیں گے
نہ تو پتھر گہرے کنوؤں میں پگھل جاتے ہیں
نہ انتقام بہادروں کے دل سے فراموش ہوتے ہیں

بلوچوں کا انتقام دوصد سال تک
ایک سالہ ہرن کی طرح تروتازہ رہتا ہے
دوشش ماہ مجھے اپنی قوت دوبارہ پانے میں لگے
دشمنوں کے ساتھ میرا مقابلہ ہے
تمہارے زرد چہرہ اور ضدی بھائیوں کا انتقام لینے
میں تیزی سے گیا اور درہِ مولا کا راستہ روکا
میں نے تمہارے بھائیوں کا بدلہ لے لیا
اور اپنی برف رنگ سفید چادر سے داغ دھولیا
گراں ناز تم میرے مئے کے ساغر کی بہن کی مانند ہو
محشر کے دن تک

جسم کے زخم تو مندمل ہو ہی جاتے ہیں، مگر دل کے زخم کبھی نہیں بھرتے۔ اور جب جسم کے زخم ٹھیک ہوئے تو للاہ پھر دشمن کے سر پر جا موجود ہوا۔ ناگ اور زہر کی طرح وہ لپٹتا پلٹتا رہا اور دشمن کی تعداد گھٹاتا رہا۔ ایسی بہادری علاقے میں نہ کسی نے سنی تھی نہ دیکھی تھی۔ گراں ناز کی پشیمانی اُس وقت تو اور مہلک بن گئی جب اسے پچھلی جنگ میں بھی للّہ کی اندھی شجاعت کی حقیقت معلوم ہوئی۔ وہ سرتاپا پگھل گئی مگر قول تو بلوچ کے باڑھ کا خاردار دروازہ ہوتا ہے۔ اور یہ دروازہ گراں ناز نے خود اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا تھا۔

دل دل کی کیفیت نہ جانے تو دل نہ کہلائے۔ گراں ناز کی عمیق پشیمانی نے للاہ کو بھی پگھلا دیا۔ عشق میں پشیمانی؟............ بہت بڑی غلطی جو ہوگئی تھی۔

غلطیاں تو غلط فہمیوں کی ماں جائی ہوتی ہیں۔ مگر یہاں تو غلط فہمی غلطی بن چکی تھی۔ یہی غلطی ایک گناہ میں ڈھل گئی تھی۔ گناہ پھول کر تباہیاں لا چکی تھی۔ تب، دونوں دل اصل صورت حال سے آگاہ ہو چکے تھے۔ آگاہی تو فہم پیدا کرتی ہے اور آگاہی چُپ بیٹھنے کہاں دیتی ہے۔ آگاہی

تو فیصلے کرواتی ہے، کیے ہوئے فیصلے بدلواتی ہے............ آگاہی نور ہے۔

فہمیدہ لوگ بہر حال آس پاس موجود ہوتے ہی ہیں۔ بدقسمت ہے وہ شخص (اور وہ قوم) جس کے آس پاس فہمیدہ لوگ نہ ہوں۔ اور للّہ و گراں ناز اِس قدر بدقسمت بھی نہ تھے کہ انسانی مشکل کا حل تلاش کرنے والوں کا کال ہوتا۔ سماجی مسائل کے حل اُن کے اپنے اندر موجود ہوتے ہیں۔ حل نکل آیا۔ پاک روحوں کا پھر ملاپ ہوگیا۔ زندگی مسکرانے لگی۔

حواشی:

1- ہجولیوں
2- گلے لگ جانا نصیب ہو
3- کانوں میں زیور
4- بازوبند
5- پازیب، جن میں چھنا چھن ہو
6- گبھرو
7- موزے
8- گراں ناز کے والد کا نام
9- ہر ایک بھائی دو دو کے برابر
10- دار تراش
11- گھنی داڑھی اور مونچھیں
12- شوخیاں
13- جوان

کِیّا وصذو

Kiya O Sazo

دور دیس کے دو پیار پنچھی ملے، آنکھیں ایک دوسرے میں سما گئیں۔ اور پھر وقت نے انہیں دور دور پٹخ دیا۔ فراق، جہنمی، موذی، بے انت اور دردناک فراق۔ پیاری صذو اس مکالماتی شاعری کی ابتدا کرتی ہے۔ ہماری مداخلت یہاں دخل در معقولات ہوگی، بلوچی کلاسیک خود کہانی کار ہے، ڈرامہ رائٹر ہے اور دل پذیر ہے۔ آیئے میں خود کو درمیان سے ہٹا دیتا ہوں اور آپ کے لیے صذو کا پرندے سے مکالمہ نقل کرتا ہوں، اس چیلنج کے ساتھ کہ آپ عالمی ادب سے اس کا ثانی لا کر دکھائیں:

تیعانلیں مرگ رامئیں
سُرچم و شہمیر بانزریں
دیر نشتغ و چے ءَ کنئے

مس نشتغ و چینکہ چِناں
چینکاں پلالانی چناں

زمباں بہارانی گراں
تراتی براں سیرہ نواں
کلمیرو کوہی گواڑخان
موری کسانیں دانغاں

بیا تومنی گُل ئے دفا
ترا مہلب ایں چینکاں دیاں
چینکاں پہ شار ئے دامنا
آفا مس زریں کدحا
درنگ تئ منی کوفغ سراں
ساگ منی بیک انت بزیں
ہر دیں کہ میل ات بیث روگ
کو کو کن وڈا ھ دئے منا
تئ سُنٹہ طلاریشہ کناں
پراں تئ زراں گراں
ترا مُلکئے نشانیاں دیاں
ملکے کہ نامے باھو ایں
شہ باھوآ شیری سرئیں
کورے کہ مانیں دیر سریں
چاٹے کہ مانیں دیر بنیں
آفے کہ مانیں زمزمیں
درشکے کہ مانیں یک بنیں

دیواں سر پا سہ جاگہاں
برے یل و برے بلوچ
برے دوراجیں کلمتی
گُل نشتغ و دیواں کناں
مردمے مانت پل گذیں
چہ پل گذاں پل گذ تریں
کِیّا صذہ پیداوریں
سریں جاہہاں بارغ کشہ
کوفغ چڑائیں اسپرا
کوکو کن و پاغا بہ نند
گستا چہ بیلانے بہ بر
وش وشا گوشا اِش بہ گوئش
تئ دوستا سلام ششتا ثغنت
درائی دو پنچ روش داشتئے
سے سال دوشش ماہ گوئستغاں
او کیّااو بد فعل کہ توئے
کایئے او پیداخہ نہ وے
سالی ایں گوئرک میش پثغاں
ہرّی جڑیں نیش پثغنت
سیرئے گرانڈ پیر پثغنت
آڑت درشتغیں کوگ گپتغاں
حتّی چگو گاں وارتغاں

تئ دِشتارہ دتّاں رتکغاں
دوستے کشئے دوست اِت مراش
آنہی ماثارا سر دڑ دے گراث
سر دڑدو شو میں گُلغے
نزمیں تفے شیموش دیا
تئ ہیسی سرا ہچی مہ وا
تاواں املیں گورمنا

ترجمہ:

''اے چھپھاتے خوش نما پرندے
اے سرخ آنکھوں والے حسین پروں والے پرندے
تم دور بیٹھ کر کیا کر رہے ہو؟''

''میں بیٹھا دانہ چگ رہا ہوں
میں کٹی فصل کے بھوسے میں دانے چگ رہا ہوں
موسم بہار کے نوالے کا لطف لے رہا ہوں
ترات نامی جھاڑی کے پھل سے میرا پیٹ نہیں بھرتا
یہ تو چیونٹیوں کے لیے مناسب ہیں''

''ارے تم میرے خیمے کے دروازے پر آؤ
میں تمھیں خوشبودار دانہ کھلاؤں گی
دانہ اپنے دوپٹے پر پھیلا کر تمہیں کھلاؤں گی
تمھیں چاندی کے برتن میں پانی پلاؤں گی
(تیرے لیے) بلند پہاڑی چوٹیاں میں اپنے کندھوں کو بناؤں گی

اور میری زلفیں تمہارا سایہ ہوں گی
جس وقت اڑ جانے کی خواہش ہو
کُوکُو بول کر مجھے اطلاع کر دو
میں تمہاری چونچ کو سونا چڑھا دوں گی
تمہارے پر چاندی کے بنا دوں گی
میں تمھیں اُس علاقے کی نشانیاں بتا دوں گی
ایک جگہ جس کا نام باہُو ہے
اُس کی نچلی سمت
دور دراز سے آنے والا دریا ہے
ایک بہت گہرا کنواں ہے
جس کا پانی بہت میٹھا ہے
وہاں ایک تنے والا درخت ہے
محفل تین قطاروں میں جمتی ہے
ایک قطار میں لڑاکا بیٹھتے ہیں دوسرے میں عام بلوچ
اور پھر بہادر کلمتی
سب بیٹھ کر میٹنگ کرتے ہیں
اُن میں ایک خوش لباس شخص ہے
جو خوش لباسوں کا خوش لباس ہے
کیّا تو سیکڑوں میں نمایاں ہے
تیروں بھرے کمربند نے اس کی کمر پتلی کر دی
کندھے بھی کمان اٹھا اٹھا کر
کوکو بولتے ہوئے اس کی دستار پر بیٹھ جا

اُسے دوستوں سے الگ لے جا
میٹھے میٹھے انداز میں اس کے کان میں بتا
تمہاری محبوبہ نے سلام بھیجے ہیں
تم نے تو دو پانچ دنوں میں ملنے کا کہا تھا
(مگر) تین سال اور دو شش ماہ گزر گئے
او کیّا، بے قول
نہ آتے ہو نہ نظر آتے ہو
ایک سال عمر والے لیلے مکمل بھیڑ بن گئے ہیں
کم سن شتر بچے جوان ہو چکے ہیں
شادی والے دنبے بوڑھے ہو چکے
پسا ہوا آٹا کیڑوں سے بھر گیا
مہندی پرندے چگ گئے
تمہاری منگیتر کے دانت گرنے لگے
اگر تم نے کوئی اور محبوبہ بنائی ہے تو اُسے موت آئے
اس کی ماں کو سر درد پکڑے
سر درد اور موذی کھانسی
ایک نرم بخار اس پر حملہ کرے
مگر تمہیں شالا کچھ نہ ہو
کہ وہ تو میرا نقصان ہوگا''

ہم پھر کچھ نہیں بولیں گے، اس لیے کہ بہتر بول نہیں سکتے۔ آیئے بہترین شاعری پڑھیں کہ پیغام سن کر کیّا پہ کیا گزرتی ہے:

پیغام صذوئے آتکغاں
گوں راھگزاری مڑدماں
موچی منی کوشاں بہ دوش
درزی منی جانئے گذاں
بگّاں چلنگ مس لوٹشہ
سے روش تابیگاہ کشہ
شہ بگا چلنگ گستا کشہ
شریں تڑے جاں شوذ کشہ
من نرمی آ جوکیتغا
پُشتوں پہ رومال چنڈشہ
پُلیں مہار مس درنزشہ
گوں نغرہیں گومساں جشہ
محفل جنکاں بستغاں
چیل باہوئی پشتی کشہ
سر بارئے سبزا بیثغاں
آنا کڑ و روذئے سرا
لنٹاں ہلو ہالو کشہ
سُرمباں جنکی چاپ جشہ
یک ساعتے پُریں نہ گوئست
شو میں سروں گوازیثغا
مس آنا کڑا و گوئنڈیں نگور
اور مس شنکانی درا
کاروات گوں دراژ کشیں سرا

زیر کوہ گوں بگانی پٹا
کمبی ئے کوہ چَپا کشہ
ما آتکغوں لک ئے سرا
راہ کلمتیاں بستغا
ہوش بی چلنگ ہوش بی چلنگ
کونڈان کپت و پادات چلنگ
یک چابکے زہرا جشہ
زڑدو پہ کونڈ کش گوستغا
باہو داں گنجیں بیلوا
تئ دو کشین منزل ایں

ترجمہ:

صذو کے پیغام آئے ہیں
راہ گیروں کے ہاتھ
موچی مجھے پاپوش سی دو
درزی میرے لیے لباس
میں نے اونٹوں کے رم سے چلنگ نامی مہاری منگوائی
تین دن صبح سے رات تک لگا کر
میں نے چلنگ کو، رم سے علیحدہ کر دیا
ایک اچھی ندی میں اسے نہلایا
میں نے آہستہ سے اُسے بٹھا دیا
اُس کی پشت کو رومال سے صاف کیا
میں نے پھول جڑے مہار کو
روپہلی نکیل کے ساتھ باندھ دیا

لڑکیوں نے اس پہ پا کھڑا رکھا
اُس کے نیچے باہو کی روئی سے بنا گدّا
میں سبزی مائل چلنگ پر بیٹھ گیا
آناکڑ وندی کے قریب
تیز رفتار مہاری کے ہونٹ گیت گانے کے انداز میں زیر و بم ہوئے
اس کے قدم رقص کرنے لگے
ایک ساعت بھی نہ گزری
(کہ) میں نے بدبخت سارون وادی عبور کر لی
آناکڑا میں داخل ہوا اور کم رتبے والی نگور وادی میں
وہاں اَور نامی وادی میں اور ''شنکانی در'' نامی جگہ
دور سے آنے والی کاروات ندی
زیر نامی پہاڑ اور بگّانی پٹ نامی میدان
میں کوہِ کُممی بائیں طرف رکھ کر سفر کرتا رہا
میں لک نامی درے پہنچا
کلمتیوں نے راستہ روک رکھا تھا
''احتیاط سے چلنگ، احتیاط سے''
چلنگ لڑکھڑا گیا اور دوبارہ سنبھل گیا
میں نے غصے سے اس کو چابک ماردی
مہاری جھک کر اس سے گزر گیا
باہو سے لے کر زرخیز بیلہ تک
اُس کے دو پڑاؤ کی مسافت بنی

اور پھر............ فردوسِ بریں، صدو کا گھر!! ۔کیّا کے لیے سکون کا گوشہ، راحت کا مقام ۔وہ محبوبہ کو یوں مخاطب کرتا ہے:

وہا وئے کہ ہاغہ دوست منی
پاذا منی بی بی صذو
وہاویں صذو سنگین پری
وہاویں مس کُلاگورغیں
مس پہ نہانی آتکغاں
چم قدح ایناں پچ بہ کس

ترجمہ:

سو رہی ہو یا جاگ رہی ہو میری محبوبہ؟
اٹھ جاؤ میری محترمہ صذو!
سوئی ہوئی ہے سنگین پری صذو!
اپنے خوب صورت خیمے میں سو رہی ہے
میں چھپ چھپ کر آیا ہوں
اپنی قدح جیسی آنکھیں کھول!

تصور کیا جا سکتا ہے کہ جس محبوب کے لیے آپ برسوں انتظار کی تڑپ میں مبتلا رہیں، وہ اچانک آئے اور پہلو میں کھڑے ہو کر آپ کو نیند سے جگا دے......تو آپ بھلا عیدالاضحیٰ کس کو کہیں گے!!

کِیّا یلیں مولانغیں
گوں ناغمانیں آیغاں
تو کہ مناں پیش ڈاہ کثیں
مس میمنڑے گوئر لوٹثیں

صد زرئے سوداؤں کشیں
ہلکئے جنک مس لوٹشیں
مسک و عطر تار تار کشیں
گوں دز گہاراں بہر کشیں
برے ڈکمیں بیکاں جشیں
دیم چو چراغا روخ کشیں

ترجمہ:

کیّا، بہادر اور بے پرواہ تمہاری غیر متوقع آمد
اگر تم مجھے قبل از وقت اطلاع کر دیتے
(تو) میں میمن (دکاندار) منگواتی
سوچاندی کی اشرفیوں کی چیزیں خریدتی
بستی کی لڑکیوں کو بلواتی
مسک اور عطر چھڑکتی جاتی
سہیلیوں میں بانٹ دیتی
اپنی زلفوں پہ چھڑکتی
اپنا چہرہ چراغوں کی طرح روشن کرتی

محبوب کا جواب ہمیں معلوم ہے۔ ایسے فردوسی موقع پر ہر عاشق یہی کہتا ہے جو کیّا نے کہا تھا:

لوٹاں نہ مسک وعطرا
مس لوٹاں تئی ہیسی سرا
ہیسی سرو گو ربارغیں
تنہا قبول ءِ تو مناں

ترجمہ:

مجھے مسک و عطر نہیں چاہییں
مجھے تو تمہاری روح چاہیے
تمہاری روح اور تمہارا سڈول جسم
صرف تم ہی میری خواہش ہو

دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ وقت مسرت و انبساط کا یونٹ بن جاتا ہے۔ چاندنی موسیقی بن جاتی ہے اور ستارے اُن کے لیے رقاص بن جاتے ہیں۔ فطرت کے سارے نکتے یک نکتہ ہو جاتے ہیں۔ گویا دھرتی بنی ہی اُس جوڑی کے لیے ہو۔

مگر............غم تو خوشی کا ازلی ابدی ویری ہوتا ہے۔ کیّا سفر وحضر کے مردانہ کام میں گم، یہاں بیماری اس کی زندگی صدو کا گلا گھونٹ لیتی ہے۔ بس آخری گھڑی پہ پہنچ پاتا ہے محض ماتم کرنے، محض مرثیہ کہنے!!

زی مس کاتکاں کیچ دل آرامیں
ماچرا مولائی دفہ کاتکوں
انار مناں گونث گوں دانغے ہیرا
دیما پیذاغایہ سہاک میریں
جُستن ژہ ہیرواریں دفا گپتہ
'' بیا سہاک میریں خیر ترانا خیر''
'' امبلاں بل تہ دل پریشاں بے
کپتغ وزہیر نال انت صدو لالیں
کپتغ و نالی باہوئے چیلا
دست درنگائنت ابر یجی
اغر بچکے بیث ہطلی دستئے
اغر جنکے بی ماھے مس دیمیں

ماھے دیمائیں روشئے گیواریں
موکل ئے زوریں امبلا گپتوں
مس چلنگا را گوہ کشہ لٹے
بیا چلنگ ترکے شالا راڈ باشئے
دوستہ دیذارا پشت نہ گیجاشئے
مس شتاں کلانی ابیلی آ
بمبوئے ساڑتیں نارغہ کایاں
اغر نہ مُرتے توشے براچئے
سال پہ سال سنٹیں ماذغاں منّاں
پہ تئ سر دڑ دا گرانڈ بوریں
نوکراں آزاتہ کناں کارا
آسمی پُلا گیمرغ زڑتہ
چو پکغیں لمبوآ ہُشاں بیشہ
قادرا شریں داذوثی برتہ
برتگ اش بند گاہئے کنڈہ مچ بیشہ
از گورئے کشنت ہارو باداماں
شاں ژہ دستاں تلمل و باہی
بزرگی موڑ دانغاں مندری
شیفغیں پونزا پلک و گرانزی
اژتئ پاذاں مارسریں پاذینک
درستاں پہ ھقے بنی ناذینت
حقہ مس جلانی تلا داشہ
براثاں پہ جانی کوفغاں زڑتہ

بڑتغ وڈنی گوشگش گپتہ
تنک دفیں گٹیں گڑائیتغ
لعل اش مس اندئے تہا شتغ
سر بر احاخ و گِل اش رتکنت
براث پراپلیں پتڑا آتکاں
گریث کجا ماثا گریث کجئے کھولا
گریث کجئے جانی دز گھار لاڈیں
مس دِہ پہ چیرو اندری گریشہ
انڑس پما برفیں چادرا کپتاں
شف منی دانائیں ھذاروش کث
درکفنت سیٹھانی جنک ماہیں
ہارو بادامی چادراں چنڈنت
دیولی شار ءَ مس سرا پوشنت
بلے گوں نہ انت دابانی صذو لعلیں

ترجمہ:

کل میں کیچ کی دل آرام وادی میں سے سفر کر رہا تھا
میں مولا کے دہانے آ رہا تھا
میرے پاس انار تھا اور خوشبودار الائچی
سامنے سے سحاق آ رہا تھا
میں نے الائچی آمیز منہ سے پوچھا،
''خوش آمدید سحاق، خیر خیریت؟''

''احباب کے بارے نہ پوچھو پریشان ہو جاؤ گے

لعل جیسی صدو بیمار پڑ گئی اور بے چینی میں چیختی رہتی ہے
باہو کے قریب پڑی کراہتی ہے
دردِزہ میں مبتلا ہے
اگر بیٹا ہو جائے تو اس کے بہادر و مضبوط ہاتھ ہوں گے
اگر بیٹی ہو جائے تو اس کا چاند سا چہرہ ہوگا
چاند چہرہ اور مانگ پہ سورج''

میں نے دوست سے زبردستی رخصت لی
میں نے چلنگ پر ڈنڈے برسانے شروع کیے،
''اے چلنگ، خدا کرے تمہیں غیر معمولی قوت و رفتار ملے
دوست کے آخری دیدار سے مجھے محروم نہ کر''
میں تیزی سے خیموں کے جھنڈ میں گیا
محبوبہ کی لمبی کراہیں آ رہی تھیں
اگر نہ مرو اور اس بار بچ جاؤ
تو میں ہر سال فربہ جانور قربان کیا کروں گا
تمہارے سر درد دور کرنے بھورے رنگ کا دنبہ ذبح کروں گا
غلام آزاد کرالاؤں گا
(مگر) یاسمین کا پھول مرجھانے لگا
وہ پکے ہوئے لیموں کی طرح گر گئی
خدا اپنی اچھی بخشش واپس لے گیا
وہ اسے بندگاہ ندی لے گئے (غسل دینے)
وہ اس کے گلے سے ہار اور زیور اتارتے ہیں
اس کے ہاتھوں سے چوڑیاں اور چاندی کے زیور اتارتے ہیں

انگلیوں سے مندریاں
ستواں ناک کے زیور اتارتے ہیں
پیروں سے سانپ سر جیسے پازیب
پھر میری محبوبہ کو زمین پہ لٹایا
اسے سفید کپڑے میں لپیٹ دیا
بھائیوں نے محبت بھرے کندھوں پر اٹھا لیا
اور دور میدان کے کونے تک لے گئے
اُس کے لیے ایک تنگ دہانے والی قبر کھود دی
لعل کو اس کے اندر لٹا دیا
اُس کے اوپر مٹی اور گارا ڈال دیا
بھائی ماتمی چبوترے پہ آئے
محبوبہ کی ماں روتی ہے، محبوبہ کے عزیز روتے ہیں
محبوبہ کی عزیز سہیلیاں روتی ہیں
میں بھی اندر اندر رویا
آنسو میرے برف رنگ (سفید) چادر پر گرتے ہیں
رات میرے دانا خدا نے صبح کر دی
سیٹھوں کی ماہ رخ بیٹیاں باہر آتی ہیں
وہ اپنے ہار زیور، صاف کرتی ہیں اور بادام رنگ کے دوپٹے جھٹکتی ہیں
رنگین دوپٹے سر پر ڈالتی ہیں
مگران میں موجود نہیں لعل جیسی صدو

باغارسر

Baghaarsar

موجودہ مری بگٹی علاقے میں ایک زمانے میں گورگیژ، کلمتی اور بلیدی رہتے تھے۔ کلمتی اب مکران میں رہتے ہیں۔ اُن کے بارے میں یا تو لوگ سینہ بہ سینہ والی باتیں دہراتے ہیں یا پھر ماوند کے قریب ''باغارسر'' نامی جگہ پران کی نشانیاں اور آثار ان کی ہستی کا ثبوت دیتی ہیں۔ لیکن اب تو وہ آثار بھی پچھلے برسوں زراعت والے بلڈوزر نے ملیامیٹ کردیے ہیں۔ (اس پاپی پیٹ کو اللہ ہی معاف کرسکتا ہے، غفار اور رحیم جو ہے)۔ بلوچ کلاسیک میں یہ کلمتی ایک اور قبیلے سے لڑ پڑتے ہیں جسے ہماری شاعری میں ''بلمتی'' کہا گیا ہے مگر اس نام کا آج کوئی قبیلہ موجود نہیں، لہٰذا گمان یہ ہے کہ یہ ''بلفتی'' ہوں گے۔ یہ لوگ بھی اب مری بگٹی میں نہیں ہیں بلکہ لسبیلہ میں رہائش پذیر ہیں۔ کلمتی اور بلمتی ''باغار'' نامی رینگنے والے جانور کے اوپر آپس میں لڑے تو ہیں مگر وہ ماوند میں لڑے ہیں، مکران میں نہیں۔ اس لیے کہ ایک پورا علاقہ اُن کی جائے رہائش اور پھر ''باغار'' کے اوپر لڑائی کی وجہ سے ''باغارسر'' کے نام سے آج بھی موجود ہے، ماوند میں۔ مگر یہ دونوں قبیلے مشرقی بلوچستان سے گم ہوچکے ہیں۔ کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ باغار نامی جانور پران دونوں قبیلوں کی جنگ لسبیلہ میں

ہوئی تھی اور یہ کہ یہ جڑواں قبیلے کلمتی اور بلفتی تھے۔ سردار خان گشکوری کے حساب کتاب میں یہ لڑائی چاکر کی بلوچستان سے روانگی سے تقریباً چالیس برس بعد سندھ کے ارغون حکمران شاہ حسین ولد شاہ بیگ کے دور میں لڑی گئی(1)۔ اس لڑائی میں سو افراد مارے گئے۔ دونوں تھک گئے۔ اٹھارویں صدی کے ایک گمنام شاعر نے اس قصہ کو یوں بیان کیا تھا:

شاہ حسین جھیڑو ہ روشا
بی بڑی پیشا نشتہ ماں لوغا
درشُتہ باغارے اژے گیڈا
چورواں الغاربستہ پہ دیما
گڑکناناں داں مہترے لوغا
درکفی دیمامڑدمے جو ائیں
شرکلاچ انت چودشتغیں شیراں
دھلونت اژ اوشیشیں کرائیاں
بی بڑی گال آتکہ مزں شانیں
قائما منّت او کشّئی بازیں
بلیں باغارا کہ اے منی شانیں
نہ جنے چورا ہیچویں جتاں
چورواں باغار کشتہ پہ لٹاں
چی نیہ لوغاسمویں سالوخ
داں وثی قولی ءَ پجینتہ داہی
ہوت ژہ میرانی درا آتکہ
بی بڑی گال آتکہ مزں شانیں
اغ تہ پہ باغارانہ کش کائی
مس تئی گھاراوتہ منی بھائی

سورہا چرینتہ جواو چونیں
اوامل ماہیں صبر کاں گونیں
یک برے بوشتو گال مخن گوما
مں پرے باغارا کناں چونا
اے ڈغار شہم بیث ژہ ہونا
شنگراشصت او شانگرا پنجاہ
درست پہ با غارا بیثغاں یکجا
عومرانشکے اشتہ پہ قولا
ہوں گریں بالا چاپرے ہونا
سورہیں دودایا پرے گوخان

ترجمہ:

شاہ حسین کے ساتھ لڑائی کے دن
بی بی اپنے گھر میں بیٹھی تھی
جھاڑیوں سے ایک باغار نکلا
لڑکے اس کا پیچھا کرنے لگے
باغار جان بچاتے بچاتے معتبر شخص کے گھر کی طرف آیا
حسین خاتون باہر آئی
بازو بند ایسے خوب صورت جیسے دودھ
جو شفاف بازوؤں پہ چمکتا ہے
بڑی شان والی بی بی بول پڑی
اس نے بڑی منت سماجت کی
باغار کو چھوڑ دو یہ اب میری شان (پناہ) ہے
اسے ایسی بے دردی سے نہ مارو جیسے راہیجہ جت کو مارتے ہیں

لڑکوں نے ڈنڈے مار مار کر باغار کو ہلاک کر دیا
معزز خاوند گھر میں موجود نہ تھا
اس نے اپنے خاوند کو اطلاع بھجوائی
وہ معتبرین کی محفل سے باہر نکل آیا
بڑی شان والی بی بی بولی
اگر تم نے باغار کا بدلہ نہ لیا
تو میں تیری بہن اور تو میرا بھائی
بہادر خاوند نے جواب دیا
اے میری چاند، ذرا صبر کر
ایک بار رک جا مجھ سے بات نہ کر
میں باغار کی خاطر وہ کچھ کروں گا
یہ زمیں خون سے بھیگ جائے
ساٹھ آدمی ادھر سے اور پچاس اُس طرف سے
سارے باغار کی خاطر آمنے سامنے ہوئے
قول پورا کرنے عمر نے ایک نقش چھوڑ دیا
جس طرح انتقام لینے والے بالاچ نے کیا تھا
بہادر دودا نے گائیوں کے لیے کیا تھا

حوالہ جات

1۔ بلوچ، سردار خان، 1977ء لٹریری ہسٹری آف دی بلوچ، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، جلد نمبر 1، صفحہ 401

دوستین وشیریں

Dostain O Shireen

میر محمد اکبر قلندرانڑیں، میر محمد خان پیر دادانڑیں اور حاجی بختیار خان سومرانڑیں کا خیال تھا کہ یہ ہمایوں کا دور تھا۔ سردار خان بلوچ اُسے اکبر بادشاہ کا دور قرار دیتا ہے۔ اُس کی فوجوں نے بستی پر حملہ کر دیا اور لال خان کی بیٹی شیریں کے محبوب اور منگیتر، دوستین رند کو گرفتار کر کے ہڑند کے مقام پر قید کر لیا۔ دوستیں جو ابھی نوجوانی میں داخل ہو رہا تھا۔ بلوچ، گھڑ سوار تو ہوتے ہی ہیں۔ لہٰذا حاکم نے دوستین کو اپنے بہان (گھوڑے کے بچے) کو تربیت دینے پر مامور کیا۔ اِدھر:

زنگی ایں منی وڈیر وّ
گوئہرامیں منی جامیں بیل
وانتکار شیہڑیں ''شاہی'' ئے
ژہ لڑکوخیں کشاویلی آ
سوغند پرتئ ریشانا

نوخیں رتکغیں مسانا
سیغیں گورکُشیں سیاہارا
آفا نہ نہ واڑت بن ئیغاں
کک وکرجلاں سندھیغاں
لوٹی بانہڑاں دوستیغاں
لوٹیث وث مہاریں جیذاں
پٹو خہ وفہ ماث گواراں
دھوری پہ کمُاریں آفاں
سوئی پری کہ مس وہاواں
مارواڑی جواَں زِوریناں
وہاوہ پہ قرارے نیلی
مڑدے ژہ خراسان آتکہ
لیغار چادرو ہمبوئیں
بارے رودنانی گونیں
ہڑجیں میذ ہیں بھنگانی
رند و بارغیں بورانی
تحقیقیں سلام شیر ینئے
نوذاں شنز شہ کو نارو
دشتئے دامن و منگوچر
سنی ئے نغوئر ہمبوئیں
نیساوٗ ہزار مسکیفیں
ڈورئے پر خمار امریزاں

چوٹنت چوکمندئے بوغاں
لڑزنت چوگُنا نی تاخاں
لڈے لانچِشہ مال داراں
میثر دارین سحا قیئے بچاں
بُن باربستغاں بانکاں
سربار لڈ ثنت گواچیاں
بانڑی کنڈ غو ناغاہو
کونڈان پر وشتغاں زڑدوآں
لوکاں صفے وکاڈاں
اوکاڈاں گوں خماریں پچماں
میش ژہ درنّو اں سیرہ بں
بُڑ زژہ گواڑغی لعل پُلا ں
رِندژہ میدہیں گندیماں
پانہوال ژہ پنیر وپو نچاں
مہری ژہ گن وپوتا خاں
شیر ین ءِ کلّہ سر نیا ذیں
اڑت ماں نرمک ئے گیاب ریجاں
گوانگ جنت دِلسریں دائی آ
زیری کدّحا میٹ ایغا
روش دَہ شکلیں نوخافاں
رندیث و مُشیث ملگوراں
ملگور شُشتغاں ماہ لینجا

کیثاں دہ وثی چیار گُلا
گُل ئے بانزری آں بندی
ششکانیں تغڑدنشتیں تئ
جھولیے پلوے لیٹیں تئ
دستہ جنت اوو بڑزی آ
کشی نُغرہ ایں آھری آ
پُلیں زاں سراں ایرہ کنت
گندی ثاں وثی گونافا
گرئیغ کنت خماریں پچماں
انڑزی ءَ رشنت چو دَرمآں
جیغئے سر کِٹگہ میناں

ترجمہ:

زنگی ہے میرا ابڑا
گوئہرام ہے میرا پکا دوست
سوگند ہے تری داڑھی کی
نئ نئ مونچھوں کے بالوں کی
سوگ میں ہے زیبرا کُش سیاہ
پانی نہیں پیتا چٹانوں کا
گھاس وسبزہ سندھ کا
چاہتا ہے محبوبہ کا خانہ بدوشی ٹھکانہ
چاہتا ہے خودمختار چراگاہیں
پٹوخ کا بہتا پانی

مارواڑ کا جو چاہتا ہے کھر درا
آرام سے سونے نہیں دیتا
خراسان سے ایک آدمی آیا
خرجین تلخ بھنگ کا
سربار قندھاری عطر ہیں
رندوں کے پیغاموں کے ساتھ
رندوں اور اُن کی خوبصورت گھوڑیوں کی
پکے سلام شیرین کے
کونارو پہ بادل برسے
دشت کا دامن اور منگوچر
سنی کا سرسبز علاقہ
ہزار امیدوں کا نیساؤ
ڈور کے پرخمار تالاب پہ لہریں
ٹیڑھی جیسے کماد کے ڈنٹھل ہوں
گوئن کے پتوں کی طرح لرزتے ہیں
مال داروں کو نقل مکانی سوجھی
بھیڑ پال سحاق کے بیٹوں کو
مالکنوں نے مال سامان باندھ لیا
گواچیوں پہ لاد دیے
بانڑی کے دروں اور ناغا ہو
اونٹوں کو بٹھایا
اور حسینائیں

حسینائیں خمار آنکھوں کے ساتھ
بھیڑیں خوشبودار گھاس سے شکم سیر ہوں
بلندی پہ گل لالہ کے حسیں پھولوں سے
رِند سرسبز گندم سے
چرواہے پیزا اور پونچ سے
مہری گوئن اور پوتا خوں سے
شیرین کے خیمے میں سیر نشستہ
نرمک کے زرخیزیوں
پکارتی ہے دِلسر دائی کو

وہ بال دھونے والا میٹ (صابن) اٹھاتی ہے
اور بارش کے تازہ شیریں پانی تک جاتی ہے
وہ اپنے بال کنگھی کرتی ہے، تیل لگاتی ہے
وہ اپنے گھنے بال دھوتی ہے
اور اپنے خیمے کو لوٹ آتی ہے
اور اُسے چاروں طرف سے بند کر دیتی ہے
خوب صورت چٹائی بچھاتی ہے
جھول کا ایک کونا اٹھاتی ہے
پھر تھیلے میں سے
نقرئی آئینہ نکال لیتی ہے
اسے اپنے سڈول زانوؤں پر رکھتی ہے
اس میں اپنا چہرہ دیکھتی ہے
اس کی خمار آنکھیں آبدیدہ ہوتی ہیں

آنسو تیز برسات کی طرح گرتے ہیں اور

سینے کے ابھاروں کو گیلا کرتے ہیں

اس کی سہلیاں آتی ہیں اور اس سے کہتی ہیں:

بیا اِنت دز گوھار جیڈی ایں
شریں سومری چل و چیار
بیا اَنت وگُرئے اِیر نِنداں
شارئے پلّوا لیٹیناں
پڑ سنت ای دلیے احوالاں
''پرچہ کنل اِت کور دیماں
سوہریں مامکؔ و نیلایاں
بریخ تئ بمبویں دنزوآں
چم تئ کدح ایں انڑزی آں

ترجمہ:

اس کی قریبی سہیلیاں آتی ہیں
یہ خوب صورت لڑکیاں تعداد میں چالیس ہیں
وہ آتی ہیں اور اس کے پاس بیٹھ جاتی ہیں
اس کے دوپٹے کا پلو ہٹا لیتی ہیں
اس کے دل کا احوال پوچھتی ہیں
ارے بہن! کیوں تیری زلفیں دھندلائی ہوئی ہیں
تمہارا سرخ مامک (زیور) نیلا ہے
تمہارے گیسو گرد آلود ہیں
تمہاری قدح جیسی بڑی بڑی آنکھیں اشک بار ہیں

تب وہ اپنے زخمی دل کا زار زار حال بتاتی ہے:

گرے ایش و جناں تیلانک دا
دیر بیں او جناں جوائیناں
بلّاں کنل اوں کور دیم باں
سوہریں مامک اوں نیلا باں
بریخوں بمبویں دنزو باں
چموں کدحیں انڑزی باں
رکھ اوں کاغذی اٹی باں
آں مڑد کہ مناں دوز واہ اش
سحرا ر ا دئیا تُرکاں را
دیشہ ہرغیں بد دعایاں
دوستی اوں شوئے پکّار نَیں
دوستی اش ہواں مڑدانی
کہ ترکاں مس ہر یو گوازینتاں
(مس) نامانی ہڑندہ شہرا

ترجمہ:

وہ روتی ہے اور انہیں دھکیل دیتی ہے
دور ہٹو، اچھی لڑکیو
رہنے دو میری زلفوں کو دھندلائی
رہنے دو میرے گیسوؤں کو گرد آلود
میری قدح جیسی بڑی آنکھوں کو اشک بار رہنے دو
میرے کاغذ جیسے پتلے ہونٹوں کو نیلا پڑنے دو

جو شخص مجھے پیارا تھا

ترکوں نے اسے جادو کر دیا

وہ ہر طرح کی بدعاؤں کا شکار رہوا

مجھے تمہاری دوستی نہیں چاہیے

مجھے اس شخص کی دوستی حاصل تھی

جسے ترک دور لے گئے

مشہور شہر ہڑند میں

ایک عرصہ انتظار رہوتا ہے، مگر دوستین نہیں آتا۔ مجبوراً لال خان اپنی بیٹی کی منگنی کر دیتا ہے۔ اس نئے منگیتر کا نام بھی دوستین ہوتا ہے اور وہ بھی شیرین کے حسن کا پرستار رہوتا ہے۔ اسی دوران عید قریب آ جاتی ہے۔ اُسی دن کے لیے تو دوستین نے شیریں کو کہلا بھیجا تھا کہ وہ مغلوں کی جیل توڑ کر اُس کے پاس ضرور پہنچے گا۔ شیریں منتظر ہے کہ:

سنج واصطبل لافاایں

بختا کہ جنیغا کشتہ

دوستیں ژہ ہڑ ندر کپتہ

سیاہیں ماذنے اری نشتہ

ڈُنگہ بنت جنک رِندانی

پُلانی پذا شیفہ بنت

کایاں کر گزی کراماناں

نیخیں نیتے گوں دیاناں

مئوراں ژہ کر امغاں سند اناں

پَٹ انت گواڑغی پلّاناں

نیم مس جموّیں جیغا جث

نیم ماں ''گُنل'' و سرہوشاں

نیم پہ سملیں قولی آ

یکے پہ نیتا مئیں ایغا

چنت وَمَس وثی مُشتہ کنت

پالشتا ژہ بذا جورینا

شیث ثی دز گہار جیڈی آں

دستاں پہ حذا برڑز آریں

اللہ بیار ملخ دوستینا

ست و سمّوا قولی آ

اِشی آ نہ ہواں اولی آ

ترجمہ:

خوب صورت ٹولی بنا کر رواں ہوتی ہیں رند لڑکیاں

پھول چُننے رواں ہوتی ہیں

وہ میٹھی آوازیں نکالتی آتی ہیں

نیک نیت کے ساتھ

خوش بودار بوٹی مئور توڑتے ہوئے

وہ گل لالہ چُنتی ہیں

کچھ کو خوب صورت سینے پہ سجا لیتی ہیں

کچھ کو زلفوں کے خوشوں کی چوٹیوں پر

کچھ محبوب کی نیت سے

ایک میری خاطر

اس نے توڑ لیا اور چُن کر اپنی مٹھی میں رکھ لیا

تا کہ میں اپنے دشمنوں سے محفوظ رہوں
اپنی سہیلیوں سے کہتی ہے
خدا کی درگاہ پہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھالو
خدا ملک دوستین کو لے آئے
جو قول وعہد کا پابند ہے
اِس دوستین کو نہیں، پہلے والے دوستین کو

اور پھر عید آ جاتی ہے۔ حاکم کی زیرِ تربیت گھوڑی جوان ہوجاتی ہے اور عید کے جشن پہ گھڑ دوڑ کے لیے تیار۔ حاکم نے دوستین سے بہت پہلے قول لیا تھا کہ وہ فرار نہیں ہوگا۔ اِس بلوچ نوجوان نے اسے قول دیا تھا کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر کبھی نہ جائے گا۔ جب گھڑ دوڑ کے لیے سوار تیار ہوئے تو دوستین نے حاکم سے کہا، ’’سائیں موکل ایں‘‘ (جناب اجازت ہے؟)۔ اس نے کہا، ’’ہاں‘‘۔ تب دوستین نے کہا، ’’حاکم میں نے تمھیں قول دیا تھا کہ تمہاری اجازت کے بغیر نہیں جاؤں گا۔ اب تم نے ہاں کہہ دی ہے۔ اب میں اپنے وطن جارہا ہوں‘‘۔ یہ کہہ کر دوستین نے اپنی ہی تربیت دی ہوئی نوجوان گھوڑی کو ایڑ لگادی اور یہ جا وہ جا۔ ترک گھڑ سواروں نے اُس کا پیچھا کیا مگر تھک ہار کر اور اپنے گھوڑوں کی موت پہ بھی اسے پکڑ نہ سکے۔ (ابھی بھی مری علاقے میں ’’گھوڑا ڈھنڈ‘‘ نامی جھیل موجود ہے، جہاں ترکوں کے گھوڑے تھک کر گر گئے تھے اور اُن کی موت واقع ہوتی تھی)۔

دوستین اپنی محبوبہ کے وصال کی امید میں منزلیں طے کرتا جب بستی کے قریب پہنچتا ہے تو وہاں ایک چرواہا لڑکا اپنی بھیڑیں چرا رہا ہوتا ہے اور وہ رو رہا ہے۔ دوستین نے وجہ پوچھتی تو لڑکے نے کہا، ’’میرے بھائی دوستین کی منگیتر شیرین کی منگنی دوستین نامی ایک اور نوجوان سے ہوچکی ہے اور آج اُن کی شادی ہے۔ میں اپنے قیدی بھائی کے لیے رو رہا ہوں‘‘۔

دوستین نے اسے تسلی دی اور شادی کی تقریب میں پہنچا۔ وہاں رندوں سے اُس نے خود کو ڈومب (گلوکار) بتایا۔ رندوں کی فرمائش پہ اس نے وہی گانا گایا جو شیریں اور وہ مل کر بچپن میں گایا

کرتے تھے۔ شیرین نے گانے کے بول پہچان لیے۔ وہ خوشی سے چلائی.........’’یہ ڈومب نہیں ہے، دوستین ہے‘‘۔

تب لوگوں نے بھی اسے پہچان لیا۔ اُس سے اُس کی سرگزشت سنی۔ تب دوسرے دوستین نے بلوچی شان میں شادی کا سارا جشن اصل دوستین کے حوالے کردیا اور خود شیرین سے دست بردار ہوگیا۔

دونوں میں بہادر کون تھا؟ اچھا انسان کون تھا؟ آپ اس کا جواب سوچیے، میں دعا میں شامل ہوجاتا ہوں:

بور پہ لمغاں شیری آں
بروپہ مزلاں دیر یناں
بیارئے واژ ہاں میر یناں
میل ایں مڑدماں ہیریناں
نندونیا ذ پٹ و ماثانی
دیما شکلیں براثانی
روزی با ملخ دوستینا
(ترا) دیذار سنگتئے روزوں باث

ترجمہ:

گھوڑی شیر جیسی چھلانگیں لگاتی
دور دراز منزلوں پہ جانا
لاؤ اپنے اشراف مالکوں کو
باہم ملاؤ خوب صورت انسانوں کو
ماں باپ کی محبتوں میں
میٹھے بھائیوں کے سامنے بٹھانا

ملک دوستیں کو نصیب رہیں

محبوبہ کا دیدار اس کی خوراک رہے!

شاہ محمد مری کی تصانیف

عشاق کے قافلے سیریز

۱...... اسپارٹیکس

۲...... مزدک

۳...... شاہ عنایت

۴...... ٹام پین

۵...... شاہ لطیف

۶...... مست توکلی

۷...... جینی مارکس

۸...... لینن

۹...... یوسف عزیز مگسی

۱۰...... ماؤزے تنگ

۱۱...... ہوچی منہ

۱۲...... فیڈل کاسٹرو

۱۳...... نیلسن منڈیلا

۱۴...... بابو شورش

۱۵...... سی آر اسلم

۱۶...... غوث بخش بزنجو

۱۷...... گل خان نصیر

۱۸...... عبداللہ جان جمالدینی

۱۹...... سائیں کمال خان شیرانی

۲۰...... سوبھو گیان چندانی

تاریخ

۱۔ بلوچ قوم

- عہد قدیم سے ریاست کی تشکیل تک
- قبائلی اور جاگیرداری عہد
- صنعتی عہد
- تقسیمِ ہند سے عصرِ حاضر تک

تحقیق و تنقید

۱۔بلوچی زبان وادب

- بلوچی زبان اورفوک لور
- کلاسیکل دورکاادب
- سامراج دشمن دور
- جدیددور

۲۔بلوچ سماج میں عورت کا مقام

۳۔عورتوں کی تحریک

۴۔وفاکاتذکرہ

۵۔بلوچستان کی ادبی تحریک

۶۔فہمیدہ ریاض

سفرنامہ نگاری

۱۔سورج کاشہر،گوادر

۲۔چین آشنائی

تراجم

سیاسی وتاریخی:(اردو)

۱۔امریکی قرضے	فیڈل کاسٹرو
۲۔پتھر کی سل پرنام	والوئے،لپشینا
۳۔مری بلوچ جنگِ مزاحمت	رینالڈولیم

۴۔مری بلوچ جدوجہدآزادی	لیمبرک
۵۔بلوچ	م،ک پیکولین
۶۔نیست پیغمبر	ہنرخ والکوف
۷۔کارل مارکس کی داستانِ حیات	فرانزمہرنگ

ادبی

۱۔سپارٹیکس	ہاورڈفاسٹ
۲۔افلاس کاکارواں	نورمحمدترہ کئی
۳۔سنگسار	نورمحمدترہ کئی
۴۔گندم کی روٹی	عبدالستارپردلی
۵۔بلوچ نے مجھے دھکادیا	گوہرملک
۶۔منتخب سوویت افسانے	....
۷۔سٹیزن ٹام پین	ہاورڈفاسٹ
۸۔اباسین پہ سحرہوتی ہے	سلیمان لائق

بلوچی

۱۔تاریخ تہانفرءِکرد	پلیخانوف
۲۔کمیونسٹ مینی فیسٹو	مارکس/اینگلز
۳۔جہاں جسکیں دہ روش	جان ریڈ

زیرتالیف

۱۔ماث	میکسم گورکی
۲۔لینن	مایاکوفسکی
۳۔شاعری	ویپٹاروف
۴۔بخارا	صدرالدین عینی